پاکستان کی سیاسی تاریخ 7

بلوچستان

مسئلہ خودمختاری کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ

جلد 7



مسئلہ خودمختاری کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل وترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-29-2

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42-35183166
E-mails: hjzaidi@gmail.com
khalidmehboob@tehqeeq.org
Website: www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: 2012ء

قیمت: -/400 روپے

قیمت بیرون ملک: -/20 $

فہرست

باب3: دوسری عالمی جنگ کے بعد بلوچستان کی نمائندگی اور سیاسی مستقبل کا سوال

باب4: پاکستان میں برطانوی بلوچستان کی شمولیت اور قلات کی علیحدگی

قیام پاکستان کے بعد

باب 5: نوآزاد پاکستان کے لئے بلوچستان کے مسائل اور خلیجی علاقے میں بڑی طاقتوں کی رسہ کشی

باب 6: قبائلی سرداران، خان قلات اور حکومت پاکستان......تینوں کے الگ راستے

باب 7: ریاست قلات کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا ڈرامہ

باب 8: بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت، سیاسی اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ بن گئی

باب9: بلوچستان میں لیاقت علی خان کی غیر جمہوری پالیسی-I

باب10: بلوچستان میں لیاقت علی خان کی غیر جمہوری پالیسی-II

دیباچہ ایڈیشن دوم

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سلسلے کی اس ساتویں جلد کے پہلے ایڈیشن کو شائع ہوئے قریباً 18 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران بلوچستان کی خودمختاری یا آزادی کا مسئلہ پہلے سے کہیں زیادہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ خصوصاً فوجی کاروائی کے ذریعے نواب اکبر بگٹی کے بہیمانہ قتل کے انتہائی افسوسناک واقعہ کے بعد وہاں حالات ایک ناقابل واپسی نقطہ پر پہنچ چکے ہیں۔ ان 18 برس کے واقعات لوگوں کی یادداشت میں تازہ ہیں مگر اس مسئلہ کے تاریخی پس منظر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ بلکہ نئی نسل تو یہ سمجھتی ہے کہ یہ مسئلہ نواب بگٹی کے قتل سے شروع ہوا۔ حالانکہ یہ بدقسمت خطہ مختلف تاریخی اور جغرافیائی عوامل کی وجہ سے شروع سے ہی اپنی خودمختاری، آزادی اور بقاء کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

قیام پاکستان سے قبل برطانوی بلوچستان، قبائلی سردار اور بلوچ ریاستیں قلات، مکران، خاران اور لس بیلہ ہندوستان کی سیاست میں انڈین نیشنل کانگرس کے بجائے مسلم لیگ اور قائداعظم کے زیادہ قریب تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی مسلم لیگ یا مسلم قائدین کی سیاست مسلم اکثریتی علاقوں کی خودمختاری اور تحفظ کے حصول کی سیاست تھی۔ خواہ قائداعظم کے چودہ نکات ہوں یا اقبال کا خطبہ الٰہ آباد، 1940ء کی قرارداد لاہور ہو یا 1946ء میں وزارتی مشن منصوبہ کی مجوزہ گروپنگ سکیم جسے مسلم لیگ نے منظور کیا، بلوچستان سمیت تمام مسلم اکثریتی علاقوں کی خودمختاری پر مبنی تھے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے اس ملک کو

جس سامراجی شکنجہ میں جکڑا اس سے بلوچستان سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ اور آج بھی بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ یہاں کے عوام غربت، پس ماندگی، مفلوک الحالی کے علاوہ شدید درجہ کی دہشت گردی اور فرقہ واریت سے دوچار ہیں، کمزور فرقوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے اور بنیادی انسانی حقوق کو پامال کر کے رکھ دیا گیا ہے جن میں لا پتہ افراد کا مسئلہ سر فہرست ہے۔

دنیا بھر کے توانائی کے سب سے بڑے مآخذ یعنی خلیج فارس کے تیل اور وسط ایشیا کے تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کے درمیان واقع بلوچستان کا یہ بدقسمت خطہ دنیا کی تمام طاقتوں کی باہمی کشمکش جسے گریٹ گیم کہا جاتا ہے، کا عرصہ دراز سے میدان کارزار بنا ہوا ہے۔ گوادر بندرگاہ سے چمن تک تجارت اور توانائی کے روٹ اسی خطے سے گزرتے ہیں۔ چنانچہ لارڈ کرزن کی فارورڈ پالیسی (1905ء) سے لے کر آج دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکہ کی جانب سے مسلط کردہ عالمی دہشت گردی تک یہ خطہ مختلف فوجی کاروائیوں سے گزرا اور گزر رہا ہے۔ ایک جانب فوجی چھاونیاں، فوجی اڈے، ڈرون اڑانے کے ائیربیس موجود ہیں تو دوسری جانب پہاڑوں کی اوٹ میں مسلح جدوجہد کرنے والے بلوچ نوجوان خودمختاری کے مطالبوں سے بڑھ کر مکمل آزادی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ ہمسایہ ملک اور دیگر علاقائی اور عالمی طاقتیں بھی اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں اور کیوں فائدہ نہ اٹھائیں کہ آپ نے تو خود یہاں کے عوام کو مسلسل محروم و محکوم رکھ کر اب بالکل دیوار سے لگا دیا ہے۔

اس صورت حال کا تاریخی پس منظر جاننے کے لئے احباب کے پُرزور اصرار پر زیر نظر جلد کا نیا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی طباعت کا معیار پہلے سے بہت بہتر کر دیا گیا ہے اور قیمت بھی مارکیٹ کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

ادارہ مطالعہ تاریخ اپنے قارئین اور سرپرستوں کا بے حد ممنون ہے۔

حسن جعفر زیدی

10/اکتوبر 2012ء

دیباچہ۔ایڈیشن اول

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سلسلے کی ساتویں جلد پیش خدمت ہے۔اس سے پیشتر چھٹی جلد میں سندھ کے صوبائی خودمختاری کے سوال کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔زیرنظر جلد میں اس سوال کا جائزہ بلوچستان کے حوالے سے لیا گیا ہے۔

بلوچستان، پاکستان کا سب سے پس ماندہ اور محروم صوبہ ہے۔ عام طور پر اس کی پسماندگی اور محرومی کا سبب اس کے طبعی جغرافیے اور طبعی عوامل یعنی پانی، بارش کی نایابی اور نتیجتاً زراعت میں کمی اور اس طرح کی دیگر طبعی وجوہات کو قرار دیا جاتا ہے اور اس کا ذمہ دار قدرت کو سمجھ لیا جاتا ہے۔اس طرح یہاں کی پس ماندگی، محرومی، غربت اور جہالت کی تاریخی اور سیاسی وجوہ کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور ان مخصوص طبقات کو بھی نظرانداز کر دیا جاتا ہے جو دراصل اس کیفیت کے ذمہ دار ہیں۔زیرنظر جلد میں ان داخلی اور خارجی قوتوں اور طبقات کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کے مخصوص مفادات کے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس خطے کے عوام الناس ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جس میں وہ نہایت ہی بنیادی انسانی ضرورتوں اور انسانی حقوق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔

بلوچستان کی تاریخ بہت قدیم ہے۔بعض آثار قدیمہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں آباد لوگ اردگرد کے دوسرے خطوں میں آباد لوگوں کی بہ نسبت زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ تھے۔تاہم بعدازاں مختلف وجوہ کی بنا پر یہاں کی سماجی ترقی کی رفتار سست ہوگئی اور یہاں

کے لوگ قبائلی نظام سے آگے نہ جا سکے۔ یہ بھی ہوا کہ یہاں کے قبائلی غول کے غول یہاں سے نقل مکانی کر کے سندھ اور پنجاب میں جا کر آباد ہو گئے۔ اس نقل مکانی کی وجہ یہاں کی جامد معیشت اور معاشرت کے علاوہ بعض اوقات سیاسی نوعیت کی بھی رہی۔ کبھی لوگ قبائلی خانہ جنگی سے فرار اختیار کرتے اور کبھی سندھ یا پنجاب میں اپنے ہم قبیلہ افراد کے سیاسی غلبہ میں حصہ دار بننے چلے آتے جو ان سے پہلے یہاں نقل مکانی کر آئے تھے اور سیاسی و معاشی اعتبار سے ترقی کر گئے تھے۔ پنجاب اور سندھ کی سیاسی، معاشی و معاشرتی زندگی میں بلوچوں نے اپنے لئے نیم قبائلی سے جاگیردارانہ نظام تک ترقی حاصل کی۔ لیکن خود بلوچستان کے اندر کوئی مربوط جاگیردارانہ سیاسی و معاشرتی نظام فروغ حاصل نہ کر سکا جو کہ قرون وسطیٰ میں اردگرد کے خطوں میں رائج الوقت تھا۔

قرون وسطیٰ میں کئی ادوار ایسے آئے جب بلوچستان پر سیاسی غلبہ کبھی ایرانیوں کبھی عربوں اور کبھی مغلوں کو حاصل رہا لیکن ان کا یہ غلبہ ڈھیلا ڈھالا رہا اور کسی ایسے مربوط کنٹرول کی صورت اختیار نہ کر سکا جو یہاں کے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کی جڑ تک اتر کر اسے ترقی کے اس مرحلے سے ہمکنار کرتا جس سے ایرانی، عرب یا مغل خود گزر رہے تھے۔ یہ خطہ ابھی زمانہ قدیم کے قبائلی نظام کے شکنجوں میں ہی جکڑا ہوا تھا اور جاگیردارانہ دور کو بھی نہ چھو سکا تھا کہ یہاں یورپ کا ترقی یافتہ صنعتی اور استعماری ملک برطانیہ سامراج کی صورت میں آن دھمکا۔ انگریزوں نے بھی اپنے مخصوص سامراجی تقاضوں کے تحت اس خطہ کو بدستور قبائلی سرداری نظام میں رہنے دیا۔ فقط کوئٹہ چھاؤنی آباد کرنے اور وہاں تک ریلوے لائن بچھانے کا ''کارنامہ'' بھی اس خطے کی مخصوص جنگی اہمیت اور ''شمال سے خطرے'' کے پیش نظر انجام دیا گیا۔ اس کا فائدہ بھی زیادہ تر پنجابی، پٹھان، پارسی، ایرانی تاجروں اور دوسرے غیر بلوچ آباد کاروں کو پہنچا۔ کیوں کہ بلوچی سماج کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی پس ماندگی کو انگریزوں نے سامراجی عزائم کے پیش نظر جوں کا توں رکھا تھا۔

گزشتہ دو سو سال سے بلوچستان کے خطے کی ایک بدقسمتی اس کا محل وقوع بن گیا کہ یہ جنگی اہمیت کے لحاظ سے ایک طرف زار روس کی توسیع پسندی اور دوسری طرف برطانوی سامراج کے برصغیر اور خلیج کے خطے میں نو آبادیوں پر غلبہ کے مابین حد فاصل بن گیا۔ پہلے برطانوی

سامراج نے اور پھر اس خطے میں اس کے جانشین امریکی سامراج نے اس خطے کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں سے جوڑتوڑ کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور یہاں ہر قسم کی سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کا راستہ روکا تا کہ اس علاقے کو بطور اڈہ استعمال کرنے کے خلاف مقامی مزاحمت نہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں بلوچستان کی ترقی کے راستے کا سب سے بڑا پتھر خود یہاں کے قبائلی سردار ثابت ہوئے۔ انہوں نے بیرونی حکمرانوں سے اپنے لئے مراعات اور فائدے لے کر ان کی وفاداری کا دم بھرا اور اپنے عوام کو پسماندہ رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے حکمرانوں نے بھی اپنے سامراجی آقاؤں کے مفادات کے تقاضوں اور اپنے استبدادی اقتدار کی خاطر قبائلی سرداروں سے جوڑتوڑ کا طریقہ اختیار کئے رکھا اور یہاں ترقی کا عمل بہت سست رہا۔ بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے اور اس کے لئے صوبائی حقوق کے حصول کا مطالبہ اسلامیان ہند کا مستقل مطالبہ رہا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبات کا مستقل حصہ رہا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد خود حکمران پارٹی بننے کے بعد مسلم لیگ نے اپنے اس پروگرام سے جس طرح انحراف کیا اسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ 1947ء سے 1955ء تک اسے نہ تو گورنری صوبہ بنایا گیا اور نہ ہی صوبائی حقوق دیئے گئے۔ اس کے بعد اسے ون یونٹ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا۔ 1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں پہلی بار یہاں منتخب صوبائی حکومت قائم ہوئی جو تھوڑے عرصے بعد توڑ دی گئی، پھر یہاں فوجی ایکشن کیا گیا۔ 1977ء کے بعد پورا ملک مارشل لاء کی بھینٹ چڑھ گیا تو یہ خطہ جو پہلے ہی سب سے پسماندہ تھا، اپنی دلدل میں پھنسا رہا۔ نام نہاد نیا جمہوری دور جو 1988ء سے شروع ہوا ہے وہ بھی ابھی تک اس خطے کے لئے کوئی نئی امید نہیں لایا ہے۔ قبائلی سرداروں کی اقتدار کی رسہ کشی، اسلام آباد کے حکمرانوں کی جانب سے ان سرداروں کو ایک دوسرے کے خلاف جوڑتوڑ میں استعمال کر کے اپنے اقتدار کو بچانے کی کوششیں اور تگ و دو میں بلوچستان کے عوام الناس بدستور اپنی محرومی اور پسماندگی کے جنگل میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح ہیں اور نا معلوم کب تک ایسے ہی رہیں گے۔

زیر نظر جلد میں بلوچستان کے عوام کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی محرومی کی ابتدائی

داستان بیان کی گئی ہے۔ کسی بھی خطے کی سیاسی، معاشی و معاشرتی ترقی کا گہرا تعلق اس کی خودمختاری اور امور حکومت میں عوام کی شرکت کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ جس قدر یہ زیادہ ہوگی، وہ خطہ اسی قدر تیزی سے ترقی کرے گا اور جس قدر کم ہوگی یا نہیں ہوگی اسی قدر وہاں ترقی کا فقدان ہوگا۔ چنانچہ بلوچستان میں مسئلہ خودمختاری کے آغاز کے وہ تمام عوامل اس جلد میں واضح کر دیئے گئے ہیں جو داخلی اور خارجی طور پر خودمختاری سے محروم رکھنے اور کاروبار حکومت میں عوام کی شرکت کو دور رکھنے کے لئے سرگرم رہے ہیں۔ واقعات کا احاطہ اگرچہ 1951ء تک کیا گیا ہے لیکن ان تمام رجحانات اور قوتوں کی تفصیل کے ساتھ نشان دہی کرائی گئی ہے جن کے تسلسل میں بعد کے واقعات رونما ہوئے۔

اس جلد کی تیاری میں بھی میرے ساتھی خالد محبوب نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا۔ تحقیقی مواد جمع کرنے سے لے کر پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری کے مراحل ان کی کاوش کے مرہون منت ہیں۔ سمیع اللہ ظفر، ثائر علی، اور مسعود نقوی نے اس سلسلے میں تحقیق و تالیف کو درپیش بعض قانونی مشکلات سے جس طرح نجات دلائی اور اس مقصد کے لئے جس خلوص اور محنت کے ساتھ کام کیا اس کا اس تحقیقی منصوبے کی ٹیم اور اس کے قارئین ہر دو کو ممنون ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں جن احباب کا شفقت و تعاون ہر معاملے میں میرے شامل حال رہا ان میں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، میاں دلاور محمود صاحب، صفدر علی قریشی صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، محمد اورنگ زیب خان، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب، اطہر ندیم صاحب، مہدی حسن صاحب اور قمر عباس صاحب شامل ہیں۔ مصطفیٰ وحید صاحب اس سلسلۂ اشاعت کا جس کمٹ منٹ اور خلوص کے ساتھ اہتمام کر رہے ہیں وہ ان کی ہمت اور عالی حوصلگی کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ان کے برادر آصف جاوید اور نعیم احسن کا شوق بھی اس کتاب کی اشاعت میں فزوں تر نظر آیا۔

اس جلد کے تحقیقی مواد کے حصول کے لئے جن لائبریریوں کے عملہ نے بھرپور تعاون کیا ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پاکستان ٹائمز، ریفرنس سیکشن لاہور، نوائے وقت، ریفرنس سیکشن لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، میوزیم لائبریری لاہور اور برٹش کونسل

لائبریری لاہور شامل ہیں۔

گزشتہ چھ جلدوں کو قارئین نے جس اشتیاق کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور ان کی جس طرح پزیرائی کی ہے اس سے ملنے والا حوصلہ مجھے اگلی جلد کی تیاری کے لئے روحانی قوت عطا کرتا ہے۔ اس طرح زیر نظر جلد کی تکمیل قارئین کی کرم فرمائی ہی کی مرہون منت ہے۔ البتہ اس میں جو خامیاں یا غلطیاں سہواًرہ گئی ہیں ان کے لئے میں خود کو ذمہ دار سمجھتا ہوں۔

جنوری 1994ء......لاہور حسن جعفر زیدی

قیام پاکستان سے پہلے

باب: 1

بلوچستان کا تاریخی پس منظر
بیسویں صدی کے اوائل تک

بلوچستان......خانہ بدوشی سے قبائلی ریاست کے قیام تک

بلوچستانی عوام کی ہمہ گیر پسماندگی اور بنیادی انسانی حقوق سے مسلسل محرومیت کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 1600 قبل مسیح میں مغرب کی جانب سے آریاؤں کی یلغار سے لے کر عہد جدید تک ان کے اس بے آب و گیاہ اور وسیع و عریض علاقے میں کبھی کسی غیر ملکی یا مقامی حکمران نے ذرائع پیداوار کو ترقی دے کر ان کے لئے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کی راہیں نہیں کھولیں۔ جب آریاؤں کی یلغار ہوئی تو ان کے لئے 131855 مربع میل کے اس ریگستانی اور سنگلاخ علاقے میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ سیدھے سندھ، جمنا اور گنگا کی زرخیز وادیوں میں پہنچے۔ جب چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران میں سائرس اعظم نے ایران کی سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اس کے کچھ عرصے بعد دارا اوّل کے عہد میں یہ علاقہ ایرانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ مگر اس کی سلطنت کے بعض علاقوں میں زرعی ذرائع پیداوار کی ترقی کے اثرات اس علاقے تک نہ پہنچے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایران کے شہنشاہوں کو اپنی وسیع سلطنت کی تھوڑی سی آبادی کے لئے یہاں کے ذرائع پیداوار کو ترقی دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جب یونان کا شہنشاہ سکندر اعظم ایران کے شہنشاہ دارا سوئم کو شکست دینے کے بعد شمال مغرب کی طرف سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس کے پاس گنگا اور جمنا کی وادی کی طرف رخ کرنے کے لئے مطلوبہ فوجی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس لئے وہ مکران اور لس بیلہ کے

راستہ سے واپس چلا گیا۔ سکندر اعظم کی واپسی کے بعد اس کے گورنروں نے کچھ مدت تک اس علاقے کو اپنے زیر نگیں رکھا مگر چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کے عظیم حکمران چندر گپت موریہ کے عہد میں یہ علاقہ شمالی ہندوستان کی بدھ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اس عہد کی بدھ تہذیب کے تاریخی آثار ابھی تک بلوچستان کے بعض علاقوں میں ملتے ہیں لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ موریہ سلطنت کے دور میں اس علاقے کی پیداواری ترقی کے لئے کوئی منظم کوشش کی گئی تھی۔ دوسری صدی قبل مسیح میں وسطی ایشیا کے بعض حکمرانوں اور قبائلی سرداروں نے اس علاقے پر مسلسل حملے کر کے یہاں سے بدھ اقتدار کا خاتمہ کر دیا لیکن ان میں سے بھی کسی نے یہاں اپنا اقتدار مستحکم کر کے کوئی پائیدار معاشی نظام قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لہٰذا تقریباً چار پانچ سو سال تک اس علاقے میں کوئی ایسا واقعہ نہ ہوا جو یہاں کی تاریخ کی زینت بن سکتا۔

کہتے ہیں کہ چوتھی صدی عیسوی میں حلب و دجلہ کی وادیوں سے ایک سامی النسل قبیلہ بلوچ یہاں آیا اور یہیں رہائش پزیر ہو کر گلہ بانی اور شتر بانی کے ذریعے اپنی معاش کا انتظام کرنے لگا۔ یہ قبیلہ زراعت کے فن سے نا آشنا تھا اس لئے اسے بلوچ یعنی خانہ بدوش کہتے تھے۔ یہ جگہ بجگہ مویشی پال کر اپنا گزارا کرتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں علاقائی وطنیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس لئے اس قبیلہ کو جہاں کہیں کوئی سرسبز چراگاہ ملتی تھی یہ اسی کو اپنا وطن بنالیتا تھا۔ چھٹی صدی بعد از مسیح میں نوشیرواں کے عہد میں ایران کے ساسانیوں نے اس علاقے کو اپنے زیر تسلط کیا تو مکران کے ساحلی علاقے میں زرعی ترقی کے لئے کچھ انتظامات ہوئے۔ لیکن 635ء عیسوی میں سندھ کے ایک ہندو مہاراجہ نے یہاں سے ساسانیوں کو بے دخل کر دیا۔ اس وقت ایران کی سلطنت بڑی تیزی سے زوال پزیر ہو چکی تھی۔

643ء میں عربوں نے اس علاقے کی طرف توجہ کی جبکہ مسلمانوں کے خلیفہ دوئم حضرت عمر کی زیر نگرانی مسلمانوں کی سلطنت برق رفتاری کے ساتھ مصر، فلسطین، عراق اور ایران تک وسعت پا چکی تھی۔ جو عرب جنرل 643ء میں مکران پہنچا اس کا نام عبداللہ بن عبداللہ تھا۔ مقامی حکمران ملک سعد نے اس کا مقابلہ کیا مگر عبداللہ نے اسے شکست دے کر مکران کے ساحلی علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ خلیفہ سوئم حضرت عثمان کے عہد میں سندھ کے علاقے کا جائزہ لینے کے لئے ایک فوجی افسر کو بھیجا گیا تھا۔ وہ براستہ مکران سندھ پہنچا اور اس نے

واپس جا کر یہ رپورٹ دی کہ یہ علاقہ دشوار گزار پہاڑوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔'' اس علاقے میں تھوڑی سی فوج رکھنے سے اس کے مغلوب ہو جانے کا خطرہ ہے اور زیادہ فوج کے لئے غلہ و پانی نہیں ہے وہ بھوک و پیاس سے ختم ہو جائے گی۔'' چنانچہ حضرت عثمان نے اس رپورٹ کے پیش نظر براستہ مکران سندھ کو مغلوب کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ 661ء میں خارجیوں کے ہاتھوں حضرت علی کی شہادت کے بعد پورے مشرق وسطیٰ میں امیہ خاندان کا اقتدار مستحکم ہو گیا تو 664ء میں عربوں نے بلوچستان کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا مگر وہ اس بے آب و گیاہ اور دشوار گزار پہاڑی اور ریگستانی علاقے پر پوری طرح پائیدار تسلط قائم نہ کر سکے۔ پھر خلیفہ عبدالملک 684-704ء کے دور میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے مکران اور سندھ کی طرف توجہ کی کیونکہ ان علاقوں کے بحری قزاقوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے عرب تاجروں کے لئے سمندری راستہ محفوظ نہیں تھا۔ حجاج نے پہلے سعید بن اسلم کو عربوں کے مقبوضہ علاقے مکران کا گورنر مقرر کیا مگر وہ اپنے فرائض صحیح طریقے سے سرانجام نہ دے سکا۔ چنانچہ سندھ کے لٹیروں نے مکران پر حملہ کر کے یہاں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور پھر وہ گورنر سعید کو قتل کرنے کے بعد واپس سندھ چلے گئے۔ 704ء میں گورنر سعید کی جگہ موجع کا تقرر ہوا مگر وہ ایک سال کے بعد انتقال کر گیا۔ 705ء میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں محمد بن ہارون کو مکران بھیجا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ سندھ کو مغلوب کر کے عرب تاجروں کے لئے سمندری راستے کے تحفظ کا بندوبست کرے۔ مگر اس کی یہ فوجی مہم کامیاب نہ ہوئی اور وہ کراچی کے نزدیک خود ایک معرکہ میں جاں بحق ہو گیا۔ یہ اطلاع گورنر حجاج کو ملی تو اس نے 707ء میں اپنے جواں سال داماد محمد بن قاسم کو مکران کا انچارج مقرر کر کے اسے سندھ کا علاقہ فتح کرنے کا کام سپرد کیا۔ جس نے 711ء میں سندھ کے راجہ داہر کو شکست دے کر مکران سے لے کر ملتان تک کا علاقہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کے بعد دسویں صدی تک بلوچستان عربوں کے زیر نگیں رہا مگر ان کے دور میں عربوں کی زیادہ تر توجہ کا مرکز میدانی علاقے رہے جہاں پانی اور اناج کی فراوانی تھی۔ بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں انہوں نے جم کر حکومت نہیں کی۔ اس علاقے میں مقامی قبائلی سرداروں کا ہی حکم چلتا رہا۔ اگرچہ وہ زبانی طور پر 711ء سے لے کر 750ء تک اموی خاندان کے خلفاء اور پھر 750ء سے 945ء تک عباسی خلفاء کی وفاداری کا اظہار کرتے رہے۔

977ء میں ناصرالدین سفیرالدین سبکتگین نے غزنوی سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اس کے کچھ عرصے بعد اس نے بلوچستان پر قبضہ کر کے عربوں کو وہاں سے نکال دیا۔ جبکہ بغداد میں خلافت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ 997ء میں سبکتگین کا انتقال ہوا تو اس کا بڑا بیٹا اسماعیل تخت نشین ہوا مگر دو سال بعد 999ء میں اسکے چھوٹے بھائی محمود نے اسے معزول کر کے خود تخت سنبھال لیا۔ محمود غزنوی نے 999ء لے کر 1026ء تک شمالی ہندوستان کے وسیع علاقے پر بارہ حملے کئے جن کے نتیجے میں سندھ میں بھی عربوں کے اقتدار کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ 1030ء میں محمود کا انتقال ہوا تو غزنوی خاندان کے زوال اور غوری خاندان کے عروج کا عمل شروع ہو گیا جو 1159ء تک آخری غزنوی حکمران بہرام شاہ کی سلطنت کے علاؤالدین جہاں سوز کے ہاتھوں قطعی خاتمہ پر مکمل ہوا۔ جس کے بعد بلوچستان غوری خاندان کے زیر اقتدار آ گیا۔ 1206ء میں دریائے سندھ کے کنارے پر سلطان محمد غوری کے قتل کے ساتھ ہی غوری خاندان کے اقتدار کا سورج غروب ہوا تو بلوچستان 1219ء میں سلطان محمد خان آف خوارزم کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہی ۔ 1223ء میں جب چنگیز خان کے ہاتھوں وسطی ایشیا کی ساری مسلم سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں تو اس کا بیٹا چغتائی مکران تک پہنچ گیا اور پھر اس نے قلات میں قائم شدہ ہندوؤں کی سیوانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

تھوڑے عرصہ بعد دہلی کے سلطان التمش 35-1210ء نے جنوبی بلوچستان پر قبضہ کیا مگر مغلوں نے بہت جلد اسے وہاں سے نکال باہر کیا اور پھر تیمور اور اس کی اولاد کی جانب سے براستہ بلوچستان، ہندوستان پر حملے شروع ہو گئے جن میں بلوچوں نے مغلوں کا ساتھ دیا اور اس بنا پر پندرہویں صدی کے اواخر میں مغلوں کی زیر سرپرستی قلات میں بلوچوں کے ایک قبائلی سردار میرو خان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ 1530ء میں جب ہرات کے بادشاہ سلطان حسین مرزا کی جانب سے میر ذوالنون ارغون شمال مشرقی بلوچستان کا گورنر تھا، مرزا کامران نے حملہ کر کے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جس کے نتیجہ میں قلات اور بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں ارغون خاندان کا تسلط کمزور پڑ گیا۔

1556ء میں ظہیرالدین بابر نے قندھار میں ارغون خاندان کی سلطنت کا خاتمہ کیا تو قلات میں ایک بلوچ سردار میر عمر خان نے بلوچوں کی ایک ریاست کی بنیاد رکھی جس کی سرحدیں

بعض روایات کے مطابق تھوڑے ہی عرصے میں کچھی اور پنجاب کے بعض علاقوں تک پہنچ گئی تھیں حالانکہ ان علاقوں پر غلبہ کے لئے بلوچستان کے رند اور لاشاری قبائل کے درمیان 30 سال تک خانہ جنگی ہوتی رہی تھی۔ تاہم اس ریاست کی حیثیت ایک باجگزار ذیلی ریاست کی تھی کیونکہ اقتدار اعلیٰ 1556ء سے لے کر 1595ء تک کبھی قندھار کی صفوی سرکار یا مغل سلطنت کے صوبہ ملتان کی بکھر سرکار کے پاس رہا۔ 1595ء میں یہ علاقہ دہلی کی مغلیہ حکومت کی بالادستی کے تحت آ گیا لیکن 1638ء میں یہ ایک مرتبہ پھر ایران کی سلطنت سے منسلک ہو گیا۔

1666ء میں بلوچوں کے قبائلی سردار میر احمد یار خان نے قندھار کی سرکار کے خلاف کامیاب بغاوت کر کے پہلے تو مستونگ، کوئٹہ اور پشین کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا اور پھر اس نے کچھی میں مغلوں کے گورنر کو مغلوب کر کے اپنی ریاست کی حدود نوشکی اور جھلاوان تک پھیلا دیں۔ اس طرح بلوچوں میں میروانی خاندان کی بالادستی ختم ہوئی اور احمد زئی خاندان کی عظمت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ 1695ء میں میر احمد یار خان کی وفات پر اس کا بیٹا میر محراب خان بلوچ قبائل کی کنفیڈریشن کا سربراہ بنا جبکہ دہلی میں اورنگزیب کی ضعیفی اور علالت کے باعث مغلیہ سلطنت تیزی سے روبہ زوال تھی اور اس کے خلاف متعدد صوبائی گورنر یکے بعد دیگرے بغاوتیں کر رہے تھے۔ محراب خان نے مغلیہ دربار کی طرف سے سندھ کے باغی کلہوڑوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی مگر وہ سندھی کلہوڑوں کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا۔ اس پر فوراً ہی اس کا بھتیجا میر سمندر خان گدی نشین ہو گیا۔

سمندر خان نے عنان اقتدار سنبھالنے کے بعد قندھار کی سرکار سے ژوب اور اس کے گردونواح کا علاقہ چھین لیا۔ پھر اس نے سندھ کی طرف رخ کیا اور مغلیہ دربار کے باغی کلہوڑوں کو شکست دی۔ میر احمد یار خان لکھتا ہے کہ میر سخی سمندر خان نے ''دہلی کے مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے باغی کلہوڑوں داد محمد اور نور محمد کو پابہ زنجیر شہنشاہ کے دربار میں پیش کیا جس پر شہنشاہ ہند نے میر سمندر خان کو امیر الامراء کا خطاب دیا اور لاکھوں روپے کے انعامات دیئے اور کراچی کی بندرگاہ محراب خان کے خون بہا کے طور پر سندھ سے الگ کر کے خان بلوچ کے حوالے کی اور کلہوڑوں کو حکم دیا کہ وہ سالانہ چالیس ہزار روپے خان کو خراج دیں۔'' میر سمندر خان نے مغلیہ سلطنت کی زیر سرپرستی 18 سال تک بلوچستان کے بیشتر علاقوں پر حکومت کی اور 1713ء میں

قلات میں وفات پائی۔اس پر میر احمد خان دوئم نے گدی سنبھالی مگر وہ بمشکل ایک سال تک برسر اقتدار رہ سکا۔1715ء میں میر عبداللہ خان گدی نشین ہوا اور اس نے اپنے پندرہ سالہ عہد اقتدار میں اپنی ریاست کو ڈیرہ غازی خان تک وسیع کر لیا۔اس کی بیشتر لڑائیاں سندھی حکمرانوں سے ہوئیں اور 1730ء میں وہ انہی کے ساتھ ایک معرکے میں مارا گیا۔اس کی جگہ میر محبت خان آیا اور اس نے 1740ء میں ایران کے بادشاہ کی امداد سے میر عبداللہ کے خون بہا کے طور پر سندھیوں سے کچھی کا علاقہ حاصل کر لیا۔

1750ء میں نصیر خان اول نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ درانی کی امداد سے اپنے بھائی میر محبت خان کو معزول کر کے درانی سلطنت کے باجگزار کی حیثیت سے بلوچستان کی مسند اقتدار سنبھالی۔میر احمد یار خان اسے اپنی خاندانی ریاست کا عظیم ترین ہیرو قرار دیتا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ ''خان اعظم میر نصیر خان نوری بلوچی دنیا کا فقید المثال بلوچی رہنما کہلاتا ہے۔وہ نہ صرف عظیم رہنما، سپہ سالار اور اولالعزم قومی حکمران تھا بلکہ ایک پاکیزہ شخصیت اور بزرگ انسان کی حیثیت سے بھی پوری بلوچی تاریخ میں اس کا نام آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگاتا رہے گا۔ 1758ء میں میر نصیر خان نے افغان بادشاہ کے خلاف سرکشی دکھائی تو احمد شاہ ابدالی نے فوج کشی کی اور اس کے قلات کے قلعہ کا محاصرہ کر کے اسے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔1769ء میں احمد شاہ ابدالی کے مشہد پر حملہ کے موقعہ پر میر نصیر خان اپنے قبائلی لشکر سمیت اس کے ساتھ تھا۔ پھر جب 1761ء میں پانی پت میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان لڑائی ہوئی تو اس میں میر نصیر خان کے تقریباً 25 ہزار قبائلیوں کے لشکر نے افغان فوج کی امداد کی۔اس لڑائی میں مرہٹوں کو تو فیصلہ کن شکست ہوئی لیکن پنجاب میں سکھوں کے اقتدار کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔1765ء میں احمد شاہ ابدالی سکھوں کی سرکشی کو کچلنے کے لئے پنجاب آیا تو اس لڑائی میں بھی میر نصیر خان کے لشکر نے حصہ لیا اور اس طرح سکھوں کو شکست ہوئی۔

میر نصیر خان تقریباً 40 سال تک افغان سلطنت کے زیر سایہ برسر اقتدار رہا۔وہ ایک اچھا سپہ سالار اور اعلیٰ پایہ کا منتظم تھا اس لئے اس کا عہد بلوچوں کے اقتدار کا روشن ترین عہد تصور کیا جاتا ہے۔اس کے عہد میں بلوچ قبائلیوں کے درمیان کوئی خانہ جنگی نہ ہوئی کیونکہ سارے قبائلی سردار اس کی اطاعت کرتے تھے۔اس نے قبائلی سرداروں کو ان کے اپنے علاقوں میں ہر قسم کے

استحصال کی مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ میر نصیر خان کا لشکر انہی قبائلی سرداروں کی مہیا کردہ افرادی قوت پر مشتمل ہوتا تھا۔

1793ء میں میر نصیر خان کی وفات ہوئی تو اس کے سات سالہ بیٹے محمود خان اول کو اخوند محمد ہلا زادہ کی سربراہی میں گدی نشین کیا گیا۔ مگر میر احمد یار خان کے بیان کے مطابق میر محمود خان کی گدی نشینی کے فوراً بعد ''قلات کا بلوچی دربار سازشی عناصر کا اکھاڑہ بن گیا۔ مرکزیت کمزور ہوچکی تھی۔ میر محبت خان کے نواسے میر بہرام خان نے سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا۔ جس کو شاہ افغانستان کی مدد سے شکست دی گئی۔ سندھ کے تالپور بلوچوں نے قلات کے بلوچی مرکز کو کمزور دیکھ کر کراچی پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح میر علی شیر بگٹی نے بغاوت کی۔ کچھی کے سردار، جام لس بیلہ اور ڈیرہ جات نے علیحدگی اختیار کر لی۔'' اور میر محمود خان انہی بغاوتوں کے دور میں 1816ء میں وفات پا گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا میر محراب خان گدی پر بیٹھا۔ مگر وہ بھی ریاست کے حالات کی اصلاح نہ کرسکا۔ اس کا زیادہ وقت بغاوتوں کو فرو کرنے اور اپنے دربار کی محلاتی سازشوں کے سدباب میں صرف ہوتا تھا۔ وہ اپنے اقتدار کے لئے زیادہ تر اپنے دو سازشی مشیروں ملا محمد حسن اور سید محمد شریف پر انحصار کرتا تھا۔ یہ دونوں ایک طرف تو محراب خان کو قبائلی سرداروں، ہندوستان کے انگریز حکمرانوں اور افغانستان کے بادشاہ کے خلاف اکساتے تھے اور دوسری طرف وہ ان تینوں عناصر کو محراب خان کے خلاف اشتعال دلاتے تھے۔ ان دنوں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کے پوتوں کے درمیان خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ افغان بادشاہ شاہ شجاع الملک سدوزئی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے خلاف محمد زئی قبیلہ برسر پیکار تھا۔

بلوچستان پر برطانوی قبضہ کا پس منظر

ان ہی دنوں میں یورپ میں نپولین کی شکست کے بعد عالمی بالادستی کے لئے برطانیہ اور روس میں کشمکش شروع ہوچکی تھی۔ چونکہ روس وسطی ایشیا میں تیزی سے پیش قدمی کر رہا تھا اس لئے برطانوی سامراج اپنی ہندوستان کی سلطنت اور روسی سلطنت کے درمیان افغانستان اور ایران کو اپنے زیر اثر بفر ریاستیں بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے اس مقصد کے لئے شاہ شجاع سے رابطہ کیا تو اس کے حریف محمد زئیوں نے روسیوں سے امداد طلب کی۔ بالآخر اس خانہ جنگی کے

نتیجے میں شاہ شجاع کو اپنا تخت چھوڑ کر کابل سے بھاگنا پڑا اور وہ براستہ بلوچستان پنجاب میں سکھوں اور انگریزوں کی پناہ میں آ گیا۔ یہاں 1838ء میں انگریز گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ (Auckland)، پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کے تحت انگریزوں اور سکھوں نے شاہ شجاع کو کابل میں دوبارہ تخت نشین کرنے کے لئے مشترکہ طور پر براستہ بلوچستان افغانستان کے خلاف فوج کشی کی۔ جب یہ فوج بلوچستان سے گزر رہی تھی تو بعض قبائل نے ان کی مزاحمت کی تھی اور اس موقعہ پر قلات دربار کے معتمدین مُلا محمد حسن اور سید محمد شریف نے انگریزوں کو یہ باور کرایا کہ یہ مزاحمت میر محراب خان کے ایما پر ہوئی ہے۔ تاہم انگریزوں کا ایک نمائندہ الیگزنڈر برنز (Alexender Burnes) قلات گیا اور اس نے اپنی فوجوں کے بلوچستان سے بحفاظت گزرنے کے بارے میں محراب خان سے گفت وشنید کی جس کے نتیجے میں 28/مارچ 1839ء کو ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جس میں محراب خان نے انگریزوں کو اپنی وفاداری وفرمانبرداری کا یقین دلانے کے بعد یہ وعدہ کیا کہ انگریزوں کی افغانستان کے روس نواز محمد زئیوں کے خلاف فوجی مہم کے دوران شکار پور سے جو فوجی ساز و سامان روزن، ڈاؤر اور بولان کے راستے سے گزرے گا اس کی حفاظت کے لئے انتہائی کوشش کی جائے گی اور الیگزنڈر برنز نے جواباً یہ وعدہ کیا کہ انگریزی سرکار اس کی ان موعودہ خدمات کے عوض اسے سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپے دے گی۔ [1] لیکن الیگزنڈر برنز جب یہ معاہدہ کرنے کے بعد واپس کوئٹہ آ رہا تھا تو راستے میں قبائلی لٹیروں کے ایک گروہ نے اس کے کاروان پر ڈاکہ ڈالا۔ اس پر جب محراب خان کے محلاتی مشیروں نے انگریزوں کو بتایا کہ ڈاکہ زنی کی یہ واردات بھی محراب خان کے ایما پر ہوئی ہے تو کوئٹہ میں مقیم ایک انگریز بریگیڈئر تھامس ولشائر (Thomas Willshire) بہت مشتعل ہو گیا اور اس نے محراب خان کو غداری کی سزا دینے کے لئے قلات پر حملہ کر دیا۔ محراب خان اس حملے کی کوئی خاص مزاحمت نہ کر سکا چنانچہ انگریزوں نے بآسانی قلات پر قبضہ کر کے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

قلات کے خلاف اس کامیاب فوجی کاروائی کے بعد انگریزوں نے میر محبت خان کے پوتے میر شاہ نواز خان کو اپنے فرمانبردار پٹھو کی حیثیت سے قلات کا خان مقرر کر دیا اور ایک نوجوان افسر لیفٹیننٹ لوڈسے (Ludsey) کو اس خان کا سرپرست اور قلات کا پولیٹکل افسر مقرر

کیا گیا۔ میر احمد یار خان کے بیان کے مطابق ''اس طرح انگریز شاطروں کی پالیسی، ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' افغانستان اور بلوچستان میں کامیاب ہوئی۔ انگریز نے روس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے غیر شریفانہ ہتھکنڈوں سے افغانستان اور بلوچستان پر تسلط جما لیا۔ شجاع الملک، جو کبھی جان بچا کر قلات میں پناہ گزیں ہوا تھا، کو محسن کشی کے صلے میں (اور سرکار انگلیشیہ کے مفاد کی خاطر بھی) علاقہ کچھی اور مستونگ کو (افغانستان کے ساتھ الحاق کر کے) شجاع الملک کے حوالے کر دیا۔''[2] اس بندر بانٹ کا قبائلیوں پر شدید ردعمل ہوا۔ چنانچہ ساراوان کے بعض قبائل نے اس کے خلاف بغاوت کر دی جس کی بنا پر 1840ء میں میر شاہ نواز کو معزول کر کے اس کی جگہ کرنل سٹیسی (Stacey) کی تجویز کے مطابق میر محراب خان کے بیٹے میر محمد حسن المعروف میر نصیر خان خان دوئم کو گدی نشین کر دیا گیا۔ اس کی گدی نشینی کی رسم اکتوبر 1841ء میں میجر جیمز آؤٹرام (James Outram) نے ادا کی۔ اس موقعہ پر انگریزوں اور میر نصیر خان کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ میر نصیر خان نے اطاعت قبول کر لی ہے اس لئے حکومت برطانیہ اور ہز میجسٹی شاہ شجاع الملک اسے اور اس کے وارثوں کو قلات کی پرنسپیلٹی کا چیف مانتے ہیں۔ میر نصیر نے اپنے آباء و اجداد کی طرح اپنے آپ کو اور اپنے وارثوں کو کابل کے بادشاہ کا فرمانبردار تسلیم کر لیا ہے۔ میر محراب خان کے انتقال پر کابل کی حکومت نے کچھی، مستونگ اور شال کے جو علاقے اپنی تحویل میں لے لئے تھے ان میں سے دو اول الذکر علاقے ہز میجسٹی شاہ شجاع الملک کی عنایت سے اس کو اور اس کے وارثوں کو واپس دے دیئے جائیں گے۔ اگر کبھی آنریبل کمپنی یا شاہ شجاع کو قلات کے علاقے میں اپنی فوجیں متعین کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں ایسا کرنے کا حق ہوگا۔ میر نصیر خان اور اس کے وارث ہمیشہ اس برطانوی آفیسر کے مشورے اور رہنمائی میں عمل کریں گے جو اس کے دربار میں مقرر کیا جائے گا۔ میر نصیر خان ان تاجروں کی حفاظت کرے گا جو دریائے سندھ یا سون میانی کی بندرگاہ سے افغانستان جائیں گے۔ میر نصیر خان اور اس کے ورثاء پر یہ لازم ہوگا کہ وہ حکومت برطانیہ اور ہز میجسٹی شاہ شجاع الملک کی مرضی کے بغیر غیر ملکی طاقتوں سے کوئی سیاسی خط و کتابت یا گفت و شنید نہیں کرے گا اور تمام معاملات میں برطانوی ہندوستان اور شاہ شجاع کی حکومتوں کی ماتحتی میں تعاون کرے گا۔ اگر کسی کھلے دشمن نے میر نصیر خان پر حملہ کیا یا اس کے اور کسی غیر ملکی طاقت کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو حکومت

برطانیہ اس کے حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے حسب ضرورت اس کی اعانت کرے گی۔ میر نصیر خان معزول خان شاہ نواز خان کی پنشن یا کسی اور ذریعۂ آمدنی کا بندوبست کرے گا۔[3]

میر نصیر خان نے کچھ عرصہ اس معاہدہ کی پابندی کی مگر جب کابل میں عوامی بغاوت کے ذریعے تختہ الٹ دیا گیا اور انگریزوں کی فوج نیست و نابود ہو گئی تو 14 رمئی 1854ء کو حکومت برطانیہ اور میر نصیر خان کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس میں میر نصیر خان نے یہ وعدہ کیا کہ وہ اور اس کے وارث حکومت برطانیہ کے تمام دشمنوں کی انتہائی مخالفت کریں گے اور وہ تمام معاملات میں حکومت برطانیہ کے ماتحت کی حیثیت سے اس سے تعاون کرے گا اور اس کی مرضی کے خلاف دوسری ریاستوں سے کبھی کوئی خط و کتابت نہیں کرے گا۔ اگر کبھی برطانیہ کو اپنی فوجیں قلات میں متعین کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی تو اسے ایسا کرنے کا حق ہوگا۔ میر نصیر خان سندھ اور مکران وسون میانی کی بندرگاہوں سے افغانستان جانے وا ے تاجروں کے قافلوں کی حفاظت کا بندوبست کرے گا اور اسے اس کے معاوضہ کے طور پر سالانہ 50 ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ لیکن اگر کبھی میر نصیر خان متذکرہ شرائط کی پابندی کرنے میں ناکام رہا تو اسے 50 ہزار روپے کی سالانہ امداد نہیں ملے گی۔[4]

حکومت برطانیہ اور والئی قلات کے درمیان ان معاہدوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بلوچستان کے پہاڑی اور بنجر علاقے کو برائے استحصال بلاواسطہ اپنی تحویل میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ روس کے خلاف اپنی فارورڈ پالیسی کے تحت اس سٹریٹیجک علاقے پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اس پالیسی کے تحت افغانستان کو بفر سٹیٹ بنانے کے لئے 1838ء میں اس پر حملہ کیا تھا اور 1841ء میں وہاں ہزیمت اٹھانے کے بعد دوسری افغان جنگ کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے 1843ء میں سندھ پر بھی اسی فوجی حکمت عملی کے تحت قبضہ کیا تھا۔

قبائلی سرداروں کی خانہ جنگی اور بلوچستان پر انگریزوں کا مکمل قبضہ

میر نصیر خان دوئم اس معاہدے کے بعد تقریباً تین سال تک زندہ رہا اور یہ تین سال اس کی قبائلی سرداروں کے خلاف خانہ جنگی میں ہی گزرے۔ اس خانہ جنگی کی وجہ یہ تھی کہ میر نصیر خان نے ایک چھوٹی سی فوج تیار کر لی تھی جس سے قبائلی سرداروں کو خطرہ محسوس ہوتا تھا اور وہ اس

فوج کے وجود کو اپنے اختیارات میں سنگین مداخلت تصور کرتے تھے۔ قبائلی سردار اس تین سال کے عرصے میں نصیر خان دوئم کو شکست تو نہ دے سکے تاہم انہوں نے 1857ء میں اسے زہر دلوا کر ہلاک کروا دیا۔ اس کے بعد اس کا 16 سالہ بھائی خداداد خان گدی نشین ہوا اور اس نے انگریزوں کے زیر سایہ مسند اقتدار سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ قلات شہر کے نزدیک جو قبائلی سردار قیام پزیر تھے ان پر حملہ کر دیا اور اس طرح پہلے دن سے ہی خداداد خان اور قبائلی سرداروں کے مابین خانہ جنگی شروع ہوگئی جو پانچ چھ سال کے بعد ابھی جاری ہی تھی کہ انگریزوں نے فروری 1863ء میں خداداد خان سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت یہ فیصلہ ہوا کہ انگریز اپنی فوجی ضروریات کے لئے ٹیلی گراف کا سلسلہ تعمیر کریں گے۔ خداداد خان مواصلاتی تنصیبات کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا اور اسے اس کے معاوضے کے طور پر سالانہ پانچ ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ لیکن اس معاہدہ کے چند ماہ بعد اس کے ایک چچازاد بھائی شیر دل خان نے اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ خدادداد خان اس حملے سے ہلاک تو نہ ہوا البتہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس کی جگہ شیر دل کو قلات کا خان مقرر کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک سال سے زیادہ مسند پر قائم نہ رہ سکا جب اسے 1864ء میں ایک شخص کپتان شیر خان نے قتل کر دیا تو انگریزوں نے قلات کی گدی پھر خداداد خان کے حوالے کر دی۔ لیکن وہ مزید آٹھ دس سال تک امن وامان قائم نہ کر سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قلات میں متعین انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بلوچ قبائل باہمی لڑائی سے اتنے کمزور ہو جائیں کہ وہ سب کے سب بالآخر پورے بلوچستان پر برطانیہ کی بالادستی کو صدق دل سے تسلیم کر لیں۔ ان دنوں قلات کا پولیٹیکل ایجنٹ سندھ کے کمشنر کے ماتحت ہوتا تھا۔ 1873ء میں سندھ کے کمشنر نے قلات کے متحارب فریقوں کے درمیان ثالثی کرنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد قلات میں متعین برطانوی ایجنٹ میجر ہیری سن (Harrison) کو واپس بلا لیا گیا اور خداداد خان کی مالی امداد بند کر دی گئی۔

حکومت برطانیہ کی جانب سے اس کارروائی کا مطلب یہ تھا کہ اب بلوچستان کے بارے میں اس کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ چونکہ اس وقت تک روس کی فوجیں ریاست کشمیر کی سرحد کے نزدیک پامیر تک پہنچ گئی تھیں اس لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ بلوچستان کے اہم

سٹر ٹیجک علاقوں کو براہ راست اپنی فوجی تحویل میں رکھا جائے اور چونکہ بلوچ قبائلی سردار دس سال کی باہمی خانہ جنگی کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے اس لئے انگریزوں کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں رہا تھا۔ ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر میجر رابرٹ سنڈیمن (Robert Sandeman) کی تجویز یہ تھی کہ بلوچستان میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے وہاں بھی وہی سرداری نظام رائج کیا جائے جو قبل ازیں صوبہ سرحد سے متصلہ قبائلی علاقوں میں رائج کیا جا چکا تھا۔ سنڈیمن کو اپنی اس سکیم کی کامیابی کا یقین تھا کیونکہ اس نے ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے اس ضلع سے متصلہ مری بگٹی علاقے کے قبائلی سرداروں سے بذریعہ رشوت اچھے تعلقات قائم کر لئے تھے اور اس بنا پر اس علاقے کے قبائلی ڈیرہ غازی خان میں چوری اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں نہیں کرتے تھے۔ اس صورتحال میں 1875ء کے اوائل میں حکومت برطانیہ نے سنڈیمن کی سکیم کی منظوری دے دی اور اسے یہ ہدایت کی کہ وہ بلوچستان جا کر اپنی سکیم پر عمل درآمد کے امکانات کا جائزہ لے۔ چنانچہ وہ فوراً مستونگ پہنچا اور اس نے خان قلات اور قبائلی سرداروں میں صلح صفائی کرانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہوئی کیونکہ اس کی واپسی کے فوراً ہی بعد میر خداداد خان نے مینگل قبیلہ کے ایک سردار نورالدین اور اس کے بہت سے پیروکاروں کو تہ تیغ کروا دیا۔ اس پر خانہ جنگی کی آگ پھر بھڑک اٹھی تو چند ماہ بعد جولائی 1875ء میں سنڈیمن وہاں پہنچا اور اس نے بروہی کنفیڈریشن کے لئے ایک معاہدہ کروایا جس کے بعد حکومت برطانیہ نے بلوچستان میں مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے امن وامان برقرار رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس مقصد کے لئے 8/دسمبر 1876ء کو جیکب آباد میں میر خداداد خان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کے تحت میر خداداد خان نے 1854ء کے معاہدے کی دفعہ (3) کی توثیق کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ وہ اور اس کے وارث حکومت برطانیہ کے سارے دشمنوں کی انتہائی مخالفت کریں گے اور وہ حکومت برطانیہ کی ماتحتی میں رہ کر اس کے ساتھ تعاون کریں گے اور اس کی مرضی کے بغیر دوسری ریاستوں سے کوئی گفت وشنید نہیں کریں گے۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے اس وعدے کے جواب میں یہ اقرار کیا گیا کہ وہ قلات کی آزادی کا احترام کرے گی اور خان کے منصفانہ اختیار کو برقرار رکھنے کے لئے حسب ضرورت اس کی امداد کرے گی۔ برطانوی ایجنٹ اپنے ضروری حفاظتی عملہ کے ہمراہ مستقل طور پر خان کے دربار میں اور ریاست کے دوسرے علاقوں میں رہیں

گے اور خان اپنا نمائندہ ہندوستان کے دارالحکومت میں مقرر کرے گا۔ اگر آئندہ خان قلات اور ریاست کے سرداروں کے درمیان کوئی تنازعہ ہوا تو خان قلات یہ تنازعہ برائے ثالثی برطانوی ایجنٹ کے روبرو پیش کرے گا اور یہ ایجنٹ جو فیصلہ دے گا خان قلات اسے تسلیم کرلے گا اور اس پر پوری طرح عمل کرے گا۔ چونکہ خان قلات نے اپنی اور اپنے سرداروں کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ برطانوی افواج ریاست میں متعین کی جائیں لہٰذا ان کی یہ خواہش پوری کرنے کے لئے حکوت برطانیہ اپنی مرضی وضرورت کے مطابق اپنی فوجیں ریاست میں رکھنے پر رضامند ہوگئی ہے۔ حکومت برطانیہ کو خان کے علاقوں میں ٹیلی گراف کی تنصیبات اور ریلوے کی تعمیر کا حق ہوگا۔ ریاست قلات اور برطانوی ہندوستان کے درمیان تجارت میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی جائے گی۔ حکومت برطانیہ میر خداداد خان اور اس کے وارثوں کو 1854ء کے معاہدے کے پابندی کی صورت میں انہیں سالانہ ایک لاکھ روپے دے گی۔ اس رقم کے علاوہ حکومت برطانیہ خان قلات کو ہر سال 25500 روپے کی مزید رقم دے گی تاکہ وہ تجارتی قافلوں کی حفاظت کا بندوبست کر سکے۔[5] اس معاہدے کے بعد میجر رابرٹ سنڈیمن کو کوئٹہ میں ایجنٹ گورنر جنرل مقرر کیا گیا اور اس طرح بلوچستان پر انگریزوں کا عملاً تسلط قائم ہوگیا۔

دو سال بعد 1878ء میں انگریزوں نے افغانستان پر دوبارہ حملہ کیا۔ اس جنگ میں انگریزوں کی فتح ہوئی اور افغانستان کی حیثیت برطانیہ کی ایک طفیلی بفر ریاست کی ہوگئی اور امیر یعقوب خان نے گنڈامک (Gandammak) کے مقام پر حکومت برطانیہ سے ایک سرحدی معاہدہ کرنے کے بعد ایک پٹھو حکمران کی حیثیت سے کابل کی گدی سنبھال لی۔ اس معاہدہ کے تحت افغانستان کا حکمران بلوچستان میں ہرنائی، پشین، سبی اور تھل چوٹلی کے علاقوں سے دستبردار ہوگیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ برطانیہ کے سوا کسی دوسری طاقت سے روابط قائم نہیں کرے گا اور برطانیہ کو حق ہوگا کہ وہ کابل میں اپنا ریزیڈنٹ مقرر کرے جس کے ساتھ اس کا حفاظتی دستہ بھی ہو گا۔ حکومت برطانیہ نے جواباً افغانستان کے پٹھو حکمران کو یہ ضمانت دی کہ اگر اس کے ملک پر باہر سے کوئی حملہ ہوا تو برطانیہ افغانستان کا دفاع کرے گا۔ لیکن اس معاہدے کے چند ماہ بعد کابل میں گڑبڑ ہوئی جس کے دوران برطانوی ایجنٹ مارا گیا۔ چنانچہ برطانیہ نے پھر فوج کشی کی اور امیر یعقوب خان کو معزول کرکے اس کی جگہ امیر دوست محمد خان کے پوتے اور امیر حبیب اللہ کے بیٹے

امیر عبدالرحمن کو 22 رجولائی 1880ء کو کابل کی گدی پر بٹھا دیا۔ اسے ہز ہائی نس کا لقب دیا گیا، اس کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا اور اس طرح بلوچستان اور افغانستان دونوں ہی پر انگریزوں کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی۔

والیان ریاست قلات کا ظالمانہ سرداری نظام

انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو جانے کے باوجود قلات کے میر خدا داد خان نے اپنے علاقے میں خونریزی بند نہ کی۔ اسے اپنے ہاتھ سے انسانوں کو قتل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے اس وحشیانہ مشغلے کی انتہا یہ تھی کہ ایک مرتبہ اس نے ایجنٹ گورنر جنرل کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس نے عہد اقتدار میں خود 3500 مردوں اور عورتوں کو قتل کیا ہے۔ گویا ہر سال وہ اوسطاً ایک سو انسانوں کو تہ تیغ کیا کرتا تھا۔ مارچ 1893ء میں اس نے ایک چھوٹی سی چوری کے الزام میں نہ صرف اپنے چیف اکاؤنٹنٹ کو سنگسار کروا دیا تھا بلکہ اس کے والد اور بیٹے کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اس نے اس چوری کے الزام میں پانچ عورتوں کی گردنیں بھی اڑا دی تھیں اور دو بچوں کو خصی کر دیا تھا۔ جب کوئٹہ میں ایجنٹ گورنر جنرل کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے اسے متنبہ کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ لیکن اس نے اس انتباہ کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپریل میں اس نے اپنے ایک وزیر فقیر محمد کو قتل کرنے کے بعد اس کے 90 سالہ والد، 20 سالہ بیٹے اور اس کے ایک ملازم کو بھی تہ تیغ کروا دیا۔ یہ سب کچھ اس کے بیٹے میر اعظم جان کی نگرانی میں ہوا۔ جب ایجنٹ گورنر جنرل کو اس واردات کا پتہ چلا تو اس نے اسے کوئٹہ بلایا اور اسے لورالائی میں نظر بند کر کے اس کی جگہ 10 رمئی 1893ء کو اس کے بڑے بیٹے میر محمود خان کو گدی نشین کر دیا۔ یہ شخص انتہائی خلوت پسند تھا اور اسے ہر قسم کی چیزیں جمع کرنے کا جنون تھا۔ اس نے ہزاروں جوتے، پگڑی کے لئے سینکڑوں گز ریشمی کپڑا، درجنوں گھوڑے اور بہت سی کاریں جمع کی تھیں۔ اسے اپنی ان اشیاء کے چوری ہونے کا بڑا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی بڑی حفاظت کیا کرتا تھا۔ جو جوتے وہ استعمال نہیں کرتا تھا انہیں ضائع کرا دیتا تھا اور جس ریشمی کپڑے کی وہ پگڑی نہ بناتا اس کے چیتھڑے کروا دیتا تھا۔ وہ گھوڑوں کو ایک اندھیرے تہ خانے میں رکھتا تھا جس کی بنا پر بہت سے گھوڑے اندھے ہو گئے اور جو کاریں اس کے زیر استعمال نہیں آئی تھیں وہ ان کے پہیے اتار کر انہیں ناقابل استعمال بنوا دیتا تھا۔[6]

میر احمد یار خان اپنی کتاب میں اپنے تایا کی ان جنونی عادات کا ذکر نہیں کرتا۔ تاہم لکھتا ہے کہ ”خان محمود خان فطرتاً کمزور، مرنجاں مرنج اور سراپا قناعت پسند انسان تھے۔ ایسا ہی شخص انگریزوں کو مطلوب تھا چنانچہ خان بلوچ کو میری کے قلعہ میں نظر بند کر کے اس کے دستخطوں سے احکامات جاری کرتے اور حکومت کرتے تھے۔ بلوچ عوام روایتی احترام واطاعت کے سبب خان کی مرضی ومنشا جان کر انگریزوں کے احکامات کی تعمیل کرتے رہے اور ظلم وجبر کی چکی میں پستے رہے۔ میر محمود اپنی طبعی کمزوری، قناعت پسندی اور گوشہ نشینی کے باوجود انگریز سے نفرت وبیزاری کا اظہار کرتا رہا۔ اپنے پورے دور حکومت میں اس نے کسی انگریز کا استقبال نہیں کیا۔ خان محمود کا وزیر اعظم مرزا احمد علی خان مستوفی دو سال کے بعد انتقال کر گیا اور انگریز نے اپنی ڈھب کے آدمی سر شمس شاہ کو وزیر اعظم بنا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ میر محمود خان کو ہموار کرنے کے لئے اس کی نفرت وبیزاری کے باوجود حکومت برطانیہ نے اسے جی۔سی۔آئی۔ای (G.C.I.E) کا خطاب دیا۔ اعزازات بڑھائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور ایک مجبور حکمران کی حیثیت سے بطور احتجاج حکومت سے دستکش ہو گیا۔ اس پر ستم یہ کہ آخری عمر میں اس کی بینائی بھی جاتی رہی۔ سر شمس شاہ اپنی من مانی کے جوہر دکھاتا رہا۔ وہ ایک بااختیار حکمران کی حیثیت سے بلوچوں کو غلام بنانے، ان کو بنیادی حقوق سے محروم کرنے اور جور وستم کی کاروائی سے بلوچ آبادی کو نقل مکانی کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ نتیجتاً عوام میں ہیجان پھیلا اور مختلف طریقوں سے احتجاج کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ سر شمس اور انگریزوں کے مظالم کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی۔ بلوچستان کے خواندہ افراد میں مگسی قبیلہ کے سردار میر یوسف عزیز اور ان کے رفقاء نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جا جا کر بلوچستان میں ہونے والے مظالم کا چرچا کیا۔ پمفلٹ اور اشتہارات تقسیم کئے اور نتیجہ کے طور پر ان رہنماؤں کو تعزیر وتعذیب کا نشانہ بنا کر تحریک کو کمزور کرنے کی سعی کی گئی۔ مگر لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔ میر محمود خان نے برائے نام خان بلوچ کی حیثیت سے مسلسل پریشان حالی، بے بصیرتی اور دائم المرضی کی حالت میں 41 سال گزارنے کے بعد 3 رنومبر 1931ء بمقام قلات داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور شاہی قبرستان میں میر نصیر خان دوم کے پہلو میں دفن ہوئے۔“[7]

اس کے باپ میر خداداد خان نے سترہ سال تک لورالائی میں مقید رہنے کے بعد 11 رمئی 1919ء میں وفات پائی اور اسے اس کی وصیت کے مطابق پشین میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔

میر احمد یار خان نے اس تاریخی روداد میں حقائق کو مسخ کرنے کی نہایت بھونڈی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے تایا میر محمود خان دوئم کی اپنے ریاستی عوام کی فلاح و بہبود کے بارے میں مجرمانہ غفلت پر فطری کمزوری، مرنجاں مرنجی، سراپا قناعت اور گوشہ نشینی جیسے الفاظ کا پردہ ڈالتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے تین عشروں میں قلات کے میر محمود خان دوئم کا رویہ برصغیر کے دوسرے والیان ریاست سے مختلف نہیں تھا۔ اس زمانے میں ریاستی حکمرانوں کی بدکاری، بداعمالی، بداخلاقی، آرام کوشی اور عشرت پسندی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ نواب رامپور، نواب جونا گڑھ، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ کشمیر اور دوسرے والیان ریاست کی بدکرداریوں، فضول خرچیوں، زناکاریوں وغیرہ کی لرزہ خیز داستانیں زبان زدعام تھیں جبکہ ان ریاستوں کے کروڑوں مظلوم عوام غریبی، مفلسی، بیماری، فاقہ کشی اور جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ میر احمد یار خان اپنے دوسرے آباء و اجداد کے بارے میں بھی اسی قسم کی غلط بیانیاں کرتا ہے۔ وہ ان حقائق کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ 1616ء میں سردار میر احمد یار خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد ریاست قلات نے کبھی ایک آزاد و خود مختار مملکت کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس کا ہر حکمران قندھار یا کابل یا دہلی کے طاقتور حکمرانوں کا باجگزار، اطاعت گزار اور فرمانبردار ہی رہا تھا۔ سردار میر احمد یار خان کے بعد میر محراب خان، میر سمندر خان، میر عبداللہ خان اور میر محبت خان کا دور مسلسل خانہ جنگی کا دور تھا اور یہ سب کے سب کسی نہ کسی بیرونی حکمران کو خراج ادا کرتے رہے تھے۔ صرف میر نصیر خان اول کے دور میں ریاست کی حدود میں کچھ توسیع ہوئی تھی اور ریاستی عوام کو قدرے امن میں رہنا نصیب ہوا تھا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس نے احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کرنے کے بعد اس کی مشہد، پانی پت اور لاہور کی تین لڑائیوں میں بھرپور امداد کی تھی اور احمد شاہ ابدالی نے جواباً نہ صرف اسے مختلف قسم کے القابات سے نوازا تھا بلکہ ریاست کی حدود میں امن و استحکام قائم رکھنے میں بھی اس طرح کی اعانت کی تھی کہ جو عناصر داخلی طور پر بدامنی پیدا کر سکتے تھے انہیں بیشتر وقت بیرونی لڑائیوں میں ہی مصروف رکھا گیا تھا۔ گویا داخلی تضاد کو بیرونی تضاد کے ذریعے حل کیا گیا تھا۔ مگر جب میر نصیر خان اول کے بعد احمد شاہ ابدالی کا رعب دار سایہ نہیں رہا تھا تو میر محمود خان اول، میر محراب خان، میر حسن خان اور میر خداداد خان کا زمانہ لگا تار خون ریز خانہ جنگی کا زمانہ تھا اور انگریزوں کو اسی زمانے میں بلوچستان میں اپنا تسلط

جمانے کا موقع ملا تھا۔ اس تسلط کی تکمیل رابرٹ سنڈیمن نے کی تھی جو کوئٹہ میں بطور ایجنٹ گورنر جنرل 1876ء سے لے کر 1892ء تک تقریباً 16 سال تک برسراقتدار رہا۔ خود میر احمد یار خان اسے صوبہ بلوچستان کا بانی اور فاتح قرار دیتا ہے۔

چونکہ انگریزوں نے اس علاقے کو محض فوجی حکمت عملی کے تحت اپنے زیر تسلط کیا تھا اس لئے انہیں یہاں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی اس فوجی حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں کے عوام ہر لحاظ سے پسماندہ، بےشعور اور غیر منظم رہیں۔ میر احمد یار خان لکھتا ہے کہ ''رابرٹ سنڈیمن زبردست چالاک اور عیار آدمی تھا۔ اس نے قبائل کو ہاتھ میں لینے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ وہ بلوچوں کی نفسیات کا زبردست ماہر تھا۔ اس نے بلوچوں کی سماجی کمزوریوں اور اقتصادی بدحالی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔ انگریزوں نے اسے فاتح بلوچستان قرار دیا۔ وہ بلوچی سرداروں کے باقاعدہ دربار منعقد کرتا تھا۔ خلعت، انعام، الاؤنس، خیرات اور تحفے دیئے جاتے اور لینے والے قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند کے مصداق سنڈیمن کے گرد جمع ہوتے تھے۔''[8] لیکن میر احمد یار خان یہ نہیں لکھتا کہ ان قوم فروشوں میں اس کے آباء واجداد شامل تھے اور اس کے دادا میر خداداد خان نے صرف ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کے عوض اپنی قوم کو بیچ دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں لکھتا کہ بلوچوں کی جن ظالمانہ روایات و رسومات کو وہ قابل فخر قرار دیتا ہے انہیں رابرٹ سنڈیمن کی سکیم کے تحت ہی جوں کا توں برقرار رکھا گیا تھا۔

انگریزوں نے 1947ء تک بلوچوں کے سرداری نظام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا بلکہ انہوں نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (Frontier Crimes Regulations) کے تحت جرگہ سسٹم رائج کر کے قبائلی سرداروں کو مزید تقویت دی تھی اور انہیں کھلی چھٹی دی تھی کہ وہ اپنے عوام پر جس قدر چاہیں جبر واستبداد کریں۔ ان سے اس سلسلے میں اس وقت تک کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی جب تک وہ اپنے علاقے میں امن وامان برقرار رکھیں گے اور برطانوی مفادات کا تحفظ کریں گے۔ جرگہ کے ہر رکن کو پولیٹیکل ایجنٹ نامزد کرتا تھا۔ فیصلے بھی اسی کی مرضی کے تحت ہوتے تھے۔ جرگہ کے فیصلے کے خلاف اپیل اے۔جی۔جی (A.G.G) کو جاتی تھی۔ اگر کبھی کوئی سردار سرکشی کرتا تھا تو اس کی سرکوبی لیویز فورس کے ذریعے کی جاتی تھی جس میں خود احمد یار خان نے بحیثیت

ایڈ جوٹینٹ خدمات سرانجام دی تھیں۔ وفادار وفرمانبردار سرداروں کوانعامات، تحائف اور وظائف پولیٹیکل ایجنٹوں، اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹوں، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنروں، تحصیل داروں، نائب تحصیل داروں اور تھانیداروں کی رپورٹوں کو پیش نظر رکھ کر دیئے جاتے تھے۔ خان قلات کے دربار میں بھی اس مقصد کے لئے ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا تھا۔

میر احمد یار خان تسلیم کرتا ہے کہ ''ریاست کے نظم ونسق کی باگ ڈور انگریز ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کے ہاتھ میں تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ قلات اے۔جی۔جی کا نمائندہ تھا اور وزیر اعظم قلات پولیٹیکل ایجنٹ کا نمائندہ تھا...... خان کو قلات سے مستونگ جانے کے لئے بھی انگریز بہادر سے اجازت کا پروانہ لینا پڑتا تھا...... ریاست کا نظام حکومت کچھ اس طرح تھا کہ اے۔جی۔جی نگران اعلیٰ تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ تمام سرداران اور ان کے قبائلی علاقے مع لس بیلہ اور خاران کا انچارج تھا۔ وزیر اعظم قلات قبائلیوں کا انچارج تھا اور اس کا ایک نائب وزیر لس بیلہ کا وزیر تھا، دوسرا خاران اور مستونگ میں رہتا تھا اور خان کا دائرہ صرف قلات کی نیابت تک محدود تھا۔''[9] میر باقی بلوچ کے بیان کے مطابق ''رابرٹ سنڈیمن نے اپنے عہد اقتدار میں قبائلی سرداروں کو ایسا رام کیا تھا کہ ایک موقع پر جب وہ چھٹیاں گزار کر لندن سے اپنی میم کے ساتھ واپس آیا...... اور جب صاحب بہادر...... بگھی میں اپنی میم کے ساتھ بیٹھے تو گھوڑوں کی جگہ سرداروں نے سنبھال لی اور ریلوے سٹیشن سے ریزیڈنسی تک سارے سردار بگھی میں جتے ہوئے اسے کھینچتے ہوئے لے گئے۔''[10] کیونکہ وہ صاحب بہادر کے لئے بے حد شکر گزار تھے۔ اس نے ان کے لئے نہ صرف سالانہ وظائف وانعامات مقرر کئے تھے بلکہ انہیں جرگہ سسٹم کے تحت لامحدود اختیارات سے بھی نوازا تھا۔ انہیں یہ بھی حق تھا کہ وہ اپنے غریب عوام الناس سے جتنے چاہیں ٹیکس وصول کر سکتے تھے اور انہیں مظلوم عوام کی عورتوں کی عزت وآبرو لوٹنے کی بھی کھلی اجازت تھی۔ سنڈیمن نے جرگہ سسٹم سرحد کے پٹھانوں سے نقل کر کے بلوچستان پر تھوپ دیا تھا۔ پٹھانوں میں یہ طریقہ پہلے ہی سے رائج تھا۔ جہاں بڑے بوڑھے اکٹھے ہو کر کسی تنازعہ کا فیصلہ کرتے تھے اس کا نام جرگہ تھا جسے انگریزوں نے اپنا رنگ دے کر بذریعہ ایف۔سی۔آر لوگوں پر مسلط کیا تھا۔ اس کے باوجود بلوچستان کے بلوچی علاقوں میں لوگ جرگے کے نام سے واقف نہیں تھے۔ بلوچوں میں ہر فیصلے کا صرف سردار مختار کل ہوتا تھا۔

رابرٹ سنڈیمن نے بطور ایجنٹ گورنر جنرل 1879ء میں کوئٹہ کو اپنی انتظامیہ کا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا جبکہ والئ قلات میر خداداد خان نے ایک معاہدے کے تحت کوئٹہ اور اس کے گردونواح کے علاقے کے نظم ونسق کی ذمہ داری برطانوی افسروں کے حوالے کر دی تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ اگر برطانوی انتظامیہ کو اس علاقے سے کوئی فالتو آمدنی ہوئی تو وہ خان قلات کو دے دی جائے گی۔ 1883ء میں اس معاہدہ کی جگہ ایک اور معاہدہ ہوا تھا جس کی وجہ سے خان قلات کوئٹہ کے ضلع اور نیابت کے علاقے سے قطعی طور پر دستبردار ہو گیا تھا اور اس کے مالی، دیوانی اور فوجداری اختیارات کلی طور پر برطانوی انتظامیہ کو منتقل ہو گئے تھے۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ جب تک اس علاقے کا انتظام حکومت برطانیہ کے پاس رہے گا اس وقت تک خان کو سالانہ 25 ہزار روپے بطور کرایہ ملتے رہیں گے۔ ایک اور شق کے تحت درہ بولان کے علاقے کے سارے حقوق واختیارات بھی برطانوی انتظامیہ نے حاصل کر لئے تھے اور خان قلات کو اس کے معاوضے کے طور پر سالانہ 30 ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

1892ء میں رابرٹ سنڈیمن کا بیلہ میں انتقال ہوا تو اس کے سات سال بعد 1899ء میں حکومت برطانیہ اور خان قلات کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کے تحت نوشکی کے علاقے کے کلی حقوق واختیارات بھی دائمی طور پر برطانوی انتظامیہ کو مل گئے اور خان قلات کو سالانہ مزید نو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اس وقت میر خداداد خان لورالائی میں نظر بند تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا میر محمود خان دوئم گدی نشین تھا۔ اس معاہدے کے چار سال بعد 1903ء میں چوتھا معاہدہ ہوا جس کی رو سے نصیر آباد کا علاقہ بھی دائمی طور پر برطانوی انتظامیہ کی تحویل میں چلا گیا اور خان قلات کو اس کے عوض سالانہ ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے دیئے گئے اور سنجوقی کے علاقے کے عوض اسے مزید سالانہ دو ہزار پانچ سو روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ گویا 1879ء سے لے کر 1903ء تک کے عرصے میں پہلے میر خداداد خان نے اور پھر اس کے بیٹے میر محمود خان دوئم نے کوئٹہ، بولان، نوشکی اور نصیر آباد کے وسیع وعریض علاقے صرف سالانہ ایک لاکھ اکیاسی ہزار پانچ سو روپے کے عوض انگریزوں کے حوالے کر دیئے تھے۔ انگریزوں کو یہ علاقے روس کے خلاف اپنی فوجی حکمت عملی کے تحت درکار تھے اور قلات کے دونوں خوانین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کے اطمینان کے لئے یہ وعدہ کافی تھا کہ انہیں قلات کے قلعہ میں ان علاقوں کے پٹہ کی رقم

با قاعدگی سے ملتی رہے گی۔ 1903ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں پہلے 1909ء میں اور پھر 1919ء میں دو مرتبہ آئینی اصلاحات نافذ کیں مگر شمال مغربی صوبہ سرحد کی طرح بلوچستان بھی ان اصلاحات سے محروم رہا اور بلوچستانی ریاستوں میں بھی قرون وسطیٰ کا استبدادی نظام رائج رہا۔ یہاں تک کہ ان ریاستوں میں بردہ فروشی کی بھی قانوناً اجازت تھی اور عورتوں کی خرید و فروخت نیلامی کے ذریعے ہوتی تھی۔

باب: 2

بلوچستان کی سیاسی صورتِ حال اور برصغیر کی سیاست

مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ نے بلوچستان کے لئے مکمل صوبائی حقوق کا مطالبہ کیا

بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں نے بھی بلوچستان کو نظر انداز کئے رکھا تا آنکہ مارچ 1927ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں غیر فرقہ وارانہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر محمد علی جناح نے دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی جس کے پچیس تیس شرکاء میں مولانا محمد علی، سر علی امام، راجہ محمود آباد، ڈاکٹر ایم۔اے انصاری، مفتی کفایت اللہ اور سر محمد شفیع وغیرہ شامل تھے۔ اس کانفرنس میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو پانچ نکاتی فارمولا تیار کیا گیا تھا اس کا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کر کے انہیں دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے۔ پھر دسمبر 1928ء میں آغا خان کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں جو چودہ نکاتی قرارداد منظور کی گئی اس میں بھی یہ مطالبہ شامل تھا کہ بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ اور آئین دیا جائے۔ مارچ 1929ء میں جب دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں میں اتحاد ہوا تو محمد علی جناح نے اس چودہ نکاتی قرارداد سے اتفاق کر لیا اور بعد میں یہ قرارداد ''جناح کے چودہ نکات'' کے نام سے مشہور ہوئی اور اس طرح بلوچستان کے لئے صوبائی درجہ کا مطالبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیاسی نصب العین کا ایک اہم جزو بن گیا۔ تاہم 32-1930ء کی گول میز کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے ان میں صوبہ سرحد کو تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دے دیا گیا لیکن بلوچستان کے

عوام کو اس جمہوری حق سے بدستور محروم رکھا گیا۔

جب لندن میں یہ فیصلے ہوئے تھے اس وقت قلات میں میر محمود خان دوئم کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ انگریز ایجنٹ گورنر جنرل نے دسمبر 1931ء میں اس کے بھائی میر اعظم جان کو گدی نشین کیا تھا۔ یہ وہی میر اعظم جان تھا جس نے اپریل 1893ء میں اپنے والد میر خداداد خان کے وزیر فقیر محمد، اس کے 90 سالہ والد، 20 سالہ بیٹے اور اس کے ایک ملازم کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا اور اس واقعہ کے بعد ایک انگریز ایجنٹ گورنر جنرل نے اس سے یہ کہہ کر مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے بے گناہ فقیر محمد کے خاندان کے خون کی بو آتی ہے۔ اپریل 1932ء میں وائسرائے لارڈ ولنگٹن (Willington) نے اس کی دستار بندی کی رسم ادا کی تھی اور جون 1932 میں اسے جی۔سی۔آئی۔ای (G.C.I.E) کا خطاب دیا گیا تھا۔

دوسری طرف برطانوی بلوچستان میں ایک آزاد وطن پارٹی بن چکی تھی جو نظریاتی لحاظ سے آل انڈیا کانگرس سے منسلک تھی اور قلات میں ایک نیشنل پارٹی وجود میں آ چکی تھی جو آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانگرس سے ملحق تھی۔ جبکہ پورے بلوچستان میں مسلم لیگ کا کوئی نام لیوا نہیں تھا۔

قلات میں انگریزوں کے وفادار میر احمد یار خان کی تخت نشینی اور بلوچوں کی حالت زار

میر اعظم جان نے انگریز ایجنٹ گورنر جنرل کی زیر نگرانی ایک سال دس مہینے تک حکومت کی اور جب 9ستمبر 1933ء کو وہ راہیٔ ملک عدم ہو گیا تو اس کے چھوٹے بیٹے میر احمد یار خان کو اس کی گدی پر بٹھایا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میر احمد یار خان کی ماں نے ایک منصوبے کے تحت اپنے بڑے سوتیلے بیٹے اکرم جان کو ایام طفلی میں ہی منشیات کا اس قدر عادی بنا دیا تھا کہ جب وہ سن بلوغت کو پہنچا تو وہ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کو عالمی معاشی بحران کے اس خطرناک دور میں میر احمد یار خان کی وفاداری پر بہت اعتماد تھا۔ انگریزوں نے اس کی کس طرح تربیت کی تھی، اس کے بارے میں وہ خود لکھتا ہے کہ ''1920ء میں مجھے اے۔جی۔جی بلوچستان کا پرسنل اسسٹنٹ بنایا گیا۔ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے فوج میں 27 پنجاب رجمنٹ میں ایک سال تک فوجی تربیت دی گئی۔ چار سال تک ژوب ملیشیا فورٹ

سنڈیمن میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ 1927ء میں مجھے چاغی میں بطور ایڈ جوٹینٹ مقرر کیا گیا۔ کوئٹہ سے زاہدان تک پانچ سومیل لمبے علاقے کا میں انچارج تھا۔ چاغی لیویز جوتھوڑی سی فورس تھی، اس کی نفری ایک سو پچاس تھی۔ میں نے اس کی تعداد کو بڑھا کر چھ سونفری کر دی۔ میرا علاقہ مختلف پوسٹوں میں منقسم تھا۔ ژوب اور چاغی کی سروس میں مجھے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ اس لئے مجھے افغانستان اور ایران کی سرحدات بالخصوص روسی کمیونزم کے پھیلاؤ کی رفتار سے متعلق مخصوص فرائض انجام دینے پڑتے تھے۔ انگریز روس کی فارورڈ پالیسی سے خوفزدہ تھے۔ وہ اپنی سیاسی پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے افغانستان، ایران اور ہندوستان کے لوگوں کو خوفزدہ کرتے تھے۔ میں نے 28-1927ء میں روس اور افغانستان کے امان اللہ خان کے خلاف دو اہم رپورٹیں (ان رپورٹوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) حکام کو پہنچائی تھیں۔"[1]

جب ستمبر 1933ء میں میر احمد یار خان کو گدی نشین کیا گیا تو اس کے ساتھ ہی انڈین سول سروس کے ایک جواں سال انگریز افسر ایڈورڈ ویکفیلڈ (Edward Wakefield) کا اس کے وزیر اعظم کے طور پر تقرر ہوا تھا۔ ریاست قلات میں یہ پہلا انگریز افسر تھا جو وزارت عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ ویکفیلڈ خود اس کی ایک وجہ یہ لکھتا ہے کہ "میر احمد یار خان کے باپ میر اعظم جان نے اپنے بھائی میر محمود خان کے دور کے تجربہ کار وزیر اعظم نواب سر شمس شاہ کو برطرف کر کے اس کی جگہ ایک نہایت نکمے و بے حیثیت شخص کا تقرر کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعظم جان کے تقریباً دو سال کے عہد اقتدار میں ریاست کا خزانہ خالی ہو چکا تھا اور اس کی انتظامیہ انتشار اور افراتفری کا شکار تھی۔" دوسری وجہ وہ یہ لکھتا ہے کہ میر احمد یار خان کو "حکمرانی کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور اس کی رسمی طور پر کوئی تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ژوب لیوی کور میں ایک ادنٰی افسر تھا لیکن اب یکا یک ہز ہائی نس میر احمد یار خان، بیگلر بیگی، خان آف قلات بن گیا تھا۔ یہ ریاست ہندوستان کی تیسری بڑی ریاست تھی اور اس کے والی کو انیس توپوں کی سلامی ملتی تھی۔ لہٰذا اس ریاست کے جواں سال اور ناتجربہ کار حکمران کے ساتھ ایک انگریز کو منسلک کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔"[2]

لیکن ویکفیلڈ نے اپنے تقرر کی تیسری وجہ نہیں لکھی اور وہ یہ تھی کہ 1933ء میں دوسری عالمی جنگ کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور ان حالات میں برصغیر کے فوجی اہمیت کے علاقے میں ایک انگریز افسر کا تقرر ہونا ضروری تھا۔ اگر چہ میر احمد یار خان کی وفاداری شک و شبہ سے

بالاتر تھی، تاہم اس کی ناتجربہ کاری کسی وقت بھی اس نازک سرحدی علاقے میں سنگین صورتحال پیدا کرسکتی تھی۔ ریاست قلات اس لحاظ سے دوسری ہندوستانی ریاستوں سے مختلف تھی کہ اس کا صرف ایک تہائی علاقہ خان کے زیرانتظام تھا اور بقیہ تین چوتھائی علاقہ قبائلی سرداروں کے کنٹرول میں ہوتا تھا اور وہ سردار اگرچہ قلات کے دربار کی وفاداری کا دم بھرتے تھے لیکن وہ اپنے علاقوں میں اس کی ذراسی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ سنڈیمن نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں ان سرداروں کی خان قلات کے ساتھ صلح صفائی کرانے کا جو بندوبست کیا تھا وہ گزشتہ تیس سال کی بدانتظامی کے باعث ٹوٹ چکا تھا اور اس مقصد کے لئے نئے بندوبست کی ضرورت تھی۔ چونکہ ریاست کے خزانہ میں سرکاری ملازمین کو تنخواہیں دینے کے لئے کوئی پیسہ نہیں تھا اس لئے وہ رشوت ستانی پر گزارا کرتے تھے۔ ریاست مکران میں اگرچہ 1927ء میں قانونی طور پر غلام داری کا نظام ختم کر دیا گیا تھا لیکن عملاً اس کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ جیلیں ایسے قیدیوں سے بھری پڑی تھیں جن کے مقدموں کی سالہا سال سے سماعت نہیں ہوئی تھی۔ سرکاری اصطبل میں گھوڑے بھوکے مر رہے تھے کیونکہ ان کے لئے جو اناج دیا جاتا تھا وہ سائیس اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اپنے گھروں میں لے جاتے تھے۔ وزیراعظم کے دفتر میں رعایا کے شکایتی خطوط کے انبار لگے ہوئے تھے اور کبھی کسی نے ان میں سے کسی خط کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست قلات کی آبادی 4,70,000 تھی لیکن 1933ء میں یہ کم ہوکر صرف تین لاکھ رہ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریاست کا استبدادی نظام حکومت بلوچ اور بروہی قبیلوں کے سخت جان عوام کے لئے بھی ناقابل برداشت تھا۔ کچھی کے بہت سے لوگ ترک وطن کر کے سندھ چلے گئے تھے۔ دیہات خالی پڑے تھے اور زمین پر کوئی کاشت کرنے والا نہیں تھا۔ ریاست کے دوسرے علاقوں سے بھی بے شمار لوگ تلاش روزگار میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں چلے گئے تھے۔

خود میر احمد یار خان اس زمانے میں اپنی ریاست کے بلوچوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''سرداران قبائل 1876ء سے براہ راست عملاً انگریزوں کے کنٹرول میں چلے آتے تھے اور انگریزوں نے اپنی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے ذریعے سردار کو سردار کا اور قبیلے کو قبیلے کا دشمن بنا رکھا تھا۔ حریف سرداروں کی بیک وقت سرپرستی کی جاتی تھی اور دونوں طرف کے سینکڑوں بے گناہ قبائلی جیلوں میں پڑے سسک رہے تھے۔ قومی حمیت، اخلاص اور

وفاشعاری کے روایتی رشتے سردار اور قبیلہ کے درمیان ختم ہو چکے تھے۔ایک سردار اپنے قومی اعتماد اور قبیلے میں ہر دلعزیزی کی بجائے انگریز کی طاقت سے سردار تھا۔جونہی اس کے سر سے انگریز کا ہاتھ ہٹتا تھا اس کی سرداری ختم ہو جاتی اور بعض اوقات اس کو جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔بلوچ کنفیڈریسی،جس کی بنیاد خان،سردار،معتبرین اور عوام کے اشتراک،اخلاص اور روایات پر رکھی گئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ان قومی عناصر کے درمیان بیرونی طاقت کے مفاد کے لئے ظلم و جبر سے برائے نام سا رشتہ قائم تھا۔خان بلوچ خانہ نشین تھا اور انگریز اے۔جی۔جی، خان کی سربراہی کا کام کرتا تھا۔سرداران قبائل پولیٹیکل ایجنٹوں کے احکامات کے تابع تھے اور معتبرین،سردار اور نیابتیں حکم چلاتی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو عوام خود داری،قومی احساس اور روایتی ذمہ داریوں سے محروم ہوتے گئے اور دوسری طرف بلوچی عوام جورو جفا کی ناقابل برداشت اذیتوں سے تنگ آ کر ہجرت کرنے لگے۔ایک نائب سے لے کر وزیراعظم کے عہدے تک نوے فیصد غیر بلوچ اور انگریز کے ایجنٹ عہدوں پر فائز تھے جو بلوچی عوام میں ظلم وستم اور خوف و دہشت کا بازار گرم کرنے میں مصروف رہتے تھے۔بلوچ غلاموں کے غلام بن گئے۔ ایک لیوی سوار کی خوشامد کی جاتی تھی۔نائب و مستوفی تو فرعون بن گئے تھے جن کے سامنے بلوچ دست بستہ کھڑے ہوتے تھے۔مری بگٹی ایسے بہادر جنگجو قبائل کے تمندار صاحبان تک تحصیل دار، ای۔اے۔سی اور پولیٹیکل ایجنٹ قسم کے اہلکاروں کے رحم و کرم پر تھے۔"[3]

لیکن یہاں میر احمد یار خان نے یہ نہیں بتایا کہ اس سارے عرصے میں اس کا اپنا کردار کس قدر گھناؤنا اور شرمناک تھا اور یہ کہ اس نے بلوچستان پر انگریزوں کے اقتدار کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ جب 1817ء میں میر نصیر خان کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کے درمیان اور مختلف بلوچ قبائل کے درمیان انتہائی خونریز خانہ جنگی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تھا۔اس وقت انگریز وہاں موجود نہیں تھے۔اس لئے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ صرف انگریزوں نے ہی اپنی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے ذریعے سردار کو سردار کا اور قبیلے کو قبیلے کا دشمن بنا رکھا تھا اور قومی حمیت،اخلاص اور وفاشعاری کے روایتی رشتے ختم ہو چکے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان میں مختلف قبائل کے درمیان معاندانہ تضادات پہلے سے موجود تھے اور ان میں قومی حمیت اور وفاشعاری کے کوئی رشتے قائم نہیں تھے۔انگریز ان میں بذریعہ ثالثی مصالحت

کرانے کے بہانے یہاں آیا تھا لیکن بعدازاں اس نے ان کے دیرینہ تضادات سے فائدہ اٹھا کر فوجی اہمیت کے اس علاقے پر اپنا اقتدار مستحکم کیا تھا۔

برصغیر میں 1935ء کی سیاسی اصلاحات کے نتیجہ میں ریاست قلات میں سیاسی اصلاحات کا ڈھونگ

میر احمد یار خان کے ریاست قلات کی گدی پر بٹھائے جانے سے تقریباً چھ ماہ قبل مارچ 1933ء میں گول میز کانفرنس کی سفارشات بذریعہ قرطاس ابیض منظر عام پر آ چکی تھیں۔ چونکہ ان سفارشات میں ایک سفارش یہ تھی کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت وفاقی ہو گی اور اس وفاق میں ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اس لئے میر احمد یار خان سمیت سارے والیان ریاست کو اپنے مستقبل کے بارے میں خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ان کے اس خطرے کی نوعیت یہ تھی کہ اگر وہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی اکثریت کے ساتھ وفاق میں شامل ہو گئے تو انہیں بہت جلد اپنی ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ سے محروم ہونا پڑے گا کیونکہ ان دنوں پورے برصغیر میں سیاسی جمہوریت کی جو تیز ہوا چل رہی تھی ان کی ریاستیں اس کے اثرات سے زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں۔ میر احمد یار خان نے اس خطرے کے پیش نظر 1934ء میں اپنی ریاست کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور قبائلی سرداروں کو سمجھایا کہ انہیں متحد ہو کر اس خطرے کا سد باب کرنا چاہیے۔

جب نومبر 1934ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی نے متذکرہ سفارشات کے بارے میں اپنی رپورٹ شائع کی اور پھر دسمبر میں برطانوی ایوان میں اس رپورٹ پر بحث ہوئی تو میر احمد یار خان کے لئے اس خطرے کی گھنٹی کی آواز اور بھی تیز ہو گئی۔ چنانچہ اس نے 25/جنوری 1935ء کو اپنے سرداران قبائل کو جمع کیا اور ان سے یہ عہد نامہ لکھوایا کہ ''ہم حضور انور کی خدمت میں عرض گزار ہیں کہ حضور انور بہ مثل جد امجد بزرگوار خود میر نصیر خان اعظم نوری ہمارے تمام معاملات داخلی و خارجی و انتظامی امور کو براہ راست اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیں۔ ہماری اور ہماری اقوام کی ترقی و بہبود اور خوشحالی میں کوشاں رہیں۔ ہم اپنی جانب سے بصدق دل خداوند عزوجل، حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول اکرم، قرآن مجید اور محبوب سبحانی قدس سرہ کے

نام سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم حضور انور کے ہر قدم پر فرمانبرداری کیا کریں گے اور ملک وقوم کی بہتری کے لئے ہر ممکن تعاون وخدمت کریں گے۔ ہم امیدوار ہیں کہ حضور انور بہ جد امجد خود میر نصیر خان اعظم نوری ہمارے معاملات میں انصاف، ہمدردی وروا داری سے کام لیں گے"۔ [4]

چونکہ دہلی میں برطانوی ارباب اقتدار کو خان قلات کے اس اقدام پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لئے ایجنٹ گورنر جنرل نے سرداران اور قبائلی علاقوں کے کنٹرول ونظم ونسق کو اس کی حکومت کے حوالے کر دیا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ جوں جوں دوسری جنگ عظیم قریب آ رہی تھی حکومت برطانیہ کو اس سرحدی علاقے میں امن وامان برقرار رکھنے کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی اور یہ ضرورت میجر ہز ہائی نس میر حاجی سر احمد یار خان جی۔سی۔آئی۔ای، بیگلر بیگی، امیر الامراء، غالب جنگ بہادر کی وساطت سے بآسانی پوری ہوسکتی تھی۔ عالمی معاشی بحران کے زمانے میں بلوچی قبائلیوں کو باہمی خونریز تنازعات میں مصروف رکھنا برطانوی سامراج کے مفاد میں نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میر احمد یار خان کے انگریز وزیر اعظم ویکفیلڈ نے 1933ء میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد قبائلی سرداروں میں صلح صفائی کرانے کی بہت کوشش کی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ریاست میں 1930ء سے ایک کانگرس نواز قلات نیشنل پارٹی وجود میں آ چکی تھی ......اور......میر احمد یار خان کے بیان کے مطابق......"ریاست بلوچی کے جو تھوڑے بہت "باخبر" عالم تھے وہ ہمارے نوجوان قوم پرستوں کی طرح سخت جذباتی اور عجلت پسند تھے۔ ان کی تمام تر ہمدردیاں انگریز کے مقابلے میں کانگرس کے ساتھ تھیں جبکہ میرے سرداران قبائل، قبائلی عوام اور پرانی طرز کے عمل کی سوچ سمجھ ان کے برعکس تھی۔ ان دو متضاد طبقوں کو یکجا کر کے تعمیری مقاصد کا حصول بھی کافی دشوار مرحلہ تھا۔" [5] لہٰذا انگریزوں کو خدشہ تھا کہ اگر ان قوم پرست نوجوانوں اور علماء کے مقابلے میں خان قلات کی پوزیشن کو مضبوط نہ کیا گیا تو قلات نیشنل پارٹی کسی وقت بھی اس سرحدی علاقے میں حالات خراب کر دے گی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ خان کے چھوٹے بھائی شہزادہ عبدالکریم کی ہمدردیاں نہ صرف اس جماعت کے ساتھ تھیں بلکہ وہ کسی حد تک اشتراکی رجحانات کا بھی مظاہرہ کرتا تھا۔ اس زمانے تک انگریز روس ہی کو اپنا عالمی حریف تصور کرتے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ ہٹلر کے جنگی عزائم کا رخ کسی نہ کسی طرح ماسکو کی طرف موڑ دیا جائے۔

جولائی 1935ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے گول میز کانفرنس کی سفارشات کی بنیاد پر

مرتب کردہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی منظوری دی تو جمہوریت کی چڑیل سے جو ڈر لگا ہوا تھا اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ بہر قیمت اپنی ریاست کو ہندوستان کے مجوزہ وفاق سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ 1936ء کے اوائل میں ریاست کے اقتدار اعلیٰ اور برطانیہ کے درمیان معاہداتی تعلقات کے بارے میں قانونی ماہر کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے بمبئی کے ایک ممتاز قانون دان محمد علی جناح سے ربط ضبط بڑھایا اور اپنا کیس ان کے حوالے کر دیا۔ اس نے ایسا اس لئے کیا تھا کہ اس کی رائے میں ''محمد علی جناح مسلمانوں میں درجہ اول کے وکیل تھے۔ آئینی گتھیوں کو سلجھانے میں ان کی مہارت کا خاصا چرچا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے بھی سربراہ تھے۔ انگریز کی سیاسی حکمت عملیوں اور شاطرانہ طرز عمل کو سمجھنے والا ان سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا۔''[6] گویا وہ بطور خان قلات اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے محمد علی جناح سے نہ صرف قانونی امداد چاہتا تھا بلکہ وہ اس مقصد کے لئے ان کی سیاسی پشت پناہی کا بھی خواہاں تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب میں نے محمد علی جناح سے تبادلۂ خیالات کیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ ''یور ہائی نس میں آپ کی پوزیشن اور مشکلات کو سمجھ گیا۔ آپ اپنی قوم اور ملک کی بہتری کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں آپ کی بلا معاوضہ اعانت کروں گا۔ ایک دوست اور بھائی کی طرح۔ یوں بھی مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے لڑ رہا ہوں۔ آپ کا ملک جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اہم ترین ملک ہے۔ آپ کی غیور قوم کے بغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی بے سود ہوگی۔ میں آپ کو نہایت صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جسے شاید میں نہ دیکھ سکوں کیونکہ عمر رسیدہ ہوں مگر آپ غالباً اسے دیکھ سکیں گے کہ تمام اسلامی ممالک اسلامی اصولوں کے مطابق ایک فیڈریشن کی صورت میں آپس میں متحد ہو جائیں گے۔ اس رابطہ کو قائم رکھنے کے لئے سب سے اہم ترین حیثیت جس قوم اور جس ملک کو حاصل ہوگی وہ آپ کی قوم بلوچ اور آپ کا ملک بلوچستان ہوگا۔ جغرافیائی لحاظ سے بلوچستان کو جس کے شمال میں افغانستان، مغرب میں ایران، مشرق میں ہندوستان اور جنوب میں بحیرہ عرب واقع ہے یہ اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا بلوچستان اور بلوچ قوم اس بین الاقوامی اتحاد کا مقام اتصال اور اصل گرہ ہوگی۔ جہاں تک آپ کے کیس کے سیاسی پہلو کا تعلق ہے اس کے لئے سیاسی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی تنظیم کی جو

آپ کے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرے اور اسمبلی میں آپ کے کیس کے لئے جدوجہد کرے۔"[7]

میر احمد یار خان نے اپنی تاریخ بلوچستان میں جناح سے جو یہ الفاظ منسوب کئے ہیں وہ بادی النظر میں بالکل بے بنیاد اور غلط معلوم ہوتے ہیں۔ 1936ء میں محمد علی جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہونے کے باوجود غیر فرقہ وارانہ انڈین نیشنلزم کے علمبردار تھے اور ان کی جدوجہد آزادی صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "میں پہلے ہندوستانی ہوں اور اس کے بعد مسلمان ہوں۔" وہ پان اسلام ازم کے قائل نہیں تھے۔ اسی لئے انہوں نے 1921ء کی تحریک خلافت سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی تھی۔ وہ مذہب کو سیاست میں ملوث کرنے کے بھی حق میں نہیں تھے۔ اس لئے وہ گاندھی کی مہاتمائیت کے خلاف تھے۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ 1937ء کے عام انتخابات کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان 1916ء کے لکھنوَ پیکٹ کی طرح کا کوئی سمجھوتہ کر کے برصغیر کی آزادی کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ اس لئے جب خان قلات نے 1936ء میں ان سے قانونی مشورہ کیا تھا تو وہ اس سے مندرجہ بالا قسم کی سیاسی باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے منسوب کردہ یہ ساری باتیں سراسر غلط بیانی پر مبنی ہیں۔ ان کے اس بیان کے صحیح ہونے کا کوئی دستاویزی یا واقعاتی ثبوت نہیں ہے۔

محمد علی جناح سے قانونی مشورہ کرنے کے بعد میر احمد یار خان نے اپنی ریاست میں نام نہاد سیاسی و معاشرتی اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ 1937ء میں جب برصغیر میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد نمائندہ صوبائی وزارتوں کی تشکیل ہوگئی تو میر احمد یار خان نے بھی اپنی ریاست میں دارالعوام اور دارالامراء کے 87 ارکان پر مشتمل ایک دوایوانی مقننہ کا ڈھونگ رچا دیا۔ لیکن اس نام نہاد مقننہ کو کوئی اختیارات حاصل نہیں تھے بلکہ اس کی حیثیت محض مشاورتی تھی کیونکہ اس سلسلے میں جو آئین مرتب کیا گیا تھا اس کے تحت سارے قانونی اور انتظامی اختیارات خان کی اپنی ذات میں ہی مرتکز تھے۔ اس نے ایک کابینہ بھی نامزد کی تھی جو بظاہر مقننہ کے سامنے جواب دہ تھی لیکن عملاً خان کی فرمانبردار تھی کیونکہ اسے کابینہ کے فیصلوں کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ ایک 12 رکنی سٹیٹ کونسل بھی قائم کی گئی لیکن اس کونسل کے اختیارات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بعض عدالتی، انتظامی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی اعلان کیا گیا مگر ان کی زیادہ تر حیثیت محض کاغذی تھی۔ خان کا دعویٰ

یہ تھا کہ اس نے تعلیم کی مد پر ریاست کا سالانہ بجٹ 13 ہزار روپے سے بڑھا کر چار لاکھ روپے کر دیا ہے مگر عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اگست 1947ء تک اس کی پوری ریاست میں کسی ایک ماڈرن کالج کا ہونا تو درکنار کوئی ایک ماڈرن ہائی سکول بھی موجود نہیں تھا۔

میر احمد یار خان نے جس قسم کی ''اصلاحات'' کی تھیں اس قسم کی نام نہاد اصلاحات ریاست جموں وکشمیر، ریاست حیدر آباد دکن اور بعض دوسری بڑی ریاستوں میں بھی کی گئی تھیں اور ان کی بنیاد یہ تھی کہ یہ والیان ریاست گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ہندوستان کے وفاق میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ وہ برائے نام سیاسی، انتظامی اور معاشرتی اصلاحات کا چرچا کر کے اپنی رعایا کو برصغیر کے سیاسی دھارے سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی مطلق العنانیت سے کسی صورت دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھے۔ برطانوی سامراج ان کے اس رویے کی پشت پناہی کرتا تھا کیونکہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں اور والیان ریاست کے درمیان اختلافات سے ان کے مفادات کو فروغ ملتا تھا۔

ستمبر 1939ء میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں کو اپنی ہندوستانی سلطنت کے ان داخلی اختلافات سے بہت فائدہ ہوا۔ کانگرس ہندوستان کی مکمل آزادی کے اعلان کی عدم موجودگی کے باعث اس جنگ میں برطانیہ سے کوئی تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تھی اور مسلم لیگ بھی ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت حاصل کئے بغیر اس سلسلے میں حکومت سے تعاون کرنے سے گریزاں تھی۔ لیکن ان دونوں سیاسی جماعتوں کے برعکس والیان ریاست نے اپنے برطانوی آقاؤں کو بڑھ چڑھ کر مالی اور افرادی امداد مہیا کی۔ میر احمد یار خان نے اس جنگ کے دوران انگریزوں سے اپنی وفاداری کا مثالی مظاہرہ کیا۔ اس نے قبائلی سرداروں کے ساتھ صلح صفائی کر کے اپنے علاقے میں کوئی بدامنی نہ ہونے دی حالانکہ صوبہ سرحد سے ملحقہ وزیرستان کے پٹھان قبائل مسلسل بغاوتیں کرتے رہے جن سے انگریزوں کا خاصا جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ جبکہ انہیں 1941ء کے اوائل تک یہ خطرہ لاحق تھا کہ ''نازی جرمنی اور سوویت یونین کے درمیان اشتراک عمل جاری رہا تو جنگ کے شعلے ہندوستان تک پہنچ جائیں گے اور اس کے نتیجے میں سوویت یونین کو بحر ہند تک رسائی حاصل ہو جائے گی''۔[8]

بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کے خلاف کانگرس اور برطانوی سامراج کا گٹھ جوڑ

انگریزوں کو لاحق شدہ خطرہ کی متذکرہ خبر لاہور کے ایک انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپی تو اس کے دو تین دن بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے لاہور میں پاکستان کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے دفاع کے لئے جو مساعی کر رہی ہے اس میں کوئی رکاوٹ ڈالنا ہندوستان کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ ''مسلم لیگ کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ ہمیں حکومت برطانیہ سے خواہ کیسی ہی شکائتیں ہوں ہم براہ راست جنگ میں ملوث ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان بھی خطرے میں ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ حکومت برطانیہ سے بھرپور تعاون کرنے پر آمادہ ہے...... کہا جاتا ہے کہ اگر مسلم انڈیا الگ ہو گیا تو ہندو انڈیا خطرے میں پڑ جائے گا کیونکہ مسلم انڈیا جلد ہی اس پر حملہ کر دے گا۔ یہ دلیل سراسر بے بنیاد ہے۔ ہندو انڈیا کے 25 کروڑ لوگوں کو مسلم انڈیا کے 9 کروڑ لوگوں سے کوئی ڈر نہیں لگنا چاہیے۔ اس کے برعکس مسلم انڈیا کی حیثیت سرحدی چوکیوں کی ہو گی اور ہمارے زونوں میں کسی غیر ملکی حکومت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح ہمیں بھروسہ ہے کہ ہندو انڈیا بھی اپنے زون میں ایسا ہی کرے گا۔''[9]

جناح لاہور میں یہ خطاب کرنے کے بعد دہلی پہنچ کر مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں شریک ہوئے تو وہاں غلام بھیک نیرنگ کی یہ تحریک زیر بحث تھی کہ بلوچستان کو صوبائی خودمختاری دی جائے۔ نیرنگ کی اپنی اس تحریک کے حق میں تقریر یہ تھی کہ ''حکومت کی اس دلیل میں کوئی جان نہیں ہے کہ بلوچستان میں اصلاح یافتہ نظام حکومت کے تحت نظم و نسق نہیں چلایا جا سکتا۔ برار کا علاقہ نظام دکن کی ملکیت ہے لیکن اس کے باوجود وہاں اصلاح یافتہ نظام حکومت کی مکمل مشینری موجود ہے۔ اگر حکومت واقعی اصلاحات رائج کرنا چاہے تو کسی علاقے یا آبادی کی چھوٹائی کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ بلوچستان کو اصلاحات کی ضرورت ہے کیونکہ یہ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہے، معاشی طور پر بدحال ہے اور مستقل طور پر ایک طرح کے مارشل لاء کے تحت ہے۔ لیکن صوبہ سندھ سے اسمبلی کے ایک ہندو رکن لال چند نول رائے نے یہ کہہ کر اس تحریک کی مخالفت کی کہ بلوچستان

اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ ''سندھ کے ہندو اپنے علاقے کی بمبئی سے علیحدگی پر پچھتا رہے ہیں کیونکہ انہیں سندھ کی خود مختاری کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ہمسائے بھی اسی قسم کی بدحالی میں مبتلا ہوں۔'' مولانا ظفر علی خان نے اپنی تقریر میں اس خیال کا اظہار کیا کہ ''حکومت برطانیہ اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت بلوچستان کو ایک امپیریئل ریزرو (Imperial Reserve) بنانا چاہتی ہے۔ اگر وہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ایک کروڑ روپے دینے کی استطاعت رکھتی ہے تو یقیناً وہ بلوچستان کو بھی کچھ نہ کچھ دے سکتی ہے۔ میں سیکرٹری خارجہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بلوچستان کے معاملے پر غیر جانبداری سے غور کرے۔ مسلم لیگ نے بلوچستان کے لئے خود مختاری حاصل کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور اس وعدے کی تکمیل کے لئے ہمیں جتنی بھی قربانیاں دینی پڑیں ہم ان میں کوئی تامل نہیں کریں گے۔'' تاہم سیکرٹری خارجہ ایم۔ او۔ کے۔ کیرو (M.O.K. Caroe) نے مولانا کی اس اپیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا ''بلوچستان کی آبادی دو لاکھ سے کم ہے۔ نمائندہ اداروں یا آئینی اصلاحات کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے متعلقہ علاقے کے لوگوں کی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیا اتنے تھوڑے سے لوگوں کے لئے گورنری صوبے کا قیام ممکن ہے جتنے کہ پنجاب یا یو۔ پی کی ایک تحصیل میں آباد ہوتے ہیں۔ جہاں تک بلوچستان کے سندھ کے ساتھ ادغام کی تجویز کا تعلق ہے اس پر عمل کرنے سے پہلے یہ یقین ہونا ضروری ہے کہ بلوچستانی عوام بھی واقعی سندھ کے عوام سے ادغام چاہتے ہیں یا سندھ کے عوام بلوچستانی عوام کے ساتھ مدغم ہونے کے خواہاں ہیں۔'' لال چندنول رائے نے کہا ''ہم ایسا نہیں چاہتے''۔ کیرو نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگرچہ 31 مئی 1935ء کے زلزلے کے بعد وہاں تعمیر نو کا پروگرام ابھی مکمل نہیں ہوا تاہم بلوچستان میں فی کس تعلیمی خرچ مدراس، بنگال، بہار اور یو۔ پی سے زیادہ ہے۔

مسٹر جناح: اس کا نتیجہ کیا ہے؟ وہاں ایسے لوگوں کا تناسب کیا ہے جو تھوڑا بہت پڑھ سکتے ہیں؟

کیرو: میں اس وقت اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ حکومت ہندوستان بلوچستان میں تعلیم کا 70 فیصد خرچ برداشت کرتی ہے اور یہ تناسب ہندوستان کے کسی بھی دوسرے علاقے سے زیادہ ہے۔

کیرو نے مزید کہا کہ حکومت پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اس صوبہ میں نمائندہ ادارے

قائم کرے۔اس نے کہا''اس تحریک کا محرک جس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے وہ حال ہی میں اکثر و بیشتر ہندوؤں کی گنتی پر نکتہ چینی کرتی رہی ہے۔میں اپنے آپ کو ان دونوں پالیسیوں میں سے کسی ایک سے بھی وابستہ نہیں کرتا۔میں ہندوستان میں نمائندہ اداروں کے قیام کے بارے میں حکومت کی پالیسی کا پابند ہوں۔لیکن میں اس مؤقف کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس کے تحت ایک سانس میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہے اور دوسرے سانس میں یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت دینی چاہیے۔''نواب زادہ لیاقت علی خان نے مرکزی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے اس بحث کے دوران اپنی پہلی تقریر میں سیکرٹری خارجہ کی آئینی موشگافیوں پر نکتہ چینی کی۔اس نے کہا کہ''سرکاری ممبر کو معلوم ہے کہ صوبہ کے مسلمان کیا چاہتے ہیں۔وہ صوبہ کی انتظامیہ میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں۔یہ کہنا بے سود ہے کہ وہاں نمائندہ اداروں کا قیام ممکن نہیں۔ اگر بلوچستان علاقے کے لحاظ سے ایک تحصیل سے بڑا نہیں ہے تو وہاں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو اس کے سائز کے لئے موزوں ہوں۔بلوچستان میں خواندگی کا تناسب ہندوستان میں کم ترین ہے اور وہاں ہندوستانی اہلکار حکومت کے ڈر سے عوام الناس کے قریب نہیں آتے۔ہوسکتا ہے کہ ایک تحصیل جتنے علاقے کو گورنری صوبہ بنانا ممکن نہ ہو لیکن وہاں کے عوام سے انسانوں کا سا سلوک کرنا اور انہیں اپنے جذبات کے اظہار کا حق دینا تو ناممکن نہیں ہے۔''نوابزادہ کی تقریر کے بعد مسٹر جناح نے بتایا کہ 37-1936ء میں بلوچستان میں خواندگی کا تناسب ایک اعشاریہ چھ فیصد تھا اور اس کے بعد اس تناسب میں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔''اگلے دن اسمبلی میں اس تحریک پر رائے شماری ہوئی تو مسلم لیگ کی یہ تحریک تخفیف 18 کے مقابلے میں 40 ووٹوں سے مسترد ہوگئی۔ کانگرس اور نیشنلسٹ پارٹی نے تحریک کے خلاف ووٹ دیئے لیکن کانگرس کے ایک مسلمان رکن کاظمی نے اس کے حق میں ہاتھ کھڑا کیا۔سر عبدالحلیم غزنوی اور مولوی عبدالرشید چودھری نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔[10]

مرکزی اسمبلی میں اس ساری بحث کا ایک قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ مسلم لیگی لیڈروں نے اپنی تقریروں میں بلوچستانی ریاستوں میں اصلاحات کے نفاذ کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ان کا اصلاحات کا مطالبہ صرف برطانوی بلوچستان تک محدود تھا۔اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہندو ارکان اسمبلی جمہوریت اور غیر فرقہ وارانہ قوم پرستی کے علمبردار ہونے کے باوجود بلوچستان میں جمہوری

اصلاحات کے خلاف تھے اور انہوں نے اس تحریک کی مخالفت میں حکومت کا ساتھ دے کر برصغیر میں ہندو مسلم تضاد اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ تیسرا پہلو یہ تھا کہ ہٹلر کی ہر محاذ پر پیش قدمی کے پیش نظر حکومت برطانیہ بلوچستان میں جمہوری اصلاحات نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ اس سرحدی علاقے پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا عزم رکھے ہوئے تھی۔

خلیج فارس میں برطانوی سامراجی مفادات بلوچستا ن میں جمہوری اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ بنے۔

4/اپریل 1941ء کو عراق میں فوجی انقلاب کے ذریعے رشید علی کی حکومت بنی تو بلوچستان کی فوجی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ عام تاثر یہ تھا کہ رشید علی کے نازی جرمنی کے ساتھ کوئی خفیہ روابط ہیں۔ تاہم 14/اپریل کو مدراس میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن قاضی محمد عیسیٰ نے ایک قرارداد میں اس مطالبے کا اعادہ کیا کہ بلوچستان میں فوری طور پر اصلاحات نافذ کی جائیں۔ لیکن قاضی عیسیٰ کا یہ مطالبہ بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوا۔ حکومت برطانیہ اس قسم کے مطالبے پر ایسے حالات میں کوئی توجہ نہیں دے سکتی تھی جب کہ سوویت یونین، جاپان کے ساتھ غیر جانبداری کا معاہدہ کرنے کے بعد اپنی فوجیں منچوریا سے مغرب کی جانب منتقل کر رہا تھا اور یہ بھی مطالبہ کر رہا تھا کہ اسے ایران میں آذر بائیجان کے علاقے پر قبضہ کرنے کا حق دیا جائے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ ”سوویت یونین کی نازی جرمنی کے ساتھ اس بات پر مفاہمت ہو گئی ہے کہ روس کو سوویت بلاک کی توسیع کے لئے وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں کھلی چھٹی ہو گی اور سوویت یونین کی جانب سے آذر بائیجان پر قبضے کا حق جتانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلیج فارس تک پہنچنا چاہتا ہے۔“[11]

پھر جب مئی 1941ء کے پہلے ہفتے میں عراقی افواج اور برطانیہ کی زیر کمان ہندوستانی فوجوں کے درمیان تصادم شروع ہو گیا تو بلوچستان میں اصلاحات کے مطالبہ کے پورا ہونے کی ذرا سی امید بھی باقی نہ رہی۔ 8/مئی کو فوجی ماہرین کے حوالے سے جاری شدہ خبر یہ تھی کہ ”عراق میں رشید علی کی حکومت نے دشمن سے ساز باز کر رکھی ہے اور اگر اس بنا پر عراق کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو ہندوستان خطرے میں پڑ جائے گا۔ اگر دشمن عراق میں پہنچ گیا تو بہت جلد ایران میں آ جائے گا

جہاں ہوائی اڈے موجود ہیں اور پھر اس کے لئے ایران سے بلوچستان میں پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔"[12] اور 12 رمئی کو شملہ ہی میں شفاعت احمد خان کا بیان کہ "عراق کی صورت حال میں ہندوستان کو خطرہ مضمر ہے اس لئے حکومت برطانیہ نے رشید علی کی حکومت کے خلاف جو اقدام کیا ہے، اس کے لئے وہ تعریف کی مستحق ہے کیونکہ سارے مسلم ممالک رشید علی کو غاصب سمجھتے ہیں۔ برطانیہ کی جانب سے عراق میں فوجیں بھیجنے کا مقصد بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں کی جائز اور آئینی حکومت کو بحال کیا جائے۔ اگر حکومت برطانیہ اس سلسلے میں کوئی پس وپیش کرتی تو عراق، افغانستان، شام، ایران، مصر اور ترکی فوراً جنگ میں شامل ہو جاتے اور پھر جرمنی کی بکتر بند فوجیں سیدھا کوئٹہ تک پہنچ جاتیں۔"[13] اسی دن یہ خبر بھی چھپی کہ وائسرائے کی جانب سے ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد ہونے کا امکان ہے جس میں ہندوستان کی سرحدوں کے دفاع اور عراق کی صورت حال پر غور کیا جائے گا۔ اس مجوزہ کانفرنس میں اعلیٰ فوجی حکام کے علاوہ پنجاب اور بنگال کے وزرائے اعلیٰ......سر سکندر حیات خان اور مولوی فضل الحق......بھی شریک ہوں گے۔

16 رمئی کو پروفیسر گلشن رائے کا مضمون سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ کو براستہ افغانستان اور ایران مشرق وسطیٰ پر حملہ کر دینا چاہیے۔ 17 رمئی کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کا اداریہ یہ تھا کہ اگر دشمن نے تیل کے ذخائر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے عراق اور ایران کے لئے خطرہ پیدا کر دیا تو عالمی جنگ ہندوستان کی دہلیز تک پہنچ جائے گی اور 19 رمئی کو سکندر حیات خان کا بیان یہ تھا "آج کل ہندوستان کے لئے جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کا پوری طرح احساس نہیں کیا جا رہا۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم سب کو ہندوستان کے مؤثر دفاع کے لئے سیاسیات کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہو جانا چاہیے۔" سر سکندر حیات خان کے اس بیان کے ساتھ کوئٹہ سے یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ بلوچستان کے ریزیڈینٹ نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت ایک مقامی اخبار "استقلال" کی اشاعت بند کر دی ہے کیونکہ اس میں قابل اعتراض خبریں شائع ہوئی تھیں۔ اس دن یہ خبر بھی چھپی کہ ژوب کے پولیٹیکل ایجنٹ نے اعلیٰ فوجی حکام کے ساتھ سرحدی علاقے کا دورہ کیا ہے اور انہوں نے اس دورے میں مقامی خانہ بدوشوں کے بہت سے تنازعات کا تصفیہ کرایا ہے اور پھر 31 رمئی کو کوئٹہ میں یہ سرکاری اعلان ہوا کہ مقامی اخبار استقلال کے ایڈیٹر اللہ بخش سلیم کو بلوچستان سے نکل جانے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے یہ بھی ہدایت کی گئی ہے

کہ وہ ایران، افغانستان اور ریاست قلات میں داخل نہ ہو۔''

یہ ساری خبریں اس حقیقت کی مظہر تھیں کہ 1941ء کے وسط میں بلوچستان کی حیثیت برطانیہ کی ایک چھاؤنی کی سی تھی اور برطانیہ کو ہمہ وقت یہ خطرہ تھا کہ سوویت یونین یا نازی جرمنی کی فوجیں کسی وقت بھی براستہ عراق اور ایران کوئٹہ پہنچ جائیں گی۔ اس خطرہ کی بنا پر ہندوستان میں برطانوی کمانڈر ان چیف نے جون میں کوئٹہ اور بلوچستان کے سرحدی علاقوں کا طویل دورہ کیا تھا۔ اس دورہ میں اس نے نہ صرف مختلف مقامات میں توپ خانے اور بکتر بند گاڑیوں سے لیس پنجابی، راجپوت، مرہٹہ، پٹھان اور گورکھا فوجی دستوں کا معائنہ کیا تھا بلکہ اس نے ان علاقوں میں متعدد قبائلی سرداروں کے علاوہ خان آف قلات سے بھی ملاقات کی تھی۔[14] اس سے قبل سر سکندر حیات، سر شفاعت احمد خان، نواب چھتاری اور نواب رامپور وغیرہ بذریعہ اخباری بیانات عراق میں برطانیہ کی فوجوں کے داخلے کی پرزور تائید کر چکے تھے اور یہ بھی یقین دلا چکے تھے کہ مسلم انڈیا مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی فوجی کارروائیوں کی امداد کرتا رہے گا اور صوبہ سرحد کا گورنر سر جارج کننگھم بھی ایک سرکاری بیان میں اعلان کر چکا تھا کہ ''برطانیہ اسلام کا دوست ہے اور وہ عراق کو محوری طاقتوں کے چنگل سے بچانے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ برطانیہ کی بری فوج، ہندوستان کی بری فوج اور برطانیہ کی ہوائی فوج کے عراق میں جانے کے دو مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ عراق کو جرمنی، اٹلی اور دوسرے دشمنوں سے بچایا جائے اور دوئم یہ کہ ہندوستان کا دفاع کیا جائے کیونکہ جرمنی براستہ عراق ہندوستان پر حملہ کرنے کی امید کرتا ہے۔''[15]

لیکن جب 23رجون 1941ء کو جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو عالمی جنگ کی نوعیت میں یکا یک بنیادی تبدیلی آ گئی۔ اب برطانیہ کو یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ سووت یونین براستہ ایران بلوچستان پر حملہ کر دے گا اور یہ خطرہ بھی ٹل گیا تھا کہ جرمنی براستہ عراق ہندوستان پہنچ جائے گا کیونکہ 3رجون کو بغداد میں رشید علی کی حکومت کا تختہ الٹا جا چکا تھا، شاہ فیصل دوئم کو طفلگی میں ہی تخت نشین کر دیا گیا تھا۔ موصل میں تیل کے چشموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور برطانیہ کی زیر کمان ہندوستانی فوجیں ان چشموں کی حفاظت پر مامور کی جا چکی تھیں۔ پھر جب جولائی میں سوویت یونین اور برطانیہ کے درمیان جرمنی کے خلاف اشتراک عمل کا فیصلہ ہو گیا تو بلوچستان کو لاحق شدہ خطرے کا مزید سد باب ہو گیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بلوچستانی عوام کو

جمہوری حقوق دینے کی کوئی تجویز زیر غور نہ آئی۔ان کے علاقے کا جغرافیائی محل وقوع بدستور ان کی ہمہ گیر پسماندگی کا باعث بنا رہا۔

8/اگست 1941ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ اینتھونی ایڈن (Anthony Eden) کا بیان یہ تھا کہ ایران میں بہت سے جرمن باشندے موجود ہیں جو کسی وقت بھی اس علاقے کی آزادی کے لئے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں اور 14/اگست کو لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا اس بیان پر تبصرہ یہ تھا کہ جب سے جرمنی نے بالشوزم کے خلاف جہاد شروع کیا ہے اس وقت سے ایران میں اس کے ایجنٹ اس مقصد کے تحت مذہب کے علمبردار بن گئے ہیں کہ اس طرح انہیں ملاؤں کی حمایت حاصل ہو جائے گی اور اسی دن سوویت یونین نے ایران کو متنبہ کیا تھا کہ وہ ایران میں جرمنی کے جاسوسوں کی سرگرمیوں کو مزید برداشت نہیں کرے گا۔24/اگست کو اس اخبار کی ادارتی رائے یہ تھی کہ ایران میں نازی خطرے کا فوری طور پر سد باب نہ کیا گیا تو جرمنی اس ملک کو نیا فوجی اڈہ بنالے گا۔ پھر یہاں سے افغانستان اور ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ چنانچہ 25/اگست کو برطانیہ اور سوویت یونین نے مشترکہ طور پر فوجی کاروائی کر کے ایران پر قبضہ کر لیا۔ 26/اگست کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کا مؤقف یہ تھا کہ ایران میں اتحادیوں کی یہ فوجی کاروائی عراق، ترکی، روس، افغانستان اور بلوچستان کے دفاع کے لئے ضروری تھی۔ 27/اگست کو جنرل نارٹن (Norton) کا بیان یہ تھا کہ بلوچستان اور ایران کی سرحد پر بالکل امن و امان ہے۔ وہاں کوئی قبائلی یا فوجی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔لیکن جب 8/ستمبر کو ایران کی سرحد کے نزدیک ضلع چاغی کے قبائلی سرداروں نے پولیٹیکل ایجنٹ کے نام ایک مراسلے میں ایران میں برطانیہ کی فوجی کاروائی کی پرزور تائید کی تو بلوچستان میں کسی گڑبڑ کا خطرہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔اسی دن برطانیہ کی زیر کمان ہندوستانی فوجوں نے ایران کے قصبہ سلطان آباد میں تیل کے چشموں کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔اس کے ایک ہفتہ بعد 17/ستمبر کو برطانوی اور روسی فوجوں نے تہران میں داخل ہو کر ایران کے بادشاہ رضا خان پہلوی کو معزول کر کے اس کی جگہ 22 سالہ ولی عہد محمد رضا شاہ کو تخت پر بٹھا دیا تھا اور پھر جب یکم نومبر کو حکومت افغانستان نے سارے جرمن اور اطالوی باشندوں کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیا تو بلوچستان ایران میں برطانوی اور روسی فوجوں کے لئے خوراک اور دوسری اشیاء کی سپلائی کا مرکز بن گیا۔

دسمبر 1941ء میں جب برطانیہ،سوویت یونین اور ایران کے درمیان سہ فریقی معاہدہ ہوا جس کے تحت ایران کی جانب سے برطانیہ اور سوویت یونین کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ عالمی جنگ کے دوران اپنی فوجیں ایران میں رکھ سکتے ہیں اور یہ کہ ایران محوری طاقتوں اور ان کے مقبوضہ ممالک سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کرلے گا اور اسی مہینے میں جب امریکہ کے ایک فوجی اتاشی میجر گارڈن یوڈرز (Garden Yoders) کا پہلی مرتبہ افغانستان میں تقرر ہوا تو اس امر کا قطعی یقین ہوگیا کہ بلوچستان کی سرحدیں بالکل محفوظ ہیں۔ نازی جرمنی کی جانب سے اب براستہ عراق یا ایران حملے کوئی امکان نہیں رہا ہے اور افغانستان کی سرزمین سے بھی کوئی کاروائی نہیں کرسکتا ہے۔

مئی 1942ء میں سندھ میں حروں کی بغاوت ہوئی تو اس کا بلوچستان میں کوئی اثر نہ ہوا۔ اس مہینے میں درخالد اور جھلاواں کے علاقے میں مینگل اور بزنجو قبائل کے درمیان ایک تصادم ہوا لیکن اس کا سندھ کی بغاوت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 11رجون 1942ء کو سوویت یونین اور برطانیہ کے مابین ایک بیس سالہ فوجی معاملہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین عالمی جنگ کے دوران اور بعد میں فوجی تعاون برقرار رکھیں گے۔ اس معاہدے کے بعد ہندوستان کو شمال مغرب کی جانب کسی حملے کا بالکل ہی کوئی خطرہ نہ رہا تو بلوچستان کی انتظامیہ نے مکمل اطمینان کا سانس لیا۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل سر اوبرے میٹکاف (Aubery Metcalfe) نے 23رجون کو کوئٹہ میں پہلے انٹرمیڈیٹ کالج کا افتتاح کیا اور چند ہفتوں کے بعد یہ خبر دی گئی کہ کوئٹہ میں شیمپین کی کشید کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ اگست 1942ء میں آل انڈیا کانگرس کی جانب سے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع ہوئی تو اس سے بلوچستان صرف اس حد تک متاثر ہوا کہ 23راگست کو عبدالصمد اچکزئی کی انجمن وطن کی مجلس عاملہ کے سات ارکان کو نظر بند کردیا گیا۔

ستمبر 1942ء میں امریکی صدر روز ویلٹ کے نمائندہ ویںڈل ولکی (Windell Wilkie) نے ایران وعراق کا دورہ کیا تو یکم اکتوبر کو وزیر ہند لارڈ ایمری (Amery) نے لندن میں ہندوستان کے مستقبل کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ جنگ سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ چھوٹے غریب ممالک بڑی طاقتوں کے بمباروں، ٹینکوں اور دوسرے جدید اسلحہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہندوستان کو بھی کافی عرصے کے لئے اپنے فوجی دفاع اور معاشی مفادات کے لئے کسی موزوں بیرونی تنظیم کی ضرورت ہوگی۔[16] ویںڈل ولکی کے متذکرہ سروے اور ایمری کی اس

تقریر کا مطلب یہ تھا کہ اینگلو۔امریکی سامراج نے بلوچستان اور صوبہ سرحد کی سرحدوں کے تحفظ کا انتظام کرنے کے بعد 1942ء میں ہی یہ منصوبہ بنانا شروع کر دیا تھا کہ عالمی جنگ کے بعد خلیج فارس کے علاقے میں تیل کے ذخائر کے تحفظ کے لئے کسی نہ کسی طرح کے فوجی گٹھ جوڑ کا بندوبست کیا جائے گا۔ اس وقت تک عراق میں نابالغ بادشاہ شاہ فیصل دوئم کے سرپرست وزیراعظم نوری پاشا اور ایران میں شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کے معتمد وزیراعظم قوام السلطنت کی حکومتیں بن چکی تھیں اور یہ دونوں ممالک سیاسی و اقتصادی لحاظ سے پوری طرح انگریزوں اور امریکیوں کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ افغانستان میں بھی پہلے امریکی سفیر کارنیلیئس رینگرٹ (Cornelius Rangert) نے اپنا عہدہ سنبھال لیا تھا اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ یہ ملک بھی جنگ کے بعد مجوزہ فوجی گٹھ جوڑ میں شامل ہو جائے گا۔

قائداعظم کا دورۂ بلوچستان اور صوبائی حقوق کے لئے مسلم لیگ کی جدوجہد 1943-44ء

جنوری 1943ء میں نازی جرمنی نے سٹالن گراڈ میں سخت ہزیمت اٹھائی اور پھر فوراً ہی اس کی سوویت یونین سے پسپائی شروع ہوگئی تو برصغیر میں اتحادیوں کی فتح کے پیشگی نقارے بجنے لگے۔ اس صورت حال کے پیش نظر قائداعظم محمد علی جناح اور ان کی مسلم لیگ نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ مارچ کے اوائل میں سندھ اسمبلی نے جی۔ ایم سید کی پیش کردہ قرارداد پاکستان منظور کی۔ 2/اپریل کو پشاور میں سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے لئے صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کا پیغام یہ تھا کہ سرحد کے مسلم طلباء اپنے آپ کو منظم کر کے دراصل پاکستان کی سرحدوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ 6/اپریل کو جناح نے دہلی میں امریکی صدر روز ویلٹ کے نمائندہ ولیم فلپس (William Phillips) سے ملاقات کی۔ 5/مئی کو صوبہ سرحد میں سردار اورنگ زیب خان کی وزارت بنی جس میں تین مسلم لیگی وزراء شامل تھے۔ مئی کے اواخر میں جناح کی طبیعت ناساز ہوگئی تو تقریباً ایک ماہ تک ان کی سیاسی سرگرمیاں معطل رہیں۔ جون کے آخری ہفتے میں ان کی صحت کچھ بہتر ہوئی تو وہ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ 26/جون کو بغرض آرام کوئٹہ پہنچے۔

5/جولائی 1943ء کو کوئٹہ میں بلوچستان مسلم لیگ کی سہ روزہ کانفرنس ہوئی تو جناح

نے اپنی افتتاحی تقریر میں بلوچستان کے لئے مکمل صوبائی درجے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم نے بلوچستان کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہم نے 1927ء میں جو چودہ نکات مرتب کئے تھے ان میں ایک نکتہ یہ تھا کہ بلوچستان میں وہی آئین دیا جائے جو دوسرے صوبوں میں رائج ہے۔ لیکن تم لوگوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ہندوستان اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے تمہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم محض بیرونی امداد سے اپنے نصب العین کے پورا ہونے کی امید نہیں کر سکتے۔ بنیادیں یہاں موجود ہیں۔ ان پر عمارت کی تعمیر کرنا تمہارا کام ہے۔ سہل انگاری کو ترک کرو، گہری نیند سے بیدار ہو جاؤ اور اپنی قوم کے ساتھ ایک ہی صف میں قدم بڑھاؤ۔ قاضی عیسیٰ نے بلوچستانی عوام کو ابھارنے کے لئے انتہائی کوشش کی ہے...... اب سیاسی شعور اور خود انحصاری کی علامتیں نظر آنے لگی ہیں۔ لیگ تمہارے صوبے میں مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی ہے...... لہٰذا دوسرے صوبوں کے ساتھ تیار ہو جاؤ۔ جناح نے حاضرین کو نصیحت کی کو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر باہمی رقابتوں اور گروہی مفادات واختلافات سے بالاتر ہو جائیں۔ انہوں نے کہا ''اگر تم ایسا کرو گے تو بلوچستان لازمی طور پر ترقی کرے گا اور ہندوستان میں باعزت مقام حاصل کر لے گا۔ یہاں جاگیرداری نظام پوری قوت سے رائج ہے۔ میں نوابوں سے کہتا ہوں کہ دنیا بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور ہندوستان بھی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ تمہیں اس زمانے پر غور کرنا چاہیے جس میں تم زندگی بسر کر رہے ہو۔ موجودہ اور مستقبل کے واقعات پر غور کرو، اپنی زندگی کی علامتیں ظاہر کرو۔ ہم تم سے یہ کہتے ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرو کیونکہ تم فطرتی قائدین کی پوزیشن میں ہو۔ اپنی قوم اور اپنے عوام کے بارے میں اپنے فرض کا احساس کرو۔'' جناح نے اپنی تقریر میں مقامی انتظامیہ پر سخت تنقید کی اور کہا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ یہاں کے عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں اصلاحات دی جائیں۔ موجودہ انتظامیہ تعلیمی شعبے میں مجرمانہ غفلت کی مرتکب ہوئی ہے۔ بلوچستان میں کوئی تمدنی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اس علاقے کو لوکل سیلف گورنمنٹ نہیں دی گئی۔ میں اس سلسلے میں مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے روبرو مکمل رپورٹ پیش کروں گا۔'' انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں اقلیتوں کو یقین دلایا کہ پاکستان میں ان سے منصفانہ سلوک ہو گا...... انہوں نے مصر کی مثال دی اور کہا کہ ''وہاں کی پانچ فیصد اقلیت کو انتظامیہ میں تیس فیصد حصہ دیا گیا ہے۔'' جناح کی اس تقریر کے بعد صوبائی لیگ کانفرنس نے ایک قرارداد میں حکومت

ہند سے مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں اور اسے ایک صوبہ کا درجہ دیا جائے۔ اس قرارداد کے حق میں جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں قاضی محمد عیسیٰ، میر جان علی اور یحییٰ بختیار شامل تھے۔[17]

6 ر جولائی کو قائد اعظم محمد علی جناح نے بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو خطاب کرتے ہوئے اس پر بڑے دکھ کا اظہار کیا کہ بلوچستانی عوام نے صدیوں سے کوئی ترقی نہیں کی۔ انہوں نے کہا'' تمہاری سرزمین کی ایک تاریخ ہے۔ تم بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہو۔ لیکن اس کے باوجود تم کئی صدیوں سے ایک طرح کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ تمہیں اس میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ تمہارے گردونواح میں کیا ہو رہا ہے۔ تم اپنی ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے رہے ......ایک ایسی دنیا جس کا بقیہ ساری دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ صدیوں پہلے کی بات ہے اور اب بھی اگر تم بلوچستان کے ماضی پر نظر ڈالو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تم نے کوئی حقیقی ترقی نہیں کی۔ میں وہی لباس اور وہی بے عملی دیکھ رہا ہوں۔'' جناح نے کہا کہ تعلیمی لحاظ سے تم ہر صوبہ سے پیچھے ہو۔ معاشی لحاظ سے یہاں غربت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ تجارت کے شعبے میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ بلوچستان میں انسان اپنی سہل انگاری اور غفلت کے باعث ناکام ہو گیا ہے۔ یہ ملک اتنا وسیع اور زرخیز ہے۔ یہاں بے شمار باغات ہیں اور بے بہا معدنیات ہیں۔ یہاں پانی کی کمی نہیں ہے۔ اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ تمہیں پتہ نہیں کہ پگھلی ہوئی برف کے پانی کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ صد حیف کہ تم نے کسی چیز سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن اب جبکہ تم میں بیداری کے کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ زمین تمہارے لئے ہے۔ نوجوانو! اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ اپنے عوام کی قومی زندگی کی تعمیر کرو۔ ان کا تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی معیار بلند کرو۔ جب تک تم تعلیم حاصل کر رہے ہو، سیاسیات میں حصہ مت لو۔ اپنی پوری توجہ تعلیم پر صرف کرو۔ یہ تمہارا اولین فرض ہے جو تمہارے والدین اور تمہاری قوم کی طرف سے تم پر عائد ہے۔ اگر تم اپنی تعلیم کے دوران موجودہ حالات کا مطالعہ کرو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہندوستان میں مختلف قوتوں اور تحریکوں پر نظر رکھو اور آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی اور اس کے پروگرام کا مطالعہ کرو۔ بلوچستان ایک غیر تراشیدہ ہیرا ہے، جب اس کی مناسب تراش ہوئی تو مسلم انڈیا میں اس کی سجاوٹ عمدہ ہوگی۔[18]

10 رجولائی کو کوئٹہ کی عید گاہ میں بلوچستان کی مسلم خواتین کا اجلاس ہوا جس میں مس فاطمہ جناح مہمان خصوصی تھیں۔ اس اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان کو فوری طور پر صوبائی خود مختاری دی جائے۔ 10 رجولائی کو قائداعظم محمد علی جناح نے سبی میں ایک استقبالیہ دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے بلوچستان کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ جب کبھی مجھے کسی نے بلوچستان کے بارے میں کچھ بتایا یا جب کبھی میں نے اس بدنصیب صوبے کے بارے میں کچھ پڑھا تو مجھے اس کی زبوں حالی پر بہت دکھ ہوا۔ 1937ء میں جب مسلم لیگ بحال ہوئی تھی تو ہم نے تہیہ کیا تھا کہ بلوچستان کے لئے کچھ کریں گے لیکن ہم 1940ء تک بلوچستان مسلم لیگ کی تشکیل نہ کر سکے۔ جب سے بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی ہے، ہم نے اس سے مسلسل رابطہ قائم کئے رکھا ہے اور اب نتیجہ آپ سب کے سامنے ہے۔ آج بلوچستان کی آواز نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ سارے غیر ملکی ریڈیو تمہاری اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں اور تم اب ساری دنیا میں متعارف ہو گئے ہو۔ اگر بلوچستان کے سارے لوگ مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں تو پاکستان کے حصول میں دیر نہیں لگے گی۔

11 رجولائی کو قائداعظم قلات چلے گئے جہاں وہ تین چار دن تک خان قلات کے مہمان رہنے کے بعد بغرض آرام قلات چلے گئے جہاں ایجنٹ گورنر جنرل نے دو دن تک ان کی میزبانی کی۔ 19 رجولائی کو انہوں نے کوئٹہ واپس آ کر ایک بیان میں بتایا کہ ”میں نے ایجنٹ گورنر جنرل کی توجہ بلوچستان کے مسلمانوں کے مطالبات کی طرف مبذول کرائی ہے۔ ایجنٹ گورنر جنرل سر اوبرے میٹکاف نے مختلف معاملات کے بارے میں بڑے ہمدردانہ رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اور حکومت ہند ان معاملات پر پوری طرح غور کریں گے۔“
20 رجولائی کو کوئٹہ کی انجمن اسلامیہ نے صدر مسلم لیگ کے اعزاز میں دعوت دی تو اس موقع پر انہوں نے کہا کہ ”مجھ سے جب تم لوگ اپنی شکایات، مشکلات اور مطالبات کا بار بار ذکر کرتے ہو تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تم بیدار ہو گئے ہو، اب تمہیں اپنی حالت زار کا احساس ہو گیا ہے اور اب تمہیں اپنی کمیوں اور ضرورتوں کا بھی پتہ چل گیا ہے...... مسلم لیگ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور معاشی ترقی کے لئے کوشاں ہے اور ہم نے اس مقصد کے لئے جامع پروگرام مرتب کیا ہے۔ تم اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھلا دو، لیگ کے پرچم

تلے جمع ہو جاؤ اور اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے پروگرام مرتب کرو۔ میں نے ایجنٹ گورنر جنرل کو تمہاری شکایات اور تمہارے مطالبات سے آگاہ کیا ہے۔ اگرچہ اس نے ان پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن اس سلسلے میں قطعی اختیار گورنر جنرل کو ہی حاصل ہے۔ میں بلوچستان کے عوام کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کے نصب العین کی تکمیل میں ان کی مدد کروں گا۔ [19]

لیکن جب 6راگست کو دہلی میں مرکزی اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو قائداعظم جناح بلوچستانی عوام سے کئے گئے وعدے پر فوری طور پر عمل نہ کر سکے۔ حالانکہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے اس دن بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے قرارداد پیش کرنا تھی۔ قائداعظم کی جانب سے اپنا وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی کوئٹہ سے بمبئی واپسی پر ایک خاکسار نے ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا تھا اور وہ اس بنا پر اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ تاہم 7راگست کو اورینٹ پریس نے کوئٹہ سے یہ خبر دی کہ ''بلوچستان مسلم لیگ نے اپنی جولائی کی سہ روزہ کانفرنس میں جو پانچ مطالبات کئے تھے، ان میں سے تین مطالبات کے بارے میں حکومت کے فیصلے کا جلدی ہی اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ تین مطالبے یہ ہیں (1) کوئٹہ میں موجودہ نامزد میونسپلٹی کی جگہ منتخب میونسپل کمیٹی قائم کی جائے۔ (2) سنڈیمن ہائر سیکنڈری سکول کو ڈگری کالج کا درجہ دیا جائے۔'' اور (3) عوام کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک زوردار مہم شروع کی جائے''۔ لیکن کئی ماہ گزر گئے، حکومت کی طرف سے اس فیصلے کا کوئی اعلان نہیں ہوا۔ اس صورت حال میں بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں بلوچستانی عوام کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی پسماندگی کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا گیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت نے اس پمفلٹ کا نوٹس لیا اور مرکزی اسمبلی میں لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نوابزادہ لیاقت علی خان نے مارچ 1944ء میں اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران اس مضمون کی قرارداد پیش کی کہ گورنر جنرل کو فوری طور پر ایک کمیٹی مقرر کرنی چاہیے جو ایسے اقدامات کی سفارش کرے جن کے تحت برطانوی بلوچستان کے عوام کے مقامی انتظامیہ کے ساتھ ایسے ہی روابط قائم کئے جائیں۔ جیسے کہ برطانوی ہند کے دوسرے صوبوں میں قائم ہیں۔ اس مجوزہ کمیٹی کے ارکان کی اکثریت مرکزی اسمبلی کے منتخب ارکان پر مشتمل ہونی چاہیے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنی اس قرارداد کے حق میں تقریر کرتے ہوئے بلوچستانی عوام کی بدحالی کا بڑے دردناک الفاظ میں ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ

''اگرچہ انگریزوں کو ساٹھ ستر سال ہوئے کہ انہوں نے بلوچستان پر قبضہ کیا ہے لیکن آج تک وہاں ابتدائی اصلاحات تک نافذ نہیں ہوئیں۔ وہاں ڈسٹرکٹ بورڈ نہیں ہیں اور نہ ہی لوگ یہ جانتے ہیں کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کیا ہوتے ہیں۔ کوئٹہ شہر کی آبادی پینتیس ہزار افراد پر مشتمل ہے اور چھاؤنی کے باشندوں کو ملا کر یہ آبادی ساٹھ ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ اتنی آبادی کے شہر کو اپنی منتخب کردہ میونسپل کمیٹی تک حاصل نہیں ہے۔ یہی حال دوسرے شہری حقوق کا ہے۔'' اس نے مزید کہا کہ 1935ء سے کوئٹہ میں سول جوڈیشنل عدالتیں قائم ہیں اور میری اطلاع کے مطابق ان عدالتوں کے افسران، جو کنگ جارج ششم قیصر ہند کے نمائندوں کی حیثیت سے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں، خود قانون سے واقف نہیں ہیں۔ اس صوبے کے سب سے بڑے جج کی سروس کے خانۂ قابلیت میں ''نامعلوم'' لکھا ہوا ہے۔ جرگہ سسٹم کے متعلق لیاقت علی خان نے کہا کہ ''جرگہ کے ممبر نامزد کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ان پڑھ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے اور فیصلوں پر اپنا انگوٹھا لگاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اچھی شہرت کے مالک نہیں ہوتے۔ جرگہ سسٹم کے تحت ایسے لوگ سزائے موت تک دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔'' سیکرٹری خارجہ سر اولف کیرو نے اس مرحلہ پر مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ جرگہ کے ممبر صرف سولہ سال تک سزا کا فیصلہ دے سکتے ہیں۔ موت نہیں۔ جس پر لیاقت علی نے کہا ''یہ اس سے بھی بدتر ہے۔'' اس نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ بلوچستان میں خواندگی کا اوسط 1.6 فیصد ہے۔ حالانکہ دوسرے صوبوں میں کم از کم اوسط 4.1 فیصد ہے۔ کورگ جیسے علاقے میں یہ اوسط 7.5 فیصد ہے۔'' لیاقت علی خان کی یہ قرارداد 3 / مارچ کو منظور کر لی گئی مگر بلوچستانی عوام کے لئے اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

مسلم رہنماؤں کا سوویت یونین کے بارے میں معاندانہ رویہ

کئی ماہ تک بلوچستان کی سیاسی فضا میں قبرستان کی سی خاموشی طاری رہی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت پہلے کانگرسی لیڈروں اور انگریزوں سے گفت وشنید اور خط و کتابت میں مصروف رہی جبکہ بین الاقوامی حالات برطانیہ کے حق میں جا رہے تھے۔ نازی جرمنی اور جاپانیوں کی ہر محاذ پر پسپائی ہو رہی تھی اور سیاسی مبصرین وثوق سے پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ 1945ء

میں وہ کسی وقت بھی ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن جب اکتوبر 1944ء میں سوویت یونین نے ایران کے روبرو ایک تجویز پیش کی کہ آذربائیجان میں تیل کی تلاش میں ایک مشترکہ آئل کمپنی قائم کی جائے تو اینگلو۔امریکی سامراج سوویت یونین کو اس قسم کی رعایت دینے کے سخت خلاف تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ایرانی تیل پر اس کی اجارہ داری قائم رہے۔ لہٰذا اس کی نظر میں بلوچستان کی فوجی اہمیت میں پھر ایک اضافہ ہو گیا۔ جبکہ ایرانی حکومت پر یہ دباؤ پڑنے لگا کہ وہ سوویت یونین سے اس قسم کا کوئی سودا نہ کرے۔ 8 نومبر 1944ء کو کلکتہ کے مسلم لیگی لیڈروں نے حکومت برطانیہ کی اس پالیسی کی تائید کی جبکہ پروفیسر عبدالرحیم کی زیرصدارت ایک جلسہ عام میں ایک قرارداد کے ذریعے سوویت یونین کے اس جابرانہ رویے پر غصہ کا اظہار کیا گیا جو وہ ایران میں تیل کی رعایات حاصل کرنے کیلئے کر رہا تھا۔ قرارداد میں اعلان کیا گیا کہ سوویت روس کا سرخ سامراج بھی مغرب کے سرمایہ دار ممالک کے سفید سامراج سے مختلف نہیں ہے۔ ایشیا کے عوام اور ساری رنگ دار نسلوں کو متحد ہو کر اپنی آزادی کا تحفظ کرنا چاہیے۔ ایک اور قرارداد میں اسلامی ممالک یعنی ایران، مصر، شام، سوڈان اور فلسطین سے ساری غیرملکی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا کیونکہ اس وقت تک نازی ازم کا خطرہ دور ہو چکا تھا اور ایک تیسری قرارداد میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا۔[20]

10 نومبر 1944ء کو یہ خبر چھپی کہ حکومت ایران نے مشترکہ آئل کمپنی کے قیام کے بارے میں سوویت یونین کی تجویز مسترد کر دی ہے اور وزیراعظم آقائے محمد سعید اور ان کی کابینہ نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس پر لاہور کے مسلم اخبار ایسٹرن ٹائمز نے پے در پے کئی اداریے اور مضامین شائع کئے جن میں سوویت یونین کو ایک سامراجی طاقت قرار دے کر اس خطرے کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ ایران میں تیل کی مراعات حاصل کرنے کے بعد پورے ایشیا پر غلبہ حاصل کر لے گا۔

باب: 3

دوسری عالمی جنگ کے بعد
بلوچستان کی نمائندگی اور سیاسی مستقبل کا سوال

عالمی جنگ کے خاتمہ پر کونسل آف سٹیٹ میں بلوچستان کی نمائندگی

1945ء کے اوائل میں جبکہ عالمی جنگ اتحادیوں کی فتح کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی، حکومت ہند کی کونسل آف سٹیٹ میں بلوچستان کی نمائندگی کے لئے نواب اسد اللہ خان رئیسانی کو نامزد کر دیا گیا۔ حالانکہ اس نواب کا جدید قسم کی جمہوری سیاسیات سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ یہ سرکار انگلیشیہ سے وظیفہ لے کر اپنے قبیلے کے عوام پر جبر واستبداد کرنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ ریاست قلات کا رہنے والا تھا اور بظاہر اس کی نامزدگی خان آف قلات کی سفارش پر ہوئی تھی اور اس سفارش کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جنگ کے دوران قبائلی علاقے میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے گراں قدر خدمات سر انجام دی تھیں۔[1] قاضی عیسیٰ نواب رئیسانی کی اس نامزدگی پر بہت برہم ہوا کیونکہ وہ اور صوبائی مسلم لیگ کے دوسرے لیڈر 1940ء کے بعد سے مسلسل یہ کوشش کرتے رہے تھے کہ بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں مگر جب مرکز کی سٹیٹ کونسل میں بلوچستان کی نمائندگی کا سوال ہوا تو قرعۂ فال ریاست قلات کے اس نواب پر پڑا۔

لاہور کے اخبار ایسٹرن ٹائمز میں ایک مسلم خاتون سعیدہ نے نواب رئیسانی کی اس نامزدگی کے خلاف ایک زوردار احتجاجی مضمون لکھا جس کے آخر میں اس نے بتایا کہ کوئٹہ میں بعض پٹھان نوجوان یہ کہتے ہیں کہ نواب رئیسانی کو یہ اعزاز اس لئے ملا ہے کہ اس نے جنگی چندے کے لئے منعقد رقص کی ایک تقریب میں ایجنٹ گورنر جنرل او برے میٹکاف کی لیڈی سے کتے کی ایک

مشکوک نسل کا کتورا ایک سو روپے میں خریدا تھا۔[2] لیکن سعیدہ کی یہ رائے اس کے اپنے سیاسی شعور کی پسماندگی کا مظہر تھی۔ نواب رئیسانی کو سٹیٹ کونسل میں نامزد کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس نے ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں خوشامدانہ استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور نہ ہی یہ وجہ تھی کہ اس نے لیڈی میٹکاف سے ایک سو روپے میں ایک مشکوک نسل کا کتورا خریدا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ نازی جرمنی کے خلاف سرخ فوج کی شاندار فتوحات کے باعث ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں سوویت یونین کا وقار بہت بلند ہو گیا تھا۔ اکتوبر 1944ء سے امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کے درمیان ایرانی تیل کے لئے رسہ کشی شروع ہو چکی تھی اور اس بنا پر برطانوی سامراج نے مسلم انڈیا کے نمائندوں اور اخبارات کی جانب سے سرخ سامراج کے خطرے کے خلاف زبردست پروپیگنڈا شروع کروا دیا تھا۔ کلکتہ کے پروفیسر عبدالرحیم کی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاالدین کی رائے یہ تھی کہ ''جنگ کے بعد ایشیا میں روس کے اثر میں لازمی طور پر اضافہ ہوگا اور سرمایہ دار اس رجحان کا سدباب نہیں کر سکیں گے۔''[3] اور امریکی کانگرس کی ایک خاتون رکن کلیئر لیوس (Claire Levis) کی نیویارک ریڈیو پر تقریر یہ تھی کہ ہندوستان کے دل برداشتہ دانشور انقلاب کی تکنیک میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے طاقتور ہمسایہ سوویت یونین کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں مطلوبہ مشورہ مل رہا ہے۔[4]

ایسے حالات میں برطانوی سامراج کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بلوچستان کے سرحدی علاقے میں ایک چھوٹے سے شہری درمیانہ طبقہ کی حمایت حاصل کرنے کی بجائے قدامت پسند اور دقیانوسی سرداروں کی حوصلہ افزائی کرے۔ ان سرداروں نے جنگ کے دوران اپنی وفاداری کا پورا ثبوت دیا تھا، اس لئے جنگ کے بعد کے حالات میں بھی ان پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ نواب رئیسانی ریاست قلات کے سرداران قبائل کا سردار تھا۔ اس کی قلات اور کوئٹہ میں بڑی جائیداد تھی اور سرکاری تقریبات میں اسے خان آف قلات کے بعد دوسرا درجہ دیا جاتا تھا۔ علاوہ بریں اس کی سفارش کرنے والے خان آف قلات کی روس دشمنی مسلمہ تھی کیونکہ وہ چاغی لیویز فورس میں ملازمت کے دوران برطانیہ کے لئے روس کے خلاف جاسوسی کے فرائض بھی سرانجام دیتا رہا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اسلام کا عظیم علمبردار ظاہر کرتا تھا، اس لئے انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ اور اس کے حلیف قبائلی سردار مذہب کا نام لے کر اس علاقے میں روس کے اثر کا سدباب

کر سکیں گے۔قبل ازیں وہ جنوری 1935ء میں قبائلی سرداروں سے فرمانبرداری کا عہد لے چکا تھا اور پھر اس نے اپنی نام نہاد دو ایوانی مقننہ میں بھی قبائلی سرداروں کو پوری نمائندگی دی تھی۔ مزید براں اس نے اپنی سٹیٹ کونسل اور قلات نیشنل پارٹی سے اس مضمون کا خراج تحسین بھی حاصل کر لیا تھا کہ ''پچھلے چند سالوں میں اعلیٰ حضرت میر احمد یار خان، خان آف قلات نے جس تدبر اور دانشمندی سے قوم کی کشتی کی ناخدائی کی اور جن پر خطر حالات اور مشکلات میں اسے آگے بڑھایا اور قوم کی تعلیمی اور اقتصادی، معاشرتی اور سماجی ترقی کے لئے جو سکیمیں کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائیں، ان سے بلوچستان میں ان کی نیک نامی اور شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کی ذات پر صرف بلوچستان اور سندھ کے بلوچ ہی نہیں، بلکہ ایران اور افغانستان کے بلوچ بھی فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ بلوچستان اور بلوچ قوم کے لئے اعلیٰ حضرت میر احمد یار خان، خان آف قلات کی ان قابل قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر بلوچ قوم کی طرف سے ان کو ''خان معظم'' کا لقب پیش کیا جاتا ہے۔''[5] میر احمد یار خان نے اپنی دونوں کتابوں میں اس لقب کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں لکھا کہ اس کی سٹیٹ کونسل اور قلات نیشنل پارٹی نے اسے یہ لقب کون سے سن میں اور کس تاریخ کو دیا تھا۔ تاہم قیاس یہی ہے کہ یہ اس زمانے میں دیا گیا تھا جبکہ عالمی جنگ میں اتحادیوں کی فتح یا تو یقینی ہو چکی تھی یا یہ فتح مکمل ہو چکی تھی۔ تاہم اس نے یہ لکھا ہے کہ ''میں نے یہ لقب قبول کر لیا اور پھر یہ حکومت قلات کے سرکاری کاغذات اور خط و کتابت میں درج کیا جانے لگا۔''

قائداعظم کا دورۂ بلوچستان اور خان آف قلات کی جانب سے آؤ بھگت

اپریل 1945ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کی طبیعت ناساز رہنے لگی تو انہوں نے بمبئی سے خان آف قلات کے نام ایک خط میں یہ لکھا کہ ''میں بغرض آرام کوئٹہ آنا چاہتا ہوں۔ اگر تم وہاں اپنی کوٹھی میں میری رہائش کا بندوبست کر دو تو میں ممنون ہوں گا۔ مجھے فرصت ملی تو میں چند دن کے لئے قلات بھی آؤں گا۔'' لیکن قائداعظم اپنے پروگرام کے مطابق فوری طور پر کوئٹہ نہ جا سکے کیونکہ مئی 1945ء میں یورپ میں جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں کانگرسی لیڈروں کو رہا کر دیا گیا تھا اور جون میں وائسرائے ویول نے مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کے لئے شملہ کانفرنس شروع کر دی تھی۔ یہ کانفرنس جولائی کے وسط میں

ناکام ہوگئی تو قائداعظم جناح کو مزید تقریباً دو ماہ تک دہلی، بمبئی اور کراچی میں سیاسی سرگرمیوں سے فرصت نہ ملی۔ بالآخر 14 ستمبر کو وہ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ کوئٹہ پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر جو سینکڑوں لوگ ان کے استقبال کے لئے جمع تھے، ان میں ریاست قلات کا چیف سیکرٹری عبدالرؤف بھی شامل تھا۔ جب قائداعظم سٹیشن سے قلات ہاؤس پہنچے تو اس چیف سیکرٹری نے انہیں خان آف قلات کا ایک خط دیا جس میں انہیں مستونگ اور قلات میں چند دن آرام کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت نامے کی سیاسی بنیاد یہ تھی کہ دو ماہ قبل برطانیہ میں لیبر حکومت برسراقتدار آ چکی تھی اور وزیر اعظم ایٹلی نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بعد یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں 1945ء کے اواخر میں عام انتخابات ہوں گے۔ پھر ہندوستان میں ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی۔ اس اعلان سے پورے ہندوستان میں یہ تاثر پیدا ہوا تھا کہ اب برطانیہ زیادہ دیر تک برصغیر پر قابض نہیں رہ سکے گا اور اسے جلد ہی یہاں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ میر احمد یار خان آف قلات کا تاثر بھی یہی تھا۔ لہٰذا اس نے نہ صرف اپنی ریاست میں بلکہ پورے بلوچستان میں اپنی ایک آزاد وخود مختار سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا اور اس خواب کی تعبیر کے لئے اسے قائداعظم محمد علی جناح اور ان کی مسلم لیگ کی قومی اور سیاسی پشت پناہی کی ضرورت تھی۔ جولائی میں شملہ کانفرنس کے دوران قائداعظم جناح کی بے پناہ سیاسی قوت کا مظاہرہ ہو گیا تھا اور اس بنا پر سارے سیاسی حلقے یہ تسلیم کرنے لگے تھے کہ جناح کے اتفاق رائے کے بغیر ہندوستان کا کوئی آئینی مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ خان آف قلات اپنے شہنشاہی خواب کی تعبیر کے لئے ایسی طاقت ور شخصیت کی بہر قیمت حمایت حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف کوئٹہ میں بلکہ مستونگ اور قلات میں بھی تقریباً ایک ماہ تک قائداعظم کی میزبانی کی۔ اس دوران اس نے ''قائداعظم اور مس جناح کو پہلے چاندی اور پھر سونے میں تولا۔ دونوں کے وزن کے برابر چاندی اور دونوں کے وزن کے برابر سونا ان کی نذر کیا۔ اس زمانے میں ان کا وزن علی الترتیب ایک سو بارہ پونڈ اور ایک سو گیارہ پونڈ تھا۔ اس نے اس وزن کے برابر چاندی اور سونا انہیں پیش کرنے کے علاوہ ایک لاکھ روپے کی مالیت کا ہار مس جناح کو اس کے علاوہ پیش کیا۔ اس پر دونوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ بلوچی دستور ہے۔''[6] لیکن اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس طرح میں اپنے شہنشاہی خواب کی تعبیر کی قیمت ادا کر رہا ہوں۔

قائداعظم نے اپنے اس دورۂ بلوچستان کے دوران 24ر ستمبر کو کوئٹہ میں بلوچستان مسلم لیگ، کوئٹہ سٹی مسلم لیگ اور دوسرے تقریباً ایک سو عمائدین شہر کو خطاب کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ مسلم لیگ نے بلوچستانی عوام کی ترقی اور اس صوبہ کو برطانوی ہند کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دلانے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم نے اس شہر کے لئے ایک منتخب مونسپلٹی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اب مرکزی اسمبلی میں بلوچستان کا ایک نمائندہ ہے۔ اگرچہ یہ نمائندہ یہاں کے عوام کا منتخب نہیں ہے تاہم اس کی نامزدگی سے اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مرکزی اسمبلی میں بلوچستان کی نمائندگی ہونی چاہیے۔''[7] 8ر اکتوبر کو جناح نے مستونگ میں احمد یار خان ہائی سکول کے طلباء کے خطبۂ استقبالیہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا واحد حل ہے اور اس طریقے سے ہندوستان کے ہندو اور مسلمان باعزت اور آزادی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

17ر اکتوبر کو انہوں نے کوئٹہ میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ اب بلوچستان کے مسلمان اپنے اہم معاملات کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ''تمہاری انتظامیہ سیاسی اور نیم فوجی ہے۔ اس انتظامیہ کے ارکان عوام الناس کے اوصاف اور شہری حقوق کی قدر کرنے سے قاصر ہیں اور اس صوبہ کا نظم و نسق ایسے قواعد و ضوابط کے تحت چلایا جا رہا ہے جو ہر لحاظ سے اجنبی ہیں۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ ہماری کوشش سے حکومت پرانے نظام میں بعض تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ اب یہاں منتخب میونسپلٹی ہے۔ مرکزی اسمبلی میں ایک بلوچستانی نمائندہ ہے...... کانگرسی ایجنٹوں نے بلوچستان کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا۔ مرکزی اسمبلی میں کانگرس نے بلوچستان کے بارے میں کبھی لب کشائی نہیں کی۔ کانگرس ایک ہندو تنظیم ہے اس لئے اسے مسلم اکثریت کے صوبہ بلوچستان کے معاملے میں کیسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔''[8] 18ر اکتوبر کو انہوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو مشورہ دیا کہ سیاسی اور نیم فوجی انتظامیہ پر اس وقت تک زور ڈالتے رہیں جب تک کہ وہ ان کے مطالبات تسلیم نہیں کرتی۔ 20ر اکتوبر کو انہوں نے ایجنٹ گورنر جنرل سے ملاقات کر کے اس کی توجہ بلوچستانی مسلمانوں کے ان مطالبات کی طرف مبذول کرائی جو صوبہ مسلم لیگ وقتاً فوقتاً قراردادوں کے ذریعے کرتی رہی تھی اور پھر 22ر اکتوبر کو وہ واپس کراچی آ گئے۔

مجوزہ پاکستان میں جمہوری آئین کے بارے میں قائداعظم کا تاریخی انٹرویو

کراچی میں ایک دن قیام کرنے کے بعد جناح بمبئی پہنچے تو نہوں نے 10 رنومبر کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو ایک تاریخی انٹرویو دیا جس میں انہوں نے پاکستان کی سیاسی طور پر آزاد و خودمختار ریاست کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا نظریہ اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ قومی حکومت کے متوافق یونٹوں کو وہ ساری خودمختاری حاصل ہوگی جو کہ امریکہ، آسٹریلیا اور کینیڈا کے دستوروں میں موجود ہے۔ لیکن بعض اہم اختیارات مرکزی حکومت کے پاس رہیں گے۔ مثلاً مالیاتی نظام، قومی دفاع اور دوسری وفاقی ذمہ داریاں۔ انہوں نے کہا کہ ''ہر متوافق ریاست یا صوبہ کا اپنا قانون ساز ادارہ، ایگزیکٹو اور عدالتی نظام ہوگا اور حکومت کے یہ تینوں شعبے آئین کے تحت ایک دوسرے سے الگ ہوں گے۔'' قومی دفاع کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''...... یہ مت بھولو کہ ہندوستانی فوج کا پچپن فیصد سے زائد حصہ پنجابیوں پر مشتمل ہے اور ان میں بیشتر مسلمان ہیں۔'' عوامی بہبود کے شعبوں اور صنعتوں کی سماجی ملکیت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں جناح نے کہا کہ ''تم پوچھتے ہو کہ حکومت اس سلسلے میں کیا کرے گی ......میرا خیال ہے کہ جدید زمانے میں کلیدی صنعتوں کا کنٹرول اور انتظام ریاست کے پاس ہونا چاہیے۔ بعض عوامی بہبود کے شعبوں میں بھی اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب قانون سازی کرنے والے ہی دے سکتے ہیں کہ کونسی صنعت کلیدی ہے اور یوٹیلیٹی سروس کیا ہے۔'' جناح نے کہا کہ ''میں پاکستان میں یک جماعتی حکومت کی توقع نہیں کرتا۔ میں یک جماعتی اقتدار کی مخالفت کروں گا۔ مخالف پارٹی یا پارٹیاں کسی برسراقتدار پارٹی کی اصلاح کے لئے اچھی ہوتی ہیں۔''[9] اس انٹرویو کا مطلب صاف ظاہر تھا۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں 46-1945ء کے عام انتخابات سے تقریباً ایک ماہ قبل قائداعظم محمد علی جناح مجوزہ پاکستان کے متوافق یونٹوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینے کے حق میں تھے اور وہ پاکستان میں ایسا ہی جمہوری آئین رائج کرنا چاہتے تھے جیسا کہ امریکہ، آسٹریلیا اور کینیڈا میں رائج تھا۔ بالفاظ دیگر ان کا سیاسی نصب العین یہ تھا کہ ''مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک جدید جمہوری ریاست قائم کی جائے۔'' اور بلوچستان کے بارے میں ان کا پرزور مطالبہ یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے اس صوبہ کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیا جائے یعنی یہاں مکمل جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔

ایران میں روس۔ امریکہ آویزش اور مسلم لیگی رہنماؤں کا روس مخالف رویہ

جب قائداعظم محمد علی جناح نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو یہ انٹرویو دیا تھا، اس وقت ایران کے شمالی صوبہ آذربائیجان میں علیحدگی پسند عناصر نے مسلح بغاوت شروع کر دی تھی۔ تبریز اور تہران کے درمیان مواصلاتی رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور رائفلوں و مشین گنوں سے مسلح باغیوں نے صوبہ کے تین اہم شہروں میں متعین فوجی دستوں کو ان کے ہیڈ کوارٹرز سے الگ تھلگ کر دیا تھا اور تبریز میں سخت لڑائی ہو رہی تھی۔ برطانیہ اور امریکہ کے اخبارات اور سیاسی لیڈروں کا الزام یہ تھا کہ آذربائیجان میں یہ بغاوت سوویت یونین نے کروائی ہے کیونکہ حکومت ایران نے اسے تیل کی مراعات دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے مسلم اخبارات اور سیاسی لیڈروں کا بھی یہی مؤقف تھا۔ لاہور کے ایسٹرن ٹائمز کا 22 نومبر کو تبصرہ یہ تھا کہ ''سٹالن کے ماتحت سوویت روس اپنی اس پوزیشن سے منحرف ہو گیا ہے جو اس نے لینن کے ماتحت اختیار کی تھی ......اس وقت یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سوویت روس ترقی کر کے بالآخر ایک سامراجی ریاست بن جائے گا۔ ترکی اور ایران سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ پریشان کن ہیں۔ شمالی ایران ابھی تک روس کے قبضے میں ہے اور وہاں اس کا سونا اور اثر بدامنی پھیلانے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ آذربائیجان میں مسلح بغاوت جاری ہے اور روسی حکومت ایران کو اسے کچلنے کی اجازت نہیں دیتی۔'' ایسٹرن ٹائمز نے یہ ادارتی تبصرہ لندن سے موصول شدہ اس خبر کے پیش نظر کیا تھا کہ ''حکومت برطانیہ کو شمالی ایران میں بغاوت سے بڑی تشویش ہوئی ہے۔ لندن میں عام خیال یہ ہے کہ یہ بغاوت روس کی شہ پر ہوئی ہے کیونکہ وہ تہران کی موجودہ حکومت سے غیر مطمئن ہے۔ اگرچہ برطانیہ کے تیل کے مفادات زیادہ تر جنوبی ایران میں واقع ہیں تاہم برطانوی دفتر خارجہ کو خطرہ ہے کہ یہ بغاوت تہران تک پھیل جائے گی اور برطانیہ کے دشمن عناصر ملک کے کسی بھی علاقے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جبکہ اسی دن برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کا ایوان عام میں بیان یہ تھا کہ ایران سے برطانوی فوجوں کی واپسی شروع ہو چکی ہے۔''

ایسٹرن ٹائمز کی طرح بلوچستان کے مسلم لیگی لیڈر قاضی محمد عیسیٰ کو بھی لندن کی اس خبر سے بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے 24 نومبر کو دہلی سے ایک بیان میں سوویت یونین کی

اس بنا پر سخت مذمت کی کہ وہ ایران کے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ قاضی کو آذر بائیجان کے حالات کے پیش نظر یہ یقین ہو گیا تھا کہ سوویت یونین میں چھوٹی اور کمزور ریاستوں اور قوموں کو ہڑپ کرنے کی سامراجی اشتہا پیدا ہوگئی ہے۔ اس کی رائے تھی کہ ''روس مغرب میں اپنے حلقہ ہائے اثر میں توسیع کرنے کے بعد اب مشرق میں اپنا اثر بڑھا رہا ہے۔ اس نے صوبہ آذر بائیجان کے معاملات میں مداخلت کر کے ایران کے حقوق خودمختاری کے بارے میں جن ناپاک عزائم کا مظاہرہ کیا ہے اس پر ہر مسلمان برہم ہوا ہے۔ مسلم انڈیا کا روس سے مطالبہ یہ ہے کہ ایران کو ہاتھ مت لگاؤ۔''[10] قاضی عیسیٰ نے جب سوویت یونین کی آذر بائیجان میں مداخلت پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا تھا تو اس وقت اسے بظاہر اس حقیقت پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں برطانیہ نے مشرق وسطیٰ میں اپنی ایک نئی سلطنت قائم کر لی تھی اور وہ اس علاقے کے مسلم ممالک کے پٹھو بادشاہوں اور قوم فروش وزرائے اعظم کی امداد سے اپنی سامراجی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رکھنے کا عزم کئے ہوئے تھا۔ قاضی عیسیٰ کو متذکرہ بیان جاری کرتے وقت یہ احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی اس قسم کی بیان بازی اس کے اپنے صوبہ بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کے راستے میں حائل ہوگی اور برطانوی سامراج روسی سامراج کے خطرے کا الارم بجا کر یہاں اپنی نیم فوجی انتظامیہ کو برقرار رکھے گا۔

یکم دسمبر کو قائداعظم محمد علی جناح نے ایک بیان میں ایجنٹ گورنر جنرل کے اس بیان کی تردید کی کہ حکومت ہند نے مارچ 1944ء میں لیاقت علی خان کی قرارداد پر بحث کے دوران کسی کمیٹی کو اصلاحات تجویز کرنے کے لئے بلوچستان بھیجنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ جناح نے کہا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایجنٹ گورنر جنرل نے اسمبلی کی کارروائی کا مطالعہ نہیں کیا یا وہ فوجی ذہنیت کا حامل ہونے کی وجہ سے اس کارروائی کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ سیکرٹری خارجہ اولف کیرو نے صرف کمیٹی کی مجوزہ ہیئت کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ جنگ کے دوران یہ کمیٹی فوری طور پر اپنا کام شروع نہیں کر سکے گی۔ کیرو کی اس مخالفت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حکومت ہند بلوچستان کے لئے ریفارمز کمیٹی کے تقرر کے ہی خلاف تھی۔ جناح نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''اولف کیرو کی یقین دہانی کے باوجود ابھی تک کوئٹہ شہر میں منتخب میونسپلٹی وجود میں نہیں آئی اور مرکزی اسمبلی میں جو بلوچستانی نمائندہ نامزد کیا گیا ہے وہ تقریباً ان پڑھ ہے اور پارلیمانی کام کو

سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔اس کی کوالیفیکیشن یہ ہے کہ وہ ایک بڑا خان ہے لیکن ہم عوام کا نمائندہ چاہتے ہیں کوئی آرائشی شخص نہیں چاہتے۔''[11]

دراصل ایجنٹ گورنر جنرل کی جانب سے بلوچستان میں ریفارمز کمیٹی بھیجنے کی اتنی دیر کے بعد مخالفت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس نے مرکزی اسمبلی کی کاروائی کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا یا وہ فوجی ذہنیت کا حامل ہونے کی وجہ سے اس کاروائی کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔اس کی مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اکتوبر 1944ء میں ایران کے شمالی صوبہ آذربائیجان میں علیحدگی پسندوں نے جو بغاوت کی تھی وہ نومبر 1945ء میں اس حد تک کامیاب ہوگئی تھی کہ وہاں باغیوں کی ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنی ایک حکومت قائم کر لی تھی۔ یہ باغی حکومت ایک منتخب صدر، ایک کابینہ اور ایک پارلیمنٹ پر مشتمل تھی اور مغربی اخبارات اور لیڈروں کا پروپیگنڈا یہ تھا کہ سوویت یونین نے یہ سب کچھ آذربائیجان کو ہڑپ کرنے کے لئے کروایا ہے۔اگر سوویت یونین کی اس توسیع پسندی کا مؤثر طریقے سے سدباب نہ کیا گیا تو وہ بہت جلد ایران اور ترکی کے علاوہ ملحقہ عرب ممالک کو بھی کھا جائے گا جہاں کے تیل پر مغربی ممالک کا سارا صنعتی ڈھانچہ قائم ہے۔عراق کا سابق وزیر اعظم نوری السعید پاشا مغربی ممالک کے اس نقطۂ نگاہ سے متفق تھا چنانچہ اس نے یہ تحریک شروع کی تھی کہ مشرق وسطیٰ میں اشتراکیت کے سدباب کے لئے ترکی، مصر، شام، اردن، یمن، ایران اور افغانستان کا کوئی متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ چونکہ اس صورتحال میں ایران سے ملحقہ بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کا نفاذ برطانوی سامراج کے مفادات کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اس لئے ایجنٹ گورنر جنرل کرنل۔ڈبلیو۔آر۔ہے (W.R.Hay) کی جانب سے ریفارمز کمیٹی کی مخالفت ضروری ہوگئی تھی۔

صوبہ بمبئی سے مرکزی اسمبلی کے نومنتخب مسلم لیگی رکن احمد۔ ای۔ایچ جعفر بھی بلوچستان کی بجائے آذربائیجان کے بارے میں زیادہ فکرمند تھا۔ چنانچہ اس نے مرکزی اسمبلی کے آئندہ بجٹ سیشن میں ایک تحریک التوا پیش کرنے کا نوٹس دیا تھا جس میں اسمبلی کی جانب سے بالعموم اور ہندوستان کے اس کردار کے مسلمانوں کی جانب سے بالخصوص حکومت ہند کے خلاف اس بنا پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس نے سوویت یونین کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جس نے ہمسایہ مملکت ایران کے خلاف کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔تحریک میں مزید کہا گیا تھا

کہ سوویت یونین نے ایران کی خودمختاری، سالمیت اور آزادی کے خلاف جو فوجی نوعیت کی کاروائی کی ہے اس سے اس ہمسایہ مملکت کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔"[12]

لاہور کے مسلم اخبار ایسٹرن ٹائمز کو احمد جعفر سے بھی زیادہ تشویش لاحق تھی۔ یہ اخبار ''ذمہ دار عرب حلقوں'' کی اس رائے سے متفق تھا کہ ایران اور ترکی میں روسی سازشیں ایک بڑی گہری پالیسی کا نتیجہ ہیں اور بہت جلد سارا عالم عرب ان سازشوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اس اخبار کا مزید تبصرہ یہ تھا کہ روس نے ترکی اور ایران کے خلاف جو جارحانہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی وجہ سے مسلم دنیا میں وسیع پیمانے پر بے اطمینانی پھیل گئی ہے اور اگر اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا تو سوویت یونین کا انگلستان کے ساتھ تصادم ناگزیر ہے کیونکہ انگلستان اپنے سامراجی مفادات کی خاطر ایران، عراق کے تیل کے چشموں کے نزدیک روسی فوجوں کی موجودگی برداشت نہیں کرے گا۔ روس میں زارشاہی کی بربادی کے بیس سال بعد بالشویکوں نے روسی سامراجیت کو بحال کر دیا ہے اور وہ ایران کے دولت مند صوبہ آذربائیجان پر اپنی لالچی نگاہیں جمائے ہوئے ہیں۔ جس قوم نے تین کروڑ مسلمانوں کو غلام بنا رکھا ہے، اسے ایرانی آذربائیجان کے عوام کے حقوق کی وکالت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"[13] تاہم لندن کے اخبار ''ویسٹرن سیل'' کو صرف مسلم دنیا کی ہی فکر نہیں تھی بلکہ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ''سوویت یونین تہران میں اپنی پسند کی حکومت قائم کر کے بلا روک ٹوک بحر ہند تک رسائی حاصل کر لے گا۔'' لہٰذا برطانوی سامراج کی طرف سے بلوچستان میں نیم فوجی حکومت کا خاتمہ کر کے وہاں جمہوری اصلاحات نافذ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

روس کے گرد اسلام کے نام پر اینگلو۔امریکی سامراج کا حصار اور بلوچستان کا پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ

ان دنوں برطانیہ کا ایک پارلیمانی وفد ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا اور میر احمد یار خان آف قلات نے اپنے شہنشاہی خواب کی تعبیر کے لئے دہلی میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ 8رفروری کو جب یہ پارلیمانی وفد دہلی میں تھا تو قائداعظم محمد علی جناح نے میر احمد یار خان آف قلات کا اس سے تعارف کرانے کے لئے ایک دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں وائسرائے کی

ایگزیکٹوکونسل کے ارکان کے علاوہ بہت سے دوسرے عمائدین نے شرکت کی۔ میر احمد یار خان لکھتا ہے کہ ''قائداعظم نے اپنی پوری زندگی میں کسی کے اعزاز میں اتنی بڑی دعوت کا اہتمام نہیں کیا تھا۔اس تقریب میں پانچ سومہمان مدعو تھے۔ میں نے ڈیلی گیشن کے ارکان سے اس دعوت میں کھل کر تبادلۂ خیال کیا۔فیصلہ یہ ہوا کہ میں چند مسلم ماہرین قانون کی مدد سے ریاست قلات کی تاریخی حیثیت، تاریخی پس منظر، واقعات اور برطانیہ سے معاہدات پر مشتمل مواد کی روشنی میں اپنا کیس تیار کروں جسے قائداعظم بطور ریاست کے آئینی مشیر حکومت برطانیہ کو پیش کریں۔ میں نے قلات کے دعاوی اور تاریخی پوزیشن کے متعلق مسٹر آئی۔ آئی۔ چندریگر، سر سلطان احمد، سردار بی۔ کے۔ مینن اور مسٹر والٹن مانگٹن سے اپنا کیس تیار کرا کر قائداعظم کے حوالے کر دیا۔''[14]

اس دعوت کے ہفتہ عشرہ بعد 19 رفروری کو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے لندن میں اعلان کیا کہ ایک وزارتی مشن ہندوستان جا کر برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کرے گا تا کہ ہندوستان کے نئے آئین کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے ہو، دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں آئے اور وائسرائے کی ایک ایسی ایگزیکٹوکونسل تشکیل کی جائے جسے ہندوستان کی بڑی سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہو۔ وزیر ہند کے اس اعلان کے پس منظر میں اس مضمون کی بے شمار رپورٹیں تھیں کہ سوویت یونین کی فوجیں بدستور ایران میں موجود ہیں اور وہ برطانیہ کو مشرق وسطیٰ سے نکالنے کے عزائم رکھتا ہے۔ برطانیہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں روس کے اثر ورسوخ کی توسیع کے سدباب کے لئے عراق، سعودی عرب، شام، مصر اور اردن وغیرہ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ بنایا جائے اور عراق کا نوری السعید پاشا اس مقصد کے لئے برطانیہ کی مدد کر رہا ہے۔ برطانیہ کی مزید کوشش یہ تھی کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں مقامی بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے کوئی مفاہمت ہو جائے تا کہ اس وسیع وعریض برصغیر کے بے پناہ وسائل حسب سابق اس کے سامراجی مفادات کے فروغ و تحفظ کے لئے مہیا رہیں۔

بظاہر حکومت ہند نے اس کوشش کے ایک حصہ کے طور پر فروری کے آخری ہفتے میں شمالی ہندوستان کے سرحدی صوبہ بلوچستان کی معاشی و تعلیمی ترقی کے لئے ایک پانچ سالہ منصوبہ بنانے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے کے بارے میں نئی دہلی سے جو خبر جاری ہوئی اس میں بتایا گیا تھا کہ

''اس ترقیاتی منصوبے پر آئندہ مالی سال سے عمل شروع ہوگا اور اس مقصد کے لئے تین کروڑ روپے پہلے ہی مختص کر دیئے گئے ہیں۔ اس منصوبے کی ایک اہم مد یہ ہے کہ کراچی سے براستہ قلات کوئٹہ تک ایک ریلوے لائن تعمیر کی جائے گی۔''[15] ترقیاتی پروگرام میں اس مد کا مطلب یہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے ایشیائی ممالک میں سوویت یونین کے روز افزوں سیاسی و نظریاتی اثر و رسوخ کی بنا پر برطانیہ کی نظر میں بلوچستان کی فوجی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا اور اسے ایران، افغانستان کی سرحدوں کے نزدیک اپنے فوجی مراکز میں فوجی ساز و سامان اور دوسری اشیاء کی سپلائی کے لئے ایک اور ریلوائی رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

24/مارچ کو وزارتی مشن کے دہلی پہنچنے سے تین چار دن پہلے امریکہ ایران میں روسی افواج کی موجودگی کے خلاف ماسکو سے احتجاج کر چکا تھا۔ انقرہ میں ترکی اور عراق کے درمیان گٹھ جوڑ کی بات چیت شروع ہو چکی تھی اور برطانوی اخبارات میں یہ پروپیگنڈا جاری تھا کہ اگر کسی بڑی طاقت نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو ایران اور ترکی کی آزادی شدید خطرے میں پڑ جائے گی۔ ''مسلمان اس کرۂ ارض پر سب سے زیادہ مربوط مذہبی فرقہ ہیں۔ جہاں تک مسلم برادری کا تعلق ہے اسلام کسی قسم کی سرحدوں اور اعلیٰ وفاداریوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ مزید براں بعض مخصوص وجوہ کی بنا پر بھی ہر جگہ مسلمان اس امر کا بنظر غائر جائزہ لے رہے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ ترکی ایک مسلم ملک ہے اور ایران بھی اسلام کا علمبردار ہے۔ انہیں نقشے پر صاف نظر آ رہا ہے کہ ہندوستان ترکی اور ایران کے کس قدر نزدیک ہے...... اگر ہندوستان سوویت یونین کا فرمانبردار بن گیا تو ایران اور ترکی کی جلد ہی باری آ جائے گی اور اگر ترکی اور ایران زیر ہو گئے تو پورا ایشیا سوویت یونین کے زیر نگیں ہوگا۔''[16] یہ مضمون لندن کے اخبار ڈیلی سکیچ میں چھپا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ ترکی اور مصر سے لے کر ایران و افغانستان تک سارے مسلمانوں کو وطنیت سے بالاتر ہو کر برطانوی سامراج کے مفاد میں سوویت یونین کے خلاف متحدہ محاذ بنانا چاہیے۔ گویا برطانوی سامراج ان مسلم ممالک میں اپنے کٹھ پتلی حکمرانوں اور ان کے وظیفہ خوار دانشوروں اور ملاؤں کو یہ لکھ رہا تھا کہ انہیں اسلام کا نعرہ لگا کر اپنی نظریاتی حدود کو جغرافیائی حدود سے بالاتر قرار دینا چاہیے کیونکہ یہ سیاسی منصوبہ نہ صرف عالمِ اسلام کے اتحاد کی آڑ لے کر سامراجی گٹھ جوڑ میں ممد و معاون ہوگا بلکہ اس سے ان ممالک کے

غریب و مظلوم عوام کا کامیابی سے استحصال جاری رکھا جا سکے گا۔ چونکہ ہندوستان میں تحریک پاکستان کی بنیاد دوقومی نظریے پر تھی اس لئے یہاں اس منصوبے کی کامیابی یقینی تھی۔ ڈیلی سکیچ نے اس مضمون کے آخر میں ہندوستانی مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ اگر ہندوستان سوویت یونین کے زیراثر چلا گیا تو بحیثیت مسلم اقلیت ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ مضمون نگار کو گاندھی کے اس مؤقف سے بھی اختلاف تھا کہ اگر انگریز یہاں سے چلے جائیں تو ہندوستان خود اپنا دفاع کر سکے گا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ایک اول درجے کی طاقت کے خلاف ہندوستان اپنا دفاع نہیں کر سکے گا۔ گویا یہ مضمون نگار نہ صرف اسلام کے نام پر مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا سوویت یونین کے خلاف متحدہ محاذ بنانا چاہتا تھا بلکہ وہ اس مقصد کے لئے ہندوستان کو بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنے زیر تسلط رکھنا چاہتا تھا۔ بلوچستان کے لئے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ بھی برطانوی سامراج کے اسی عزم کا مظہر تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ جب یہ منصوبہ بنانے کے فیصلے کا اعلان کیا گیا تھا اس وقت بلوچستان کے محکمہ فوڈ سپلائیز کے ڈپٹی ڈائریکٹر کیپٹن ایچ۔پی۔ہال (H.P.Hall) کے بیان کے مطابق صوبہ کے بعض علاقوں میں قحط پڑا ہوا تھا اور گندم کی سپلائی اتنی کم ہوگئی تھی کہ کوئٹہ اور پشین کے بعض علاقوں میں راشن کے کوٹے میں کمی کرنا پڑی تھی۔ [17]

ریاست قلات میں برطانوی بلوچستان کو مدغم کر کے اسے آزاد مملکت تسلیم کیا جائے......وزارتی مشن سے خان قلات کا مطالبہ

لارڈ پیتھک لارنس کی سربراہی میں برطانوی وزارتی مشن کے ارکان نے 24/مارچ کو دہلی پہنچنے کے بعد تقریباً مزید دو ماہ تک ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے علاوہ قبائلی علاقوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ اس دوران 24/اپریل کو برطانوی بلوچستان کے پٹھان قبائل کے آٹھ سرداروں نے وزارتی مشن اور وائسرائے کے نام ایک تار میں اس افواہ پر سخت تشویش کا اظہار کیا کہ بلوچستان کو متصلہ صوبوں میں مدغم کر دیا جائے گا۔ تار میں کہا گیا تھا کہ نوابوں، سرداروں، ملکوں اور معتبروں کی رائے میں اس قسم کا اقدام بلوچستان کے لئے سخت نقصان دہ ہوگا۔ بلوچستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے اس کا الگ صوبہ کا درجہ برقرار رہنا چاہیے اور اس صوبہ میں لازمی طور پر اصلاحات نافذ

کرنی چاہئیں۔" اس تار پر جن قبائلی سرداروں نے دستخط کئے تھے، ان میں نواب محمد خان جوگیزئی، خان بہادر نواب محمد عمر کانسی اور خان بہادر سردار گلزار محمد خان ترین کے نام بھی شامل تھے۔"[18] یہ تار بلوچستان میں پٹھانوں اور بلوچوں کے درمیان تضاد کا آئینہ دار تھا اور قلات کے میر احمد یار خان بلوچ کے شہنشاہی خواب کے منافی تھا۔ خان بلوچ نہ صرف ریاست قلات کے بلکہ پورے بلوچستان اور پنجاب وسندھ کے بلوچی علاقوں پر مشتمل ایک عظیم آزاد اور خودمختار بلوچ مملکت قائم کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ اس نے اسی عزم کے تحت پہلے قلات نیشنل پارٹی اور اپنی نام نہاد سٹیٹ کونسل سے "خان معظم" کا "لقب" حاصل کیا تھا اور پھر اپریل 1947ء میں سر سلطان احمد کا مرتب کردہ ایک میمورنڈم قائداعظم محمد علی جناح کی وساطت سے وزارتی مشن کو پیش کیا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ریاست قلات کا علاقہ جنگی اہمیت کا علاقہ ہے۔ اس کی حیثیت افغانستان اور ہندوستان کے درمیان ایک بفر سٹیٹ کی ہے۔ یہ ریاست ایک آزاد خودمختار ریاست ہے جس کے تعلقات حکومت برطانیہ کے ساتھ بذریعہ چند معاہدات بالخصوص معاہدہ 1876ء پر استوار ہیں۔ یہ ریاست کبھی بھی ہندوستان کا جزو نہیں رہی اور اس کا درجہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کا سا نہیں ہے۔ اس کے ہندوستان سے مراسم صرف برطانوی حکومت کے تعلقات کی بنا پر رسمی ہیں۔ جب برطانوی حکومت کا اقتدار اعلیٰ ختم ہو جائے گا تو قلات کا حکومت برطانیہ کے ساتھ معاہدہ بھی ختم ہو جائے گا اور قلات کی معاہدہ سے پہلے کی حالت آزادی مکمل طور پر عود کر آئے گی اور ریاست قلات اپنے مستقبل کے متعلق جو لائحہ عمل اختیار کرے، مختار کل ہوگی۔ تمام مستجار علاقوں پر قلات کی خودمختاری قائم رہے گی اور جملہ مقبوضات قلات کا حصہ رہیں گے۔ برطانوی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے ختم ہوتے ہی مستجار علاقوں سے متعلق معاہدات بھی اپنا جواز کھو دیں گے اور تمام وہ حقوق اور اختیارات جو پہلے حکومت برطانیہ کو حاصل تھے حکومت قلات کو منتقل ہو جائیں گے اور ان مقبوضات سے متعلق اختیارات کی واپسی بحث وتمحیص سے بالاتر ہوگی۔ اور جہاں تک دوسرے بلوچی علاقوں مثلاً لس بیلہ، خاران اور مری بگٹی علاقوں کا تعلق ہے یہ سب ریاست کا حصہ ہیں اور ان کے جملہ اختیارات حکومت برطانیہ کے انخلا پر قلات کو منتقل ہو جائیں گے۔"[19]

لیکن 16 رمئی کو مشن نے ہندوستان کے بارے میں اپنے جس گروپنگ پلان کا اعلان کیا اس میں خان قلات کے دعوے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ البتہ یہ تجویز اس پلان میں شامل تھی کہ

برطانوی بلوچستان مسلم اکثریت والے گروپ میں شامل ہوگا اور مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں یہاں سے ایک نمائندہ لیا جائے گا۔لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اس نمائندے کا انتخاب کیسے ہو گا۔ 30رمئی کو کوئٹہ میں بلوچستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو یہ سوال طویل بحث کا موضوع بنا مگر اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کیا گیا اور نہ ہی مچھ جیل میں 18رمئی کے خونی واقعہ کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کی گئی حالانکہ اس واقعہ میں پولیس کی فائرنگ سے 30 قیدی ہلاک اور 200 زخمی ہوئے تھے۔البتہ کونسل کے اجلاس کے آخر میں ایک قرارداد کے ذریعے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا۔

22رجون کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ نے کوئٹہ میں با اختیار حلقوں کے حوالے سے یہ خبر دی کہ ہز ہائی نس خان آف قلات نے حکومت برطانیہ سے کہا ہے کہ 1833ء، 1899ء اور 1903ء کے وہ معاہدات منسوخ کر دیئے جائیں جن کے تحت قلات نے کوئٹہ، نوشکی اور نصیر آباد کے علاقوں کا انتظام برطانیہ کو پٹہ پر دیا تھا۔26رجون کو خان آف قلات نے ایسوسی ایٹڈ پریس سے ایک انٹرویو میں اس خبر کی تصدیق کی۔اس نے کہا کہ ''میں نے حکومت برطانیہ سے یہ درخواست وزارتی مشن سے بحث وتمحیص کے بعد اور ہندوستان سے برطانیہ کی متوقع دستبرداری کے پیش نظر کی ہے۔قلات کے سرداروں نے مجھے یہ مطالبہ کرنے کو کہا ہے۔ برطانیہ نے قلات کو کبھی بھی فتح نہیں کیا تھا۔انگریز قلات میں دوستوں اور مشیروں کی حیثیت سے رہے ہیں۔انہیں کوئٹہ اور بعض دوسرے علاقے بطور دوستانہ علامت پٹہ پر دیئے گئے تھے۔قلات ایک آزاد ریاست ہے اور اس کی یہ حیثیت گزشتہ ساڑھے چار سو سال سے برقرار رہی ہے۔ہندوستان میں نظام حکومت کی متوقع تبدیلی کے پیش نظر میرے سرداروں نے مجھ سے مستجار علاقوں کی بحالی کی درخواست کی ہے اور میں نے حکومت برطانیہ کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔'' اس نے کہا کہ ''ہمارا یہ مطالبہ اور اس کی تکمیل کا مسئلہ صرف اس صورت میں پیدا ہو گا کہ ہندوستان کے مسئلے کا کوئی تصفیہ ہو اور اس کے نتیجے میں برطانیہ ہندوستان سے دستبردار ہو جائے۔بصورت دیگر موجودہ انتظام جاری رہے گا۔'' خان نے یہ بھی کہا کہ اگر موجودہ گفت وشنید کے نتیجے میں مستجار علاقے قلات کو واپس کر دیئے گئے، تو قلات آزادی سے کسی بھی ملک سے نئے معاہدات کرے گا۔ وہ برطانیہ سے بھی مناسب شرائط کے تحت نیا معاہدہ کرنے میں آزاد ہو گا۔ہم اپنے گردونواح کے

ممالک سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں ان ممالک کی آزادی وخوشحالی اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ اپنی آزادی وخوشی عزیز ہے۔"[20]

خان آف قلات کے اس انٹرویو کا مطلب صاف ظاہر تھا۔ یعنی یہ کہ اسے برطانوی بلوچستان کے بارے میں برطانیہ کے وزارتی مشن کی تجویز منظور نہیں تھی۔ جبکہ 6رجون کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل اور 25رجون کو آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ اس تجویز سمیت وزارتی مشن کے پلان کو منظور کر چکی تھیں۔ خان پورے بلوچستان میں اپنی ایک آزاد خودمختار مملکت قائم کرنے پر مصر تھا اور وہ اپنی اس مملکت میں برطانیہ کو ایک نئے معاہدے کے تحت ہر قسم کی مراعات دینے پر آمادہ تھا۔ اس نے اس خیال کے تحت 1945ء سے برطانیہ کی ایک آئل کمپنی کے ساتھ بات چیت بھی شروع کر رکھی تھی۔ تاہم جولائی میں کوئٹہ میونسپلٹی اور شاہی جرگہ کے ارکان کی بھاری اکثریت نے عبدالصمد اچکزئی کے مقابلے میں نواب محمد خان جوگیزئی کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب کرلیا۔ مسلم لیگ نے اس انتخاب کے لئے اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا تاہم نواب جوگیزئی نے قبل ازیں قائداعظم جناح کے نام ایک خط میں اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہوا تھا۔

لیکن جب 27رجولائی کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے کانگرس کے ڈکٹیٹر مہاتما گاندھی اور کانگرس کے نئے صدر جواہر لال نہرو کی وزارتی مشن کے پلان میں من مانی تعبیروں کے پیش نظر حصول پاکستان کے لئے راست اقدام کرنے کا فیصلہ کیا تو بلوچستان کے مستقبل کا مسئلہ وقتی طور پر اس تاریخی فیصلے کے بوجھ تلے دب گیا۔ اس فیصلے کے مطابق مسلم لیگ نے 16راگست کو پورے برصغیر میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا تو کلکتہ میں ایسا فرقہ وارانہ فساد ہوا کہ ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک طرح کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس ہولناک خونریزی کے باعث نومبر میں پورے ہندوستان میں سیاسی صورت حال بہت ہی کشیدہ تھی مگر خان آف قلات اس کے بارے میں فکرمند نہیں تھا۔ اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ کسی نہ کسی طرح اس کی ایک آزاد خودمختار مملکت قائم ہوجائے۔ چنانچہ اس نے 27رنومبر کو مری بگٹی علاقے کے تمنداروں سے یہ درخواست وصول کی کہ ان کے قبائلی علاقے فیڈریشن کی صورت میں قلات میں شامل کئے جائیں۔ اس درخواست پر سردار بہادر دودا خان سربراہ تمندار مری، نوابزادہ سردار

محمد اکبر خان تمندار بگٹی اور سردار سر محمد جمال لغاری کے دستخط تھے۔ درخواست کا متن یہ تھا کہ ''ہم تمندار قبائلی علاقہ بلوچستان یعنی مری بگٹی کچھ عرصہ سے محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے علاقے کے خاص حالات کو ہندوستان کی نئی آئین سازی میں بطریق احسن مدنظر رکھا جائے۔ ہمارے خیال میں ہمارے قبائلی مفاد اور تمندارانہ نظام کے لئے یہ امر اشد ضروری ہے کہ ہم اپنا نظریہ قبائلی علاقہ کے خاص حالات وضروریات کے تحت گورنمنٹ عالیہ و ہندوستانی سیاسی لیڈروں کے سامنے پیش کریں تاکہ ہمارا مفاد مکمل غور کے بغیر نظر انداز نہ ہوجائے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارا قبائلی علاقہ جو حدود برٹش انڈیا سے باہر ہے، ایک گروپنگ سسٹم کے تحت قبائلی علاقہ ہائے پنجاب سے علیحدہ کر کے قلات اسٹیٹ کے ساتھ ایک فیدریشن کی صورت میں ملحق کر دیا جائے اور ہز ہائی نس، بیگلر بیگی، خان قلات کے زیر سایہ ایک فیڈریشن میں لایا جائے۔ ہماری آزادی کو بحال رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم متفقہ طور پر سر محمد جمال خان لغاری اور وزیر اعظم ریاست قلات کو تمام آئندہ میٹنگوں، کمیٹیوں اور اسمبلیوں میں، جو کہ ہندوستانی کانسٹی چیوشن بالخصوص قبائلی علاقے کی آئین سازی کے لئے بلائی جائیں، اپنے نمائندگان خاص امور کے منتخب کرتے ہیں۔''[21] خان نے اپنے تمنداروں سے جب یہ درخواست لکھوائی تھی تو اس وقت ہندوستان کے لئے گروپنگ کی مہم ناکام ہوچکی تھی اور کلکتہ، نواکھلی اور بہار کے فسادات کے بعد سیاسی مبصرین کو یقین ہوگیا تھا کہ اب برصغیر کی تقسیم یعنی پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ لیکن خان نے ہندوستان اور بین الاقوامی حالات سے آنکھیں بند کر کے اپنی کوئی گروپنگ سکیم تیار کی تھی جس کے تحت وہ پنجاب کے بعض علاقوں کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرنے کا متمنی تھا۔ سر جمال خان لغاری ضلع ڈیرہ غازی خان سے پنجاب اسمبلی کا رکن تھا۔ خان کی جانب سے اس کو اپنا خصوصی نمائندہ مقرر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی شہنشاہی نظریں پنجاب کے اس ضلع پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ اس ضلع میں بلوچوں کی اکثریت تھی۔ بظاہر وہ اپنے جدامجد میر نصیر خان نوری کے اس مؤقف کا قائل تھا کہ ''جہاں تک بلوچ آباد ہیں وہاں تک ہماری بلوچی مملکت کی سرحدیں ہیں۔'' وہ اس مؤقف کی بنا پر سندھ میں کراچی تک کے علاقے پر اور ایران کے صوبہ سیستان پر بھی اپنی ملکیت کا دعویدار تھا۔

پشتون۔بلوچ تضاد......پشتون،آزاد ریاست قلات کے برخلاف پاکستان یا ہندوستان سے وابستگی چاہتے تھے

خان قلات کی یہ گروپنگ سکیم بلوچستان کے پٹھان قبائلیوں کے سرداروں کے لئے قابل قبول نہیں تھی اور انہوں نے اپنی تقدیر مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان سے وابستہ کر رکھی تھی۔ان میں عبدالصمد اچکزئی کا تعلق انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ بھی تھا۔بلوچستان مسلم لیگ کے قائدین قاضی عیسیٰ وغیرہ پٹھان تھے اور انہوں نے کبھی خان آف قلات کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار نہیں کیا تھا۔برطانوی بلوچستان کے پٹھان قبائیلیوں کا نمائندہ نواب محمد خان جوگیزئی دستور ساز اسمبلی کا رکن تھا۔اسے خان آف قلات کی بادشاہت کسی صورت قبول نہیں تھی۔وہ اپنے جوگیزئی قبیلہ کو خان قلات کے احمدزئی قبیلہ سے برتر سمجھتا تھا۔وہ ڈسٹرکٹ ژوب گزیٹیر کی جلد اول کا حوالہ دے کر یہ دعویٰ کرتا تھا''احمد شاہ ابدالی نے اس کے جد امجد بکارنکا کو ژوب کے فرمانروا بادشاہ کی سند عطا کی تھی۔بکارنکا جوگی کا پڑپوتا تھا اور جوگی ہی کے نام سے آگے چل کر جوگیزئی قبیلہ موسوم ہوا۔انگریزوں کے تسلط جمانے تک ژوب کے علاقے پر عمل دخل اور اقتدار بلاشرکت غیرے جوگیزئی خاندان کو حاصل رہا۔شجرۂ نسب کے لحاظ سے جوگیزئی کا رشتہ 23 ویں پشت میں قیس عبدالرشید سے ملتا ہے۔قیس عبدالرشید وسط ایشیا سے ترک سکونت کرتے ہوئے شمال مغربی ہند میں داخل ہوئے اور کوہ سلیمان کے مغرب میں اپنا مسکن بنایا۔کہا جاتا ہے کہ وہ وہی قیس عبدالرشید ہیں جنہیں بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔''نواب جوگیزئی کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ''خان قلات کے دادا میر خداداد خان اور والد میر اعظم جان کی طرح اس کے دادا سردار دوست محمد خان اور والد مینگل خان نے انگریزوں کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔وہ انگریزوں سے ہمیشہ برسرپیکار رہے۔جب انگریزوں کی تمام تدابیر اور قوت اس کے والد مینگل خان کو شدید مخالفت سے باز نہ رکھ سکی تو انہوں نے اس بات میں عافیت اور مصلحت سمجھی کہ ان سے مراسم دوستانہ استوار کئے جائیں۔چنانچہ اس طرح انگریزوں نے مینگل خان کی سیادت واہمیت کا احساس کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے باقاعدہ الاؤنس اور لگان سے معافی کی اراضی بھی دی۔جنوری 1894ء میں انگریزوں نے مینگل خان کو چند اور سرداران

بلوچستان کے ساتھ لاہور، کلکتہ، بمبئی اور کراچی کی سیر کرائی۔ 95-1894ء میں سر ہنری میک موہن نے افغان بلوچستان سرحد کے تعین کے سلسلے میں مینگل خان کو اپنے ساتھ رکھا۔ 1897ء میں انہیں سردار بہادر اور 1906ء میں نواب کے خطابات دیئے گئے۔ مئی 1906ء میں جبکہ وہ قلعہ سیف اللہ میں تھے انہیں گولی ماردی گئی۔ زخم اتنا کاری اور شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکے۔"[22]

نواب جوگیزئی نے اپنے اس صحیح یا غلط خاندانی پس منظر کے ساتھ جب یہ سنا کہ نصیر آباد کے سرداروں نے خان قلات سے یہ تحریری وعدہ کیا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے دستبردار ہونے سے پہلے مستجار علاقہ جات خان قلات کے حوالے کر گئے تو نصیر آباد کے باشندے بعض شرائط کے تحت قلات کے ساتھ شمولیت پسند کریں گے تو اس کے جذبہ رقابت نے جوش مارا اور اس نے 14 ردسمبر کو نئی دہلی میں اعلان کیا کہ پاکستان کی آزاد مملکت کے قیام کے لئے بلوچستانی عوام ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی پوری حمایت کرتے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ بلوچستان کے سرداروں کے حکم کے مطابق میں قائداعظم کی اجازت کے بغیر دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کر سکتا۔ بلوچستان کے سرداروں نے مجھ سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کوئی ایسا آئین جو صرف ایک جماعت مرتب کرے گی اور جس کی بنا شریعت مطہرہ پر نہ ہوگی، بلوچستان کے عوام کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ کانگرس مسلم لیگ کی شمولیت کے بغیر کوئی آئین تیار کرنے میں حق بجانب نہیں ہوگی۔ یہ اشد ضروری ہے کہ دونوں جماعتیں باہمی تعاون سے کام لیں، میرے عوام کی پوری ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ ہندوستان میں حال ہی میں جو واقعات ہوئے ہیں ہم ان سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور ہمارے عوام مصیبت زدہ مسلمانوں کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ بلوچستان کے عوام پر کانگرس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہاں تین چار تنخواہ دار کارکنوں کے سوا کوئی بھی کانگرسی نظر نہیں آتا۔[23]

نواب جوگیزئی کے اس اعلان کے موقع پر قائداعظم محمد علی جناح لندن جاتے ہوئے قاہرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں انہوں نے مصری وزیراعظم نقراشی پاشا اور عرب لیگ کے سیکرٹری عظام بے سے ملاقاتیں کر کے مسلم ممالک کی کانفرنس کے انعقاد سے متعلقہ تجویز کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا تھا۔ یہ تجویز نومبر 1946ء کے اوائل میں قاہرہ سے آئی تھی اور قائداعظم جناح نے 8 رنومبر کو عرب نیوز ایجنسی سے ایک انٹرویو میں اس کا خیر مقدم کیا تھا اور کہا تھا

کہ اس طرح ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کو مصر، عراق، سعودی عرب، ایران اور دوسرے مسلم ممالک کے لیڈروں سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ ان سب کے بہت سے مفادات مشترک ہیں اور باہمی ثقافتی اور نظریاتی افہام وتفہیم سے بہت فائدہ ہوگا۔''[24]

قائداعظم دو تین ہفتے کے بعد لندن سے واپس آئے تو انہوں نے 15 رجنوری 1947ء کو نواب جوگیزئی کے نام ایک خط میں اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ نواب مسلم لیگ کی حمایت کر رہا ہے۔ اس خط میں مزید لکھا تھا کہ ''اس نازک وقت میں مسلمانوں کے مابین اتحاد انتہائی ضروری ہے اور آپ جیسا صاحب حیثیت اور بااثر فرد اس کوشش میں جو ہم حصول پاکستان کے لئے کر رہے ہیں مسلمان قوم اور اسلام کی سربلندی کے لئے بہت زیادہ مدد اور خدمت کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ آپ حالات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ مسلمانوں کے اتحاد ہی میں ان کی نجات ہے۔''[25] قائداعظم کے اس خط سے بالکل واضح تھا کہ انہیں کم از کم خان قلات کے برطانوی بلوچستان کے بارے میں عزائم سے اتفاق نہیں تھا اور وہ اس تاثر کو دور کرنا چاہتے تھے کہ مسلم لیگ خان قلات کی پورے بلوچستان میں آزاد بادشاہت کو تسلیم کرلے گی۔

21 رجنوری کو نواب جوگیزئی نے کراچی میں قائداعظم جناح سے تقریباً دو گھنٹے تک ملاقات کی اور پھر اعلان کیا کہ ''اگر مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو بلوچستان بھی اس میں شریک نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ ''میں نے قائداعظم جناح کو یقین دلایا ہے کہ بلوچستان پوری طرح مسلم لیگ کے ساتھ ہے اور وہ پاکستان کے حصول کے لئے ہر قربانی کرے گا۔''[26] نواب محمد جوگیزئی کی اس یقین دہانی کی ایک وجہ تو بلوچوں اور پٹھانوں کے درمیان تضاد یعنی خان قلات اور نواب جوگیزئی کے درمیان تضاد میں مضمر تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کلکتہ، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیشر اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے علاقوں میں ہندو مسلم فسادات سے برطانوی بلوچستان کے شہری اور قبائلی عوام بہت متاثر ہوئے تھے اور نواب جوگیزئی اس رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ نواب جوگیزئی کی خان عبدالصمد اچکزئی کی زیر قیادت کانگرسی عناصر سے شدید سیاسی رقابت تھی لہٰذا وہ کانگرس کی دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ جولائی 1946ء میں اسمبلی کے انتخابات میں بھی اس کا مقابلہ کانگرسی امیدوار عبدالصمد اچکزئی کے ساتھ ہوا تھا جبکہ مسلم لیگ نے قاضی محمد عیسیٰ کے استحقاق کو نظر انداز

کر کے اس انتخاب میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا ہی نہیں کیا تھا اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ حکومت برطانیہ اپنے 6؍دسمبر 1946ء کے بیان میں یہ عندیہ دے چکی تھی کہ اگر ہندوستانی لیڈروں میں کوئی مفاہمت نہ ہوئی تو وہ وزارتی مشن کے پلان کو ترک کر دے گی اور اس بیان سے وسیع پیمانے پر یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ اب برطانیہ زیادہ دیر تک ہندوستان میں نہیں رہ سکتا اور اسے یہاں سے دستبردار ہونے سے پہلے مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

باب:4

پاکستان میں برطانوی بلوچستان کی شمولیت اور قلات کی علیحدگی

ایٹلی کا اعلان آزادی اور بلوچستان کے مستقبل پر خان قلات اور پشتون سرداروں کے باہمی اختلافات

جب 20رفروری 1947ءکو برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی (Attlee) نے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کسی آئینی فارمولے پر مفاہمت کے امکان کے قطعی خاتمے اور ہندوستان کے طول وعرض میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے پیش نظر یہ اعلان کیا کہ برطانیہ جون 1948ءتک ایک یا ایک سے زیادہ حکومتوں کو اقتدار سونپ کر ہندوستان سے دستبردار ہو جائے گا اور یہ کہ اس دستبرداری کا انتظام کرنے کے لئے لارڈ ویول (Wavell) کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten) کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا ہے تو پاکستان کے قیام کے بارے میں پیدا شدہ تاثر نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔ تاہم بلوچستان کے بارے میں پوزیشن واضح نہیں تھی۔ ان دنوں ملٹری انجینئرز سروسز کا عملہ کراچی اور کوئٹہ کے درمیان براستہ قلات ریلوے لائن اور سڑک کی تعمیر کے لئے سروے کر رہا تھا اور اس بنا پر عام خیال یہ تھا کہ برطانوی سامراج بلوچستان میں اپنی کسی نہ کسی طرح کی فوجی موجودگی برقرار رکھے گا۔

جب 22رمارچ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے آخری وائسرائے کے طور پر دہلی پہنچ کر انتقال اقتدار کے لئے ہندوستان کے سیاسی زعما سے فوراً بات چیت کا سلسلہ شروع کر

دیا تو قاضی عیسیٰ، نواب محمد خان جوگیزئی، عبدالصمد اچکزئی اور خان قلات آف قلات کے درمیان چوطرفہ کشمکش نے بلوچستان کی صورت حال کو اور بھی زیادہ غیر واضح کر دیا۔

3/اپریل کو خان قلات نے دہلی سے واپس کوئٹہ پہنچ کر اپنے اس مؤقف کا اعادہ کیا کہ جب اگلے سال برطانیہ ہندوستان سے دستبردار ہو گا تو ریاست قلات اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دے گی اور مستجار علاقے بھی اس کے ساتھ مل جائیں گے۔ اس نے کہا کہ ہندوستان میں برطانوی راج سے پہلے قلات ایک آزاد ریاست تھی۔ انگریز بلوچستان میں محض دوستانہ قیام کے لئے آئے تھے اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہاں غیر ملکی حملے کے خلاف دفاعی مراکز قائم کئے جائیں۔ اب جب وہ ہندوستان سے چلے جائیں گے تو ریاست قلات پھر آزاد خود مختار ریاست بن جائے گی۔ میری ریاست کے سرداروں کی بھی یہی خواہش ہے اور وہ آزاد ریاست قلات میں جمہوری طرز حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک مستجار علاقوں کے بارے میں ہمارے مطالبے کا تعلق ہے یہ ایک بڑے مسئلے سے منسلک ہے۔ ہم اس سلسلے میں حکومت برطانیہ سے مراسلت کریں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ریاست قلات کے مستجار علاقوں کی بحالی کے سوال کا فیصلہ ہندوستان کے سیاسی تصفیہ کے بڑے مسئلے کے فیصلے کے ساتھ ہی ہو جائے گا۔[1]

خان قلات کے اس بیان سے بلوچستان کے مسلم لیگی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ خان نے پورے بلوچستان میں یہ افواہ پھیلا رکھی تھی کہ قائداعظم جناح اس کے بہت گہرے ذاتی دوست ہیں اس لئے مسلم لیگ بلوچستان میں اس کی بادشاہت کو تسلیم کر لے گی۔ چنانچہ صوبائی مسلم لیگ کا صدر قاضی عیسیٰ دہلی پہنچا اور اس نے 21/اپریل کو قائداعظم سے ملاقات کر کے بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا اور پھر اسی روز کوئٹہ میں اعلان کیا گیا کہ سٹی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس 27 اور 28/اپریل کو منعقد ہو گا جس میں چودھری خلیق الزماں کے علاوہ کئی دوسرے ممتاز مسلم لیگی زعما شرکت کریں گے۔ لیکن 27/اپریل کو کوئٹہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی بجائے بلوچستان مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت چودھری خلیق الزماں نے کی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے بلوچستان مسلم لیگ سے یہ سفارش کی گئی کہ ''ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کر کے اس کے ذمے یہ کام کیا جائے کہ وہ بلوچستان کی جمہوری حکومت کے لئے آئین کا ایک ایسا مسودہ تیار کرے جس

کی بنیاد بالغ رائے دہندگی کے اصول اور غیر طبقاتی معاشرے کے تصور پر ہو۔قرارداد میں کہا گیا تھا کہ دوسرے صوبوں کے برعکس بلوچستان میں کوئی حکومتی مشینری نہیں ہے جو اگلے سال برطانیہ کی دستبرداری پر عنان اقتدار سنبھال لے۔ خدشہ یہ ہے کہ برطانوی بلوچستان، سٹیٹ ایجنسیز اور قبائلی علاقوں میں انتشار وافتراق کے رجحانات پیدا ہو جائیں گے اور اس طرح بلوچستان کا قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔[2] اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ قاضی عیسیٰ اور اس کے مسلم لیگی ساتھیوں نے نہ صرف خان قلات بلکہ نواب محمد خان جوگیزئی کے خلاف بھی محاذ کھول دیا تھا۔جس طرح خان قلات پورے بلوچستان میں ایک مطلق العنان بادشاہ بننا چاہتا تھا، اسی طرح نواب جوگیزئی برطانوی بلوچستان میں بلاشرکت غیرے اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

نواب جوگیزئی کا ایک حاشیہ بردار نسیم حجازی لکھتا ہے کہ مسلم لیگ کے اس جلسہ میں ازابتدا تاانتہا تمام مقررین کا لب ولہجہ اور طرز خطابت خلاف توقع نکلا۔یعنی مقررین نے تو تہذیب وشائستگی کے دامن کو بھی تار تار کر ڈالا۔ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ وہ تمام با اثر ومقتدر حضرات جو بلوچستان کی رائے عامہ کو براہ راست متاثر کر سکتے تھے ان کے دل جیتنے اور ان کو اپنے قریب تر لانے کی بجائے ان کو برافروختہ وبددل کر دیا۔ان کے جذبات ووقار کو نہایت بھونڈے پن سے مجروح کیا گیا۔اس وقت کے بلوچستان میں قبائلی نظام رائج تھا۔قبائلی سردار خواہ ان کا تعلق بلوچوں سے ہو یا پٹھانوں سے،عزت ووقار،شرافت ودینی محبت سے آشنا تھے اور اسلامی اتحاد سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی دلچسپی کا باعث نہ تھی۔اس مرکزی نکتہ کی تشریح وتوضیح کو اگر موضوع خطاب بنا کر محبت کا رس سامعین کے کانوں میں گھولا جاتا تو فضا قطعی طور پر مکدر نہ ہوتی اور قبائلی سردار اپنی تمام تر جمعیت اور صلاحیتوں کے ساتھ اس قافلہ کو کہیں سے کہیں لے جاتے اور اس طرح مسلم لیگ کے مشن کو بلوچستان میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوتا۔[3] بالفاظِ دیگر اگر قاضی عیسیٰ اور اس کے ساتھی جمہوریت اور طبقاتی مساوات کے نعرے لگانے کے بجائے اسلامی اتحاد کے نام پر نواب محمد خان جوگیزئی کی سیادت وقیادت کو بلا چون وچرا قبول کر لیتے تو بلوچستان میں کوئی سیاسی رسہ کشی نہ ہوتی۔ وہ برطانوی بلوچستان کی ریاست پر نواب محمد خان جوگیزئی وغیرہ کی قبائلی اجارہ داری کو اسلامی اتحاد قرار دیتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ خان قلات اپنی ابتدائی بادشاہت کو اسلام کی سربلندی کی علامت قرار دیتا تھا۔نسیم حجازی ایک پنجابی اخبار نویس

تھا۔ وہ 1947ء میں کوئٹہ میں ایک جریدہ ''تنظیم'' شائع کرتا تھا جس میں دقیانوسی قبائلی سرداروں کے مفادات کے علاوہ پنجابیوں کے مفادات کی ترجمانی کی جاتی تھی۔

3؍جون کو تقسیم ہند کا اعلان اور پاکستان میں شمولیت کے سوال پر پشتون ......بلوچ تضاد

3؍جون کو حکومت برطانیہ کی جانب سے برصغیر کی تقسیم کے بارے میں جو اعلان کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کیا جا رہا ہے اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلم مملکت بھی قائم ہو رہی ہے جو پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرنے کے بعد وجود میں آئے گی۔ برصغیر کی ریاستوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اپنے قریبی ملک میں شمولیت اختیار کر لیں۔ اس اعلان میں بلوچستان کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ''برطانوی بلوچستان نے دستور ساز اسمبلی کے لئے ایک رکن منتخب کر رکھا ہے۔ لیکن اس رکن نے موجودہ دستور ساز اسمبلی میں اپنی نشست نہیں سنبھالی۔ جغرافیائی محل وقوع کو پیش نظر رکھ کر اس صوبے کو بھی اپنی پوزیشن پر از سر نو غور کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اسے یہ حق ہو گا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں سے کسی ایک ریاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کرے۔ گورنر جنرل اس امر کا جائزہ لے رہا ہے کہ برطانوی بلوچستان کس طریقے سے یہ حق استعمال کر سکتا ہے۔''

اس اعلان کے تقریباً دو ہفتے بعد 21؍جون کو نواب محمد خان جوگیزئی نے کوئٹہ کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ بلایا، مگر کانگرس نواز عناصر کی ہلڑ بازی کے باعث نواب پاکستان کے حق میں اپنا اعلان نہ پڑھ سکا اور کوئی دوسرا شخص بھی پاکستان کے حق میں تقریر نہ کر سکا۔ جلسہ میں از ابتدا تا انتہا مسلسل شور و غل رہا۔ بعض مسلم لیگی عناصر کا الزام یہ تھا کہ اس جلسہ میں ہلڑ بازی نواب جوگیزئی نے خود کروائی تھی کیونکہ وہ پاکستان کے حق میں کوئی اعلان کرنے سے پہلے مسلم لیگ کی قیادت کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ نواب جوگیزئی قبائلی سرداروں کی سازشی سیاست کے فن کا ماہر تھا اس لئے اس سے اس قسم کی چالبازی بعید از قیاس بھی نہیں تھی۔ 23؍جون کو لوکل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک اور جلسہ ہوا مگر اس میں بھی پاکستان کے حق میں قرارداد منظور نہ ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قلات نیشنل پارٹی اور کانگرس پارٹی نے بڑے شد و مد سے اس کی

مخالفت کی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ خان عبدالخالق کاکڑ، مرزا فیض اللہ خان اور ماسٹر محمد ہاشم خان غلزئی کے علاوہ بعض دوسرے بااثر قبائلی سرداروں کا گروہ یہ چاہتا تھا کہ پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرنے سے پہلے مسلم لیگ ہائی کمان سے یہ ضمانت حاصل کر لی جائے کہ پاکستان میں ان کے حقوق و مفادات محفوظ رہیں گے۔ یعنی عنان اقتدار قاضی عیسیٰ اور دوسرے مسلم لیگیوں کے حوالے نہیں کی جائے گی۔ سرداری نظام اور جرگہ سسٹم قائم رہے گا اور سارے قبائلی سرداروں کو حسب سابق الاؤنس ملتے رہیں گے۔

24 رجون کو نئی دہلی میں ریفارمز کمشنر کے دفتر سے یہ اعلان جاری ہوا کہ حکومت برطانیہ کے 3 رجون کے پلان کے تحت بلوچستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے ایجنٹ گورنر جنرل کی زیر صدارت شاہی جرگہ کے، بجز ان ارکان کے، جنہیں خان قلات نے نامزد کیا ہوا ہے اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ارکان کا 30 رجون کو ایک جلسہ ہوگا جس میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا کہ یہ صوبہ کونسی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔ اس اعلان کے اگلے دن یعنی 25 رجون کو انڈین سول سروس کے ایک مسلمان افسر ایم۔ مسعود نے میر جعفر خان جمالی کے مکان سے بذریعہ ٹیلی فون بتایا کہ قبائلی سردار اس امر کی یقین دہانی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شمولیت کے بعد ان کے حقوق و مراعات کا تحفظ کیا جائے گا۔ چنانچہ قائداعظم نے مطلوبہ یقین دہانی کے لئے اسی دن نئی دہلی سے ایک بیان جاری کیا جس میں امید ظاہر کی گئی کہ ''شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ارکان جب بلوچستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوں گے تو نہ صرف انہیں اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ بلوچستان سیاسی، جغرافیائی اور معاشی اعتبار سے صرف پاکستان ہی میں اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے۔ بلکہ وہ یہ بھی محسوس کریں گے کہ یہ بلوچستان کے عوام کے مفاد میں ہوگا کہ وہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوں اس لئے کہ یہ تنہا پاکستان ہی ہے جو اس کی تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی میں مدد کر سکتا ہے۔ میں بلوچستان کے عوام کو یقین دلا سکتا ہوں کہ پاکستان میں تمام طبقے اور مفادات یکساں انصاف اور سلوک کے مستحق ہوں گے اور میں توقع کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دشمنوں کے اس پروپیگنڈا سے گمراہ نہیں ہوں گے جس کا مقصد ایک طبقہ اور ایک مخصوص مفاد کو دوسرے کے خلاف ابھارنا ہے۔ مسلمانوں کی نجات ہمارے کامل اتحاد، سالمیت اور نظم وضبط میں پوشیدہ ہے اور ان سب سے بڑھ کر اپنے قائد کے اوپر بھروسہ اور

اعتماد پر جس نے کہ پچھلے دس سالوں سے ان کی خدمت کی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جن پر فیصلہ کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کے حق میں متفقہ رائے سے فیصلہ کریں گے۔"

جب قائداعظم کی جانب سے اعلانیہ طور پر یہ یقین دہانی ہوگئی اور انہوں نے مزید یقین دہانی کے لئے سردار عبدالرب نشتر کو کوئٹہ پہنچنے کی ہدایت کر دی تو نواب محمد خان جوگیزئی اور سندھ اسمبلی کے ایک بااثر بلوچ رکن میر جعفر خان جمالی نے ایک مشترکہ بیان میں اعلان کیا کہ وہ بلوچستان کو پاکستان دستور ساز اسمبلی میں شامل کرنے کے حق میں ہیں۔[4] ان کا بیان تھا کہ "برایں حالات کہ انگریز کا قبضہ بلوچستان سے اٹھنے والا ہے اور برایں حالات کہ بلوچستان کے بلوچ اور پٹھان سرداروں اور عوام کو پریشانی یہ ہے کہ ان کے حقوق اور قبائلی نظام اور قدیمی دستور کو قائم رکھا جائے، بلوچستان کے سرداروں نے پورے غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلوچستان کے حقوق کا بہترین تحفظ پاکستان کے اندر رہنے سے ہوگا۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو کر بلوچستان نہ صرف اپنی آزادی وخودمختاری کی حفاظت کرے گا بلکہ اپنے ہمسایہ صوبوں کے دوش بدوش اپنی اقتصادی اور سیاسی حالت کو بدرجہا بہتر بنا سکے گا۔ ہم شریعت کے تابع ہوں گے اور بلوچوں کے ماتحت رواج اختیار کرنے کا اختیار ہوگا۔ بلوچوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ قائداعظم کی کوششوں سے ہم ہندو اکثریت کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو کر پاکستان کی اسلامی حکومت میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم سب سردار بمع اپنے قبائل کے پاکستان کی اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے لئے تیار ہیں اور قائداعظم پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری رہنمائی کریں گے۔ ہم کانگرس اور اس کے ایجنٹوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ روپے کے زور سے ہمارے سیدھے سادے اور مخلص مسلمانوں کو گمراہ نہ کریں۔ ہم ان تمام مسلمان حلف فروشوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جو آزاد بلوچستان کے نعرے سے پاکستان کی اسلامی حکومت کے خلاف پبلک میں زہر پھیلاتے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ بلوچستان کا بچہ بچہ پاکستان کی خاطر اپنا جان و مال قربان کرے گا اور جو پاکستان کی مخالفت کرے گا وہ یقیناً اسلام کا دشمن سمجھا جائے گا۔"[5] اس مشترکہ بیان سے صاف ظاہر تھا کہ ان قبائلی سرداروں کو پریشانی تھی تو صرف یہ تھی کہ ان کے قبائلی نظام اور قدیمی دستور کو قائم رکھا جائے اور قائداعظم کے 25 رجون کے بیان کے بعد انہیں یقین

ہو گیا تھا کہ ان کے حقوق کا بہترین تحفظ پاکستان کے اندر رہنے سے ہو گا۔

اس مشترکہ بیان میں جن کانگرس نواز عناصر کو تنبیہ کی گئی تھی ان کا تعلق جمعیت العلمائے ہند، انجمن وطن اور قلات نیشنل پارٹی سے تھا۔ ان عناصر کا ایک پروپیگنڈا تو یہ تھا کہ بلوچستان کی سالانہ آمدنی ستر لاکھ روپے ہے جبکہ اخراجات اڑھائی کروڑ روپے کے لگ بھگ ہیں۔ چونکہ پاکستان خود ایک غریب ملک ہو گا اس لئے وہ اس صوبہ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکے گا۔ دوسرا پروپیگنڈا یہ تھا کہ اگر بلوچستان نے ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو ''آزاد بلوچستان'' قائم ہو جائے گا۔ اور تیسرا پروپیگنڈا یہ تھا کہ اگر برطانوی بلوچستان کے قبائلی سردار خان آف قلات کے ساتھ مل جائیں تو ایک آزاد و خود مختار بلوچستانی مملکت وجود میں آ سکتی ہے۔'' نواب محمد خان جوگیزئی کے بیٹے نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی کے بیان کے مطابق مؤخرالذکر پروپیگنڈا کرنے والوں میں چمن کے سابق پولیٹیکل ایجنٹ ڈی۔ وائی۔ فیل (D.Y.Fell) جو بعد میں قلات کا وزیر خارجہ بنا، کے علاوہ بعض دوسرے انگریز افسر بھی شامل تھے۔ ''ان انگریز افسروں کا خیال تھا کہ وہ قلات کی آزاد مملکت کو برطانیہ کے فوجی اڈے کے طور پر استعمال کر سکیں گے۔ میں 10 رجون کو لیجارڈ، چیف میڈیکل افیسر کے مکان پر ڈی۔ وائی۔ فل کو ملا تو اس نے دوران ملاقات مجھے بڑے زوردار طریقے سے کہا نواب صاحب سے کہو کہ وہ قلات کے ساتھ مل جائیں۔ انہیں نہ پاکستان میں شامل ہونا چاہیے نہ ہندوستان میں۔ اس طرح ان کی نوابی کی حیثیت برقرار رہ سکے گی۔ میں نے فل کی یہ بات سن کر بڑی حقارت و جرأت سے کہا ''اگر ہم پاکستان میں شامل نہ ہوئے تو مسلمانان ہند، ہندو کی سیاست کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ہمارا قلات میں شامل ہونے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم قلات کے ہم پلہ ہیں اور پٹھان کسی بھی صورت میں قلات کی سرداری کو قبول نہیں کریں گے۔ فل نے جواب دیا کہ ''خان قلات کی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ آپ کی سند کی کوئی وقعت نہیں۔ فل کا یہ انداز انگریز قوم کی روائتی ڈپلومیسی کا مظہر تھا۔ اس نے یہ دلیل اس واقفیت کے باوجود دی تھی کہ ہماری پوزیشن احمد شاہ ابدالی کے عہد سے حاکم اور بادشاہ ژوب کی تھی۔

اگلے دن فل میرے والد سے خود ملنے کے لئے آیا اور اس نے اپنے ترکش کے سارے تیر ان کی طرف پھینکے لیکن اس کا کوئی حربہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ میں گزشتہ شب اپنے والد کو

قائل کر چکا تھا کہ ہماری بہتری اس میں ہے کہ ہم پاکستان میں شامل ہوں۔ ہمیں مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کی خاطر قربانی دینی پڑے گی اور اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو تاریخ میں جوگیزئی کا نام سیاہ حروف میں لکھا جائے گا۔ ہاں اگر پاکستان خدانخواستہ نہیں بنتا ہے تو پھر ہمیں اس کے بعد علاقے اور اپنے مفاد کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق ہے۔'' نوابزادہ جہانگیر شاہ کا یہ بیان کس حد تک صحیح ہے اس کا قطعیت کے ساتھ کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم جو بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ہندوستان سے برطانیہ کی دستبرداری کی باتیں ہونے لگی تھیں تو بلوچستان میں پٹھانوں اور بلوچوں کے درمیان تضاد بہت شدید ہو گیا تھا۔ دونوں کی سیاسی رسہ کشی میں خان قلات بلوچوں کی نمائندگی کرتا تھا اور پٹھانوں کی ترجمانی کے فرائض نواب محمد خان جوگیزئی ادا کرتا تھا۔ دوسری نا قابل تردید بات یہ ہے کہ چمن کا سابق پولیٹیکل ایجنٹ ڈی۔ وائی۔ فل جون 1947ء میں واقعی خان قلات کی ایک آزاد خود مختار بادشاہت کے قیام کے لئے تگ ودو کر رہا تھا اور قلات نیشنل پارٹی اور انجمن وطن کے زعما بھی اس کی اس کوشش میں شریک تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ کانگرسی لیڈروں کی طرف سے مسلسل یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ پاکستان ایک مفلوک الحال ملک ہوگا اور اس بنا پر یہ سرحد اور بلوچستان کے زائد اخراجات برداشت نہیں کر سکے گا۔

برطانوی بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کا پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ

29رجون کو ایجنٹ گورنر جنرل سر جیفرے پرائر (Geofferey Prior) کی زیر صدارت شاہی جرگہ کے 54 ارکان اور کوئٹہ میونسپلٹی کے دس غیر سرکاری ارکان کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ بلوچستان کا نمائندہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہو گا۔ میونسپلٹی کے ہندو اور سکھ ارکان نے بھی اس تجویز کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اسی دن سندھ مسلم لیگ کا صدر محمد ایوب کھوڑو بذریعہ بولان میل اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن سردار عبدالرب نشتر بذریعہ ہوائی جہاز کوئٹہ پہنچ گئے تھے۔ وائسرائے کے ریفارمز کمشنر کے 24رجون کے اعلان کے مطابق اس ریفرنڈم میں خان قلات کے نامزد سرداروں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ بلوچستان مسلم لیگ کا صدر قاضی عیسیٰ اس دن کوئٹہ میں نہیں تھا۔ دراصل 3رجون کو برصغیر کی تقسیم کے اعلان کے بعد وہ مسلسل کوئٹہ سے غیر حاضر رہا تھا کہ خان قلات کے ایجنٹ اور انجمن وطن کے

کانگرس نواز عناصر مسلم لیگی لیڈروں اور قبائلی سرداروں کے درمیان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کے خلاف کوئی شرارت کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن جب 29 رجون کو پاکستان کے حق میں فیصلہ ہوگیا تو قاضی عیسیٰ دو ایک دن بعد کوئٹہ پہنچ گیا اور 2 رجولائی کو ایک بیان میں ریفرنڈم کے نتیجہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ”قائد اعظم اور اس صوبہ کے عوام نے آٹھ سال قبل مجھے جو کام سپرد کیا تھا وہ پورا ہوگیا ہے۔“

نواب محمد خان جوگیزئی نے 9 رجولائی کو صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے دوران بلوچستان کے ریفرنڈم کے نتیجے کے بارے میں ایک بیان دیا جس میں اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بلوچستان کے سارے پٹھانوں اور سرداروں نے متفقہ طور پر اسلامی سلطنت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے الزام عائد کیا کہ کانگرس اور دوسری مسلم دشمن جماعتوں نے ہم میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی تھی، ہمیں کروڑوں روپے پیش کئے گئے تھے اور آخر میں آزاد بلوچستان کی صورت میں ایک سازش بھی کی گئی تھی لیکن میری قیادت میں مسلم سرداران گمراہ نہ ہوئے اور انہوں نے ساری سازش کو ناکام کر دیا۔ ہمارے دشمن پاکستان کے نام سے ہی خوفزدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی اور طاقتور اسلامی سلطنت دی ہے۔ اب ہمارا حق اور فرض ہے کہ ہم اس کے ساتھ مل کر اسلام کی شان وشوکت دوبالا کریں۔ آزاد بلوچستان کا جھوٹا نعرہ بالکل ناکام ہوگیا ہے اور اب صوبہ سرحد میں ہمارے بھائیوں کو آزاد پٹھانستان کے نعرے سے ورغلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“[6] نواب جوگیزئی کے اس بیان میں اشارۃً خان آف قلات، غوث بخش بزنجو اور عبدالصمد اچکزئی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا کیونکہ 29 رجون کے ریفرنڈم سے پہلے ان ہی کی جانب سے آزاد بلوچستان کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ صوبہ سرحد میں 6 رجولائی سے لے کر 17 رجولائی تک کے ریفرنڈم سے پہلے آزاد پٹھانستان کا نعرہ خان عبدالغفار خان اور حکومت افغانستان نے لگایا تھا۔ حکومت افغانستان نے اس سلسلے میں حکومت ہندوستان کو جون کے دوسرے ہفتے میں ایک مراسلہ بھی بھیجا تھا جسے جولائی کے اوائل میں مسترد کر دیا گیا تھا۔ حکومت ہند نے اپنے جواب میں لکھا تھا کہ ”حکومت افغانستان کا یہ مراسلہ 1921ء کے انڈو......افغان معاہدے کی روح کے منافی ہے اور علاقائی تاریخی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔“[7] لیکن خان آف قلات پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنی آزاد وخود مختار بلوچ سلطنت کا خواب دیکھتا رہا۔

خان قلات کا آزادی وخودمختاری کا دعویٰ قائداعظم کے بیانات پر مبنی تھا

خان آف قلات کے اس عزم کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناح کا 17 رجون 1947ء کا بیان تھا جس میں والیان ریاست کے اس اختیار کوتسلیم کیا گیا تھا کہ وہ اپنی ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ کریں۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ ''آئینی وقانونی طور پر ہندوستان کی ریاستیں برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ختم ہوتے ہی پورے طور پر آزاد ہوں گی اور اس حیثیت سے ریاستوں کو آزادی ہوگی کہ وہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں شریک ہوں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کا فیصلہ کریں تو وہ نئے نظام میں اپنی مرضی کے مطابق از سر نو تعلقات و انتظام استوار کرسکتی ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی اس سلسلے میں پالیسی بالکل غیر مبہم رہی ہے یعنی یہ کہ ہم کسی ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیں گے اور ایسے مسائل والیان ریاست اور باشندگان ریاست کو ہی بذریعہ مباحثہ طے کرنے چاہئیں۔ اگر کوئی ریاست اس معاملے میں ہم سے مشورہ کرنا چاہتی ہے تو ہم بلاتوقف اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی ریاست پاکستان کے ساتھ تجارت اور اقتصادی امور کے بارے میں پاکستان کے ساتھ تعاون کر کے آزاد رہنے کی خواہاں ہے تو ہم اس سے بخوشی سیاسی گفت وشنید کر کے ایسا حل تلاش کریں گے جو دونوں کے لئے سودمند ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ وزارتی مشن کے 12 رمئی 1946ء کے میمورنڈم میں ہندوستانی ریاستوں کی پوزیشن کے بارے میں ملک معظم کی پالیسی بالکل واضح کردی گئی ہے۔ اس میمورنڈم میں کسی بھی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ ہندوستانی ریاستوں کو ہندوستان یا پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں سے کسی ایک میں ضرور شامل ہونا پڑے گا کہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست علیحدہ رہنا چاہتی ہے تو وہ کسی بھی حلقے کی جانب سے دباؤ کے بغیر ایسا کرسکتی ہے۔ خواہ یہ دباؤ برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے ہو یا اس ملک کی سیاسی جماعت کی طرف سے ہو۔ برطانوی حکومت نے ریاستوں کو واضح طور پر مطلع کردیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ ناقابل انتقال ہے۔ البتہ اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور اس طرح ریاستیں خود بخود آزاد ہوسکتی ہیں۔''[8] قائداعظم جناح کے اس تاریخی بیان کا مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد (دکن)، میسور، بھوپال اور ان دوسری بڑی ریاستوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ ہندوستانی یونین میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ لیکن یہ مقصد تو پورا نہ ہوا البتہ اس کی وجہ سے پاکستان کو بے پناہ

مشکلات اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔

خان قلات قائداعظم جناح کے 17 رجون کے اس بیان اور جولائی میں دیئے گئے اسی قسم کے بعض دوسرے بیانات کا سہارا لے کر نہ صرف اپنی ریاست کی آزادی وخودمختاری پر مصر تھا بلکہ وہ برطانوی بلوچستان کے مستجار علاقوں پر بھی اپنا حق ملکیت جتاتا تھا۔کوئٹہ پشین کے بارے میں اس کا مطالبہ اس قدر شدید تھا کہ 22 رجولائی کو ایک برطانوی نیوز ایجنسی گلوب کی خبر کے مطابق ''حکومت ہند ان دنوں ایک خصوصی کمیشن قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی تھی تا کہ بعض ریاستوں کے ان دعوؤں کا جائزہ لیا جائے جو مستجار علاقوں کے لئے کئے جا رہے تھے۔ریاست قلات کی حکومت کوئٹہ کا علاقہ واپس مانگتی ہے کیونکہ اس کا مؤقف یہ ہے کہ یہ علاقہ ایک نجی مسودے کے ذریعے برطانیہ کو پٹہ پر دیا تھا۔سکم اور کولہاپور کی ریاستیں بھی اس قسم کے دعوے کر رہی ہیں۔''[9]

اور اسی دن یہ خبر بھی آئی کہ لیگ ہائی کمان کوئٹہ کے علاقے کی آئینی اور قانونی پوزیشن کا جائزہ لے رہی ہے۔اس خبر میں کہا گیا تھا کہ ''کوئٹہ کی ریاست قلات کے ساتھ پوزیشن ایسی ہی ہے جیسے کہ ریاست حیدرآباد (دکن) کے ساتھ برار کے علاقے کی پوزیشن ہے۔کوئٹہ جو آج کل بلوچستان کا ہیڈکوارٹر ہے قلات کی ملکیت ہے اور یہ ایک معاہدہ کے تحت برطانوی ہندوستان کے علاقے کا حصہ ہے۔لیکن اب 15 راگست کو برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے خاتمہ پر کوئٹہ واپس ریاست قلات کی تحویل میں چلا جائے گا۔معلوم ہوا ہے کہ قائداعظم جناح کوئٹہ کے بارے میں معاہدے اور بلوچستان میں دوسرے قبائلی سرداروں سے کئے گئے سمجھوتوں کی آئینی پوزیشن کے بارے میں حکومت ہند کے محکمہ قانون سازی کے سیکرٹری سر جارج سپنس (George Spence) سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔قائداعظم نے کل اس سلسلے میں سر جارج سے ملاقات کی تھی۔اس امکان پر بھی غور کیا جا رہا ہے کہ فی الحال بلوچستان میں حالات کو جوں کا توں رکھا جائے۔''[10]

قائداعظم نے برطانوی بلوچستان اور بلوچ ریاستوں کو ختم کر کے اسے گورنری صوبہ بنانے کا عندیہ دے دیا

چند دن بعد لاہور کے اخبار ایسٹرن ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''لیگ ہائی کمان پورے بلوچستان کو ایک گورنری صوبہ بنانے کی تجویز بنانے پر غور کر رہی ہے۔آج وہاں مختلف

نوعیت کے انتظامی ڈھانچے ہیں، ان میں مرکزیت پیدا کر دی جائے گی تا کہ ترقی کی رفتار تیز ہو سکے۔ بلوچستان کی پسماندگی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج کل بھی وہاں کوئی روزانہ اخبار نہیں ہے۔ صوبہ پر ایجنٹ گورنر جنرل، قلات، خاران اور لس بیلہ کے خوانین اور شاہی جرگہ کی حکومت ہے۔ سب سے بڑی ریاست قلات ہے۔ اگر چہ یہ نیم آزادی کی دعویدار ہے لیکن دراصل ایک پولیٹیکل ایجنٹ کو جوابدہ ہے۔ نئے آئین کے نفاذ پر اس کے خود مختار ہونے کا امکان ہے۔ جہاں تک قلات کے خاران اور لس بیلہ پر اقتدار اعلیٰ کا تعلق ہے اسے ان دوسری ریاستوں کے حکمران تسلیم نہیں کرتے اور وہ اپنے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی یقین دہانی کے لئے برطانوی ریزیڈنٹ پر انحصار کرتے ہیں۔ بلوچستان کی حیثیت مغرب کی جانب ایک دروازے کی ہی ہے۔ اس علاقے کا مستقبل روشن ہے۔ اگر یہاں یکساں اور ترقی پسندانہ انتظامیہ قائم ہو تو یہ پاکستان کا ایک پھلتا پھولتا یونٹ بن سکتا ہے۔ لیگ ہائی کمان آج کل اس مسئلہ پر توجہ دے رہی ہے۔"[11]

ان ساری خبروں کی بنیاد یہ تھی کہ قائداعظم جناح نے 29 رجون کو برطانوی بلوچستان کے بارے میں ریفرنڈم کے چند دن بعد خان قلات کو ایک خط لکھا تھا کہ وہ اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنے کسی نمائندے کو دہلی بھیجے۔ چنانچہ خان کا چیف سیکرٹری جولائی کے دوسرے ہفتے میں دہلی آیا اور اس نے حکومت ہند کے محکمہ قانون کے سیکرٹری سر جارج سپنس سے بات چیت کی۔ پھر 22 رجون کو قائداعظم نے بھی سر جارج سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیالات کیا جس کے نتیجے میں 4 راگست کو ایک پانچ نکاتی اعلان جاری ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ (1) حکومت پاکستان تسلیم کرتی ہے کہ قلات ایک آزاد ریاست ہے جس کا درجہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت پاکستان قلات کے ساتھ ان تعلقات کی پابند ہے جن کا اظہار اس کے حکومت برطانیہ کے ساتھ کئی معاہدوں میں ہوتا ہے۔ (2) یہ معلوم کرنے کے لئے قانونی رائے حاصل کی جائے گی کہ حکومت پاکستان قانونی طور پر ان معاہدوں و سمجھوتوں کی پابند ہے یا نہیں جو قلات اور حکومت برطانیہ کے درمیان پہلے سے موجود ہیں۔ (3) ان نکات پر قانونی رائے حاصل کرنے کے بعد پاکستان کے نمائندوں اور قلات کے خان اعظم کے درمیان مزید بات چیت ہوگی۔ (4) دریں اثناء پاکستان اور قلات کے درمیان ایک معاہدہ جاریہ ہوگا جس کے تحت پاکستان ان تمام ذمہ داریوں اور سمجھوتوں کا پابند ہوگا۔ جو 1839ء سے لے

کر 1947ء تک قلات اور حکومت برطانیہ کے درمیان طے پائے تھے۔ مزید براں اس معاہدے کی رو سے پاکستان برطانیہ کا قانونی، آئینی اور سیاسی جانشین ہوگا۔ (5) قلات اور پاکستان کے درمیان دفاعی، خارجی اور مواصلاتی امور کے بارے میں تعلقات کی نوعیت قطعی طور پر طے کرنے کے لئے عنقریب کراچی میں مذاکرات ہوں گے۔"[12] اس اعلان پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، قائداعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خان، خان قلات، ریاست قلات کے قانونی مشیر سر سلطان احمد اور قلات کے وزیراعظم کے دستخط تھے۔ اگرچہ اس اعلان کی زبان خاصی مبہم تھی تاہم اس میں یہ بات واضح طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ پاکستان کو ریاست قلات کے بارے میں وہ تمام آئینی اور سیاسی حقوق حاصل ہوں گے جو حکومت برطانیہ کو حاصل تھے۔ بالفاظِ دیگر بلوچستان کے مستجار علاقے پاکستان کے زیر انتظام رہیں گے اور قلات کی حکومت پاکستان کے پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ لیکن خان قلات اس اعلان کی یہ تعبیر کرتا تھا کہ پاکستان نے اس اعلان کے تحت قلات کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کر لیا ہے۔ لہٰذا وہ پاکستان کے علاوہ کسی بھی ملک سے معاہداتی تعلقات قائم کر سکتا ہے۔ قبل ازیں وہ اپنے 3/اپریل 1947ء کے بیان میں اپنے اسی مؤقف کا اعلان کر چکا تھا۔

قیام پاکستان اور خان قلات کا اپنی ریاست کی آزادی اور خودمختاری کا اعلان

چنانچہ جب 14/اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس سے اگلے دن یعنی 15/اگست کو خان قلات نے اپنی آزادی و خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چمن کے ایک سابق پولیٹیکل ایجنٹ ڈوگلس فل (Douglas Fell) کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیا۔ اس انگریز وزیر خارجہ نے فوراً ہی نہ صرف پاکستان کے ساتھ مل کر برطانیہ اور ہندوستان کے ساتھ بھی معاہداتی تعلقات قائم کرنے کے لئے کاروائی شروع کر دی جبکہ خان آف قلات نے ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کو یہ خط لکھا کہ جس طرح پاکستان ریاست قلات کی آزادی و خودمختاری تسلیم کر چکا ہے۔ اسی طرح حکومت ہندوستان کو بھی قلات کی یہ نئی حیثیت تسلیم کر لینی چاہیے۔ خان قلات نے نہرو کو یہ خط اس حقیقت کے باوجود لکھا کہ 11/اگست 1947ء کو مشترکہ اعلان شائع کر دیا گیا تھا جس پر 4/اگست کو نئی دہلی میں دستخط ہوئے تھے اور جس کے تحت

پاکستان کو قانونی، آئینی اور سیاسی لحاظ سے برطانیہ کا جانشین یا وارث تسلیم کیا گیا تھا۔ جس دن یہ اعلان شائع کیا گیا تھا اسی دن پاکستان کے نامزد گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے ایک بیان میں بلوچستان اور ڈیرہ غازی خان کے قبائلیوں کو یقین دلایا تھا کہ بلوچستان میں اب تک جو قوانین رائج رہے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ ان کے رواج میں کوئی مداخلت نہیں ہو گی۔ تمام سمجھوتے قائم رہیں گے اور انہیں الاؤنس ملتے رہیں گے۔''[13]

قیام پاکستان کے بعد

باب: 5

نوآزاد پاکستان کے لئے بلوچستان کے مسائل

اور

خلیجی علاقے میں بڑی طاقتوں کی رسہ کشی

قیام پاکستان کے وقت بلوچستان اور قلات کی اندرونی صورت حال

14/ اگست 1947ء کو کراچی میں متحدہ ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی کے بعد پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو بالغ نظر سیاسی مبصرین کو یہ احساس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ صوبہ سندھ کی طرح بلوچستان بھی بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تضادات کا شکار ہے اور یہ کہ اس نوزائیدہ مملکت کے ارباب اقتدار کو اپنے اس پسماندہ ترین سرحدی علاقے کے داخلی و خارجی مسائل کو حل کرنے میں بے شمار مشکلات درپیش ہوں گی۔ اس علاقے کا ایک ریاستی حکمران، ہز ہائی نس میر حاجی سر احمد یار خان، جی۔سی۔آئی۔ای، بیگلر بیگی (پرنس آف پرنسز) امیر الامراء، غالب جنگ بہادر، خان معظم، خان بلوچ آف قلات، اعلانیہ طور پر شہنشاہی عزائم کا حامل تھا۔ وہ برصغیر سے برطانوی سامراج کی دستبرداری کے بعد پورے بلوچستان میں اپنی ایک آزاد و خودمختار سلطنت کا دعویدار تھا۔ وہ ازرہِ ''اسلامی اخوت'' پاکستان کے ساتھ محض ''معاہداتی تعلقات'' قائم کرنے پر تو تیار تھا لیکن وہ اس امر پر کسی صورت بھی آمادہ نہیں تھا کہ اس کی ''عظیم بلوچ سلطنت'' کا پاکستان کے ساتھ الحاق عمل میں آئے۔

''خان معظم'' کے اس شہنشاہی عزم کو اس حقیقت سے تقویت ملی تھی کہ ظہور پاکستان کے پہلے ہی دن سے کوئٹہ اور ''برطانوی بلوچستان'' کے بعض دوسرے شہروں میں ''ملکی'' اور ''غیر ملکی'' کے درمیان تضاد رونما ہو گیا تھا۔ اس تضاد کی بنیاد یہ تھی کہ برطانوی راج میں بلوچستان کی انتظامیہ اور تجارت پر سندھی ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور بیشتر شہری جائیدادیں بھی ان کی ملکیت تھیں۔ پنجاب کے مسلمان آبادکاروں اور مہاجرین کا خیال تھا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کے بعد وہ ''سچے مسلمانوں'' کی حیثیت سے بلوچستان کے مراعات یافتہ ہندو عناصر کے جانشین بننے کے حقدار ہیں جبکہ مقامی پٹھانوں اور بلوچوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوؤں کے ''مال غنیمت'' کے مستحق صرف وہی ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے کسی بھی شعبۂ زندگی میں پنجابی مسلمانوں کا غلبہ قابل قبول نہیں تھا۔ لیکن پنجابیوں کے غلبہ کے خلاف ان کا یہ خدشہ کئی وجوہ کی بنا پر کمزور تھا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ بلوچستان میں بڑے لسانی، نسلی اور ثقافتی گروہ...... بلوچی، بروہی، پٹھان اور سندھی...... آباد تھے۔ یہ چاروں گروہ صدیوں سے باہمی معاندانہ تضادات میں مبتلا تھے۔ اگر چہ یہ سب نظریاتی طور پر اسلامی اخوت و مساوات کے علمبردار تھے لیکن عملی طور پر ان میں کبھی بھی اتحاد، اتفاق اور اشتراک نہیں ہوا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ ان چاروں گروہوں کی معاشرت قبائلی تھی اس لئے ان میں قبائلی عصبیت کارفرما تھی اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کو اپنا دشمن تصور کرتا تھا۔ برطانوی سامراج نے سرداری نظام رائج کر کے بلوچستانی معاشرے کی اس دشمنانہ تقسیم در تقسیم کو بے انتہا مضبوط کر دیا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ بلوچستانی عوام میں اس لسانی، نسلی، ثقافتی اور قبائلی افتراق و انتشار کے باعث سیاسی شعور اور تنظیم کا فقدان تھا۔ قاضی عیسیٰ کی مسلم لیگ، عبدالصمد اچکزئی کی انجمن وطن اور غوث بخش بزنجو کی قلات نیشنل پارٹی کی حیثیت محض کاغذی تھی۔ ان جماعتوں کا غریب عوام الناس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراجیوں، قبائلی سرداروں اور ریاستی حکمرانوں نے بلوچستانی عوام کو دانستہ طور پر تعلیمی لحاظ سے بہت پسماندہ رکھا تھا۔ 1947ء میں 131855 مربع میل پر مشتمل پورے بلوچستان میں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا۔ تقریباً دس لاکھ کی آبادی میں تناسب خواندگی دس فیصد سے زیادہ نہیں تھا اور اس دس فیصد میں سے بھی بیشتر لوگ ایسے تھے جو برطانوی بلوچستان میں رہتے تھے۔ ریاستی علاقوں میں تناسب خواندگی پانچ فیصد اور قبائلی علاقوں میں تقریباً دو فیصد تھا۔ ان نام نہاد

خواندہ لوگوں میں بھاری اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو صرف قرآن شریف پڑھ سکتے تھے انہیں کسی بھی زبان میں لکھنا نہیں آتا تھا۔ پانچویں اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی سول انتظامیہ میں بلوچستانی عوام کی کوئی نمائندگی نہیں تھی اور فوج و پولیس میں بھی ان کی نمائندگی بہت ہی کم تھی۔ ان تینوں سرکاری شعبوں میں پنجابیوں کا غلبہ تھا۔

مزید براں سیاسی اور انتظامی لحاظ سے بلوچستان تین حصوں میں تقسیم تھا۔ پہلا حصہ برطانوی بلوچستان کہلاتا تھا۔ جس میں کوئٹہ، بولان، چمن، پشین، سبی، شاہرگ، ژوب، لورالائی، مری، بگٹی، سنجرانی اور خواجہ عمران کا 9476 مربع میل علاقہ شامل تھا۔ اس علاقے کے نظم ونسق کی ذمہ داری ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل (اے۔ جی۔ جی) پر عائد ہوتی تھی جسے چیف کمشنر بھی کہتے تھے۔ دوسرا حصہ ژوب، لورالائی، کوئٹہ، پشین، چاغی، خواجہ عمران اور سبی کے 44345 مربع میل قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا۔ جہاں پولیٹیکل ایجنٹس چیف کمشنر کی نگرانی میں پٹھان اور بلوچ قبائلی سرداروں کی وساطت سے امن و امان قائم رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لئے قبائلی سرداروں کو وظائف دیئے جاتے تھے اور ایک قبائلی لیویز فورس قائم کی گئی تھی۔ ان ایجنسی علاقوں میں کوئی برطانوی قانون رائج نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان میں سارے عدالتی فیصلے جرگہ سسٹم کے تحت مقامی رواج کے مطابق ہوتے تھے۔ جرگہ سسٹم کے چار مراحل تھے (1) لوکل جرگہ، (2) ڈسٹرکٹ جرگہ (3) جوائنٹ جرگہ اور (4) شاہی جرگہ، ان میں شاہی جرگہ سب سے بڑا جرگہ تھا جس کی حیثیت اس علاقے کی بااختیار پارلیمنٹ کی سی ہوتی تھی۔ اس جرگہ کا سال میں دو مرتبہ اجلاس ہوتا تھا اور صدارت کی فرائض خود اے۔ جی۔ جی ادا کرتا تھا۔ اجلاس میں ایک طرف پٹھان سرداروں کی نشستیں ہوتی تھیں اور دوسری طرف بلوچ سردار بیٹھتے تھے۔ شاہی جرگہ کا ہر فیصلہ متفقہ ہوتا تھا جس کی بنیاد رواجوں اور نظائر پر ہوتی تھی۔

تیسرا حصہ چار ریاستوں...... قلات، مکران، لس بیلہ، اور خاران...... کی فیڈریشن پر مشتمل تھا اور اس کا علاقہ 78634 مربع میل تھا۔ قلات کی ریاست سب سے بڑی تھی۔ اس کی آبادی تقریباً تین لاکھ تھی اور اس میں ساراوان، جھلاواں اور کچھی کے علاقے شامل تھے۔ ان علاقوں کے علاوہ مکران اور لس بیلہ میں بھی وسیع رقبہ جات خان قلات کی ملکیت تھے جنہیں نیابتیں کہا جاتا تھا۔ ریاست خاران کا حکمران نیم آزاد تھا اور اس پر خان قلات کی بالادستی برائے نام

تھی۔ اس ریاستی فیڈریشن کے قبائلی علاقوں کے سرداروں کے خان قلات کے ساتھ کنفیڈرل تعلقات تھے۔ جن کا عملی طور پر مطلب یہ تھا کہ سرداروں نے ویسے تو قلات کے ''خان معظم'' کے ساتھ وفاداری کا عہد کر رکھا تھا لیکن وہ اپنے قبائلی علاقوں کے داخلی معاملات میں ''خان معظم'' کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ خان ان سرداروں میں مسلسل پھوٹ ڈلوا کر ان پر اپنی سیاسی بالادستی قائم رکھتا تھا اور ان کے علاقوں میں واقع اپنی نیابتوں کا انتظام کرتا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لئے 1936ء میں ایک ''آئین'' بھی مرتب کیا تھا جس کے تحت دو ایوان...... دارالامراء اور دارالعوام قائم کئے گئے تھے۔ ان دونوں نام نہاد ایوانوں کی حیثیت دراصل ایک ریاستی شاہی جرگہ کی تھی جس کے ارکان کی کل تعداد 87 تھی۔ اس شاہی جرگے کے فیصلے بھی رواجوں اور نظائر کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ خان قلات کا یہ ''اصلاحی اقدام'' کوئی غیر معمولی نہیں تھا۔ 1935ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہندوستان کی متعدد بڑی ریاستوں میں ایسی ہی ''آئینی اصلاحات'' نافذ کی گئی تھیں۔ ان نام نہاد اصلاحات کا مقصد عوام الناس کو جمہوری حقوق دینا نہیں تھا بلکہ ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ یہ والیان ریاست 1935ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستان کے مجوزہ وفاق میں شامل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا قلیل المعیاد منصوبہ یہ تھا کہ ان ''اصلاحات'' کے پس پردہ ان کا استبدادی اقتدار قائم رہے اور ان کا طویل المعیاد منصوبہ یہ تھا کہ جب کبھی برطانیہ برصغیر سے دستبردار ہوگا تو وہ اپنی آزاد و خودمختار سلطنتیں قائم کریں گے۔

خان قلات کا پاکستان میں شمولیت سے انکار اور قائداعظم کی نرم روی

قلات کے ''خان معظم'' نے اسی منصوبہ کے تحت 15 راگست 1947ء کو یعنی قیام پاکستان کے اگلے دن اپنی مکمل آزادی و خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے اس اعلان کی پہلی بنیاد اس کے اس آئینی مؤقف پر تھی جو اس نے 1946ء میں اپنے آئینی مشیر قائداعظم محمد علی جناح کی وساطت سے برطانیہ کے وزارتی مشن کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس آئینی مؤقف کا خلاصہ یہ تھا کہ ''ریاست قلات ایک آزاد و خودمختار ریاست ہے۔ حکومت برطانیہ کے ساتھ اس کے تعلقات بعض معاہدات و سمجھوتوں کے ذریعے قائم ہوئے تھے۔ جب برصغیر میں برطانوی اقتدار ختم ہو جائے گا تو قلات کا حکومت برطانیہ کے ساتھ 1886ء کا معاہدہ بھی ختم ہو جائے گا۔ قلات کی اس معاہدہ

سے پہلے کی حالت آزادی مکمل طور پر بحال ہوجائے گی، مستجار علاقوں سے متعلق معاہدات بھی اپنا جواز کھودیں گے اور یہ علاقے خود بخود پھر حکومت قلات کی تحویل میں آجائیں گے''۔ [1]

دوسری بنیاد وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے 2رجون 1947ء کے اس بیان پر تھی کہ ''ریاستوں کی حیثیت آزاد مملکتوں کی تھی جنہوں نے برطانیہ کے ساتھ معاہدے کررکھے تھے۔ برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے اختتام پر یہ ریاستیں اپنی آزاد حیثیت اختیار کرلیں گی اور وہ قطعاً آزاد ہوں گی کہ ایک آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا دوسری میں یا کوئی اور بندوبست کریں۔'' [2]

تیسری بنیاد جون اور جولائی 1947ء میں قائداعظم جناح کے اس مضمون کے غیر مبہم بیانات پر تھی کہ ''قانونی پوزیشن یہ ہے کہ انگریزوں کی طرف سے انتقال اقتدار کے ساتھ ان کا اقتدار اعلیٰ ختم ہوجائے گا اور سب ریاستوں کی آزاد وخودمختار حیثیت ازخود بحال ہوجائے گی۔ لہٰذا ریاستوں کو آزادی ہے کہ وہ ایک ڈومینین میں شامل ہوں یا دوسری میں یا آزاد وخودمختار رہیں۔ مسلم لیگ ہر ریاست کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ مسلم لیگ کسی ریاست کو کوئی خاص راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔'' [3]

چوتھی بنیاد اس معاہدہ پر تھی جو 4راگست 1947ء کو حکومت پاکستان اور حکومت قلات کے درمیان نئی دہلی میں طے پایا تھا۔ اس معاہدہ پر قائداعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خان، احمد یار خان والئی قلات، حکومت قلات کے آئینی مشیر سر سلطان احمد کے علاوہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن اور اس کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے (Ismay) نے بھی دستخط کئے تھے۔ اس معاہدہ کا اعلان 11راگست 1947ء کو ہوا تھا اور اس کا پانچ نکاتی مضمون یہ تھا کہ (1) حکومت پاکستان اس رائے سے اتفاق کرتی ہے کہ قلات ایک آزاد ریاست ہے جس کا درجہ (Status) ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بالکل مختلف ہے اور وہ قلات اور حکومت برطانیہ کے درمیان ان تعلقات کی پابند ہے جن کا اظہار متعدد اقرارناموں میں ہوتا ہے۔ (2) یہ معلوم کرنے کے لئے قانونی رائے حاصل کی جائے گی کہ حکومت پاکستان ان اقرارناموں اور معاہدات کی قانونی طور پر پابند ہے یا نہیں جو حکومت برطانیہ اور قلات کے درمیان پہلے سے موجود ہیں۔ (3) جب ان نکات کے بارے میں قانونی رائے موصول ہوجائے گی تو اس کے بعد پاکستان اور قلات کے خان اعظم کے نمائندوں کے درمیان مزید مذاکرات ہوں گے۔ (4) دریں اثناء پاکستان اور قلات کے درمیان

ایک جوں کا توں(Still Stand)اقرارنامہ کیا جائے گا جس کے تحت پاکستان ان تمام ذمہ داریوں اور اقرارناموں کا پابند ہوگا جن پر قلات اور حکومت برطانیہ نے 1839ء سے لے کر 1947ء تک کے عرصے میں دستخط کئے ہوئے ہیں اور اس طرح پاکستان کو قانونی، آئینی اور سیاسی طور پر برطانیہ کی جانشینی حاصل ہوگی۔ (5) قلات اور پاکستان کے درمیان دفاع، خارجی تعلقات اور مواصلات کے امور پر قطعی بحث کے لئے عنقریب کراچی میں مذاکرات ہوں گے۔"[4]

خان قلات کے 15 راگست 1947ء کے اعلان آزادی سے پاکستان کے مسلم لیگی ارباب اقتدار کو خاصی پریشانی ہوئی۔ اس لئے کہ جب چار دن قبل 11 راگست کو متذکرہ اقرار نامے کا اعلان کیا گیا تو نیویارک ٹائمز نے اس کے بارے میں جو خبر شائع کی تھی اس میں لکھا تھا کہ ''پاکستان نے اس اقرارنامے کے تحت قلات کو ایک ایسی آزاد و خود مختار ریاست کے طور پر تسلیم کرلیا ہے جس کا درجہ دوسری ہندوستانی ریاستوں سے مختلف ہے۔'' اور اس سے اگلے دن لندن ٹائمز نے قلات اور مکران کی آزاد ریاستوں کا نقشہ شائع کیا تھا۔[5] مزید براں خود خان قلات کا مؤقف یہ تھا کہ ریاست قلات کی حیثیت ریاست نیپال کی سی ہے۔ یہ دونوں ریاستیں کبھی بھی برطانیہ کی سلطنت کا حصہ نہیں بنی تھیں۔ بلکہ ان کے برطانیہ کے ساتھ تعلقات دوستانہ معاہدات پر قائم تھے۔ قلات کو جغرافیائی محل وقوع اور سرحدی اہمیت کے سبب ''بفر اسٹیٹ'' کی حیثیت حاصل تھی۔ قلات اور نیپال ہی دو ایسی ریاستیں تھیں جن کو سفیر رکھنے کی اجازت تھی اور جن کے تعلقات بین الاقوامی سطح پر دیگر ممالک کے ساتھ بھی تھے۔[6] وہ اپریل 1946ء میں برطانیہ کے وزارتی مشن کی آمد کے بعد سے اعلانیہ طور پر یہ دعویٰ کرتا چلا آ رہا تھا کہ چونکہ برصغیر میں برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے اختتام پر تمام معاہدے غیر مؤثر ہو جائیں گے اس لئے کوئٹہ، پشین، سبی اور نصیر آباد کے علاوہ برطانوی بلوچستان کے سارے علاقے ازخود حکومت قلات کی تحویل میں آ جائیں گے۔ حتیٰ کہ وہ پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان پر بھی اپنا حق جتاتا تھا اور اس حق کی تائید اپنے جد امجد نصیر خان نوری کی اس روایت سے کرتا تھا کہ ''جہاں تک بلوچ آباد ہیں وہاں تک ہماری بلوچی مملکت کی سرحدیں ہیں۔''

بایں ہمہ حکومت پاکستان نے خان قلات کے اس اعلان آزادی پر فوری طور پر سخت ردعمل کا اظہار نہ کیا حالانکہ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق خان نے ''ایک انگریز ڈگلس فل کو

بطور ''وزیر خارجہ'' ملازم رکھ لیا تھا۔ اس ''وزیر خارجہ'' نے غیر ملکی تیل کمپنیوں سے تیل کی تلاش کے سلسلے میں بات چیت شروع کر رکھی تھی۔ شاید وہ ان کمپنیوں کی وساطت سے بیرونی اعانت کا بھی طلب گار تھا اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ خان قلات کے بھائی اور چچا نے کابل سے مدد مانگی تھی۔''
حکومت کی اس بظاہر خاموشی یا بے عملی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چونکہ خان قلات کا یہ اعلان قائداعظم جناح کے ریاستوں کے بارے میں دیئے گئے بیانات کے عین مطابق تھا اس لئے ان بیانات سے اتنی جلدی انحراف کر کے اس کے خلاف فوراً ہی کوئی کارروائی کرنا مناسب نہیں تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ریاست حیدر آباد (دکن) اور ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ چونکہ قائداعظم جناح کو امید تھی کہ ہندو اکثریت پر مشتمل ریاست حیدر آباد (دکن) کا مسلمان حکمران حکومت برطانیہ اور حکومت ہندوستان سے اپنی آزادی وخودمختاری تسلیم کروانے میں کامیاب ہو جائے گا اور مسلم اکثریت پر مشتمل ریاست جموں وکشمیر اپنے ہندو حکمرانوں کی خواہش اور کوشش کے برعکس پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آ گرے گی، اس لئے وہ قلات کے خلاف فوراً کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے جو ان دونوں ریاستوں کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ اگست 1947ء میں سوویت یونین اور اینگلو۔امریکی سامراج کے درمیان عالمی سطح پر سرد جنگ زور شور سے شروع ہو چکی تھی اور اس سرد جنگ کا ایک بڑا مرکز خلیج فارس کا علاقہ تھا۔ تیل کی دولت سے مالا مال اس علاقے میں بڑی طاقتوں کے درمیان اس کشیدگی کا پس منظر یہ تھا کہ جب 5/مارچ 1946ء کو برطانیہ کے جنگ باز وزیراعظم ونسٹن چرچل نے امریکہ میں فلٹن کے مقام پر سوویت یونین کے عالمی گھیراؤ کی تجویز پیش کی تھی تو اس وقت ماسکو میں ایران اور سوویت یونین کے نمائندوں کے درمیان اس تجویز پر بات چیت ہو رہی تھی کہ ایران اور سوویت یونین کی ایک مشترکہ کمپنی کی تشکیل کی جائے گی جو شمالی ایران میں تیل کے ذرائع کو ترقی دے گی۔ اس بات چیت کے نتیجے میں 6/اپریل کو دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی ایک اہم شق یہ تھی کہ اس کمپنی میں پہلے 25 سال کے دوران سوویت یونین کے حصص 51% فیصد ہوں گے اور جب یہ مدت گزر جائے گی تو دونوں ملک پچاس پچاس فیصد کے مالک ہوں گے۔ دوسری اہم شق یہ تھی کہ پچاس سال کے بعد حکومت ایران اس کمپنی

کے سو فیصد حصص خریدنے کی حقدار ہوگی اور تیسری شق یہ تھی کہ اس معاہدے کے سات ماہ کے اندر ایران کی مجلس سے توثیق کرائی جائے گی۔ سوویت یونین نے یہ معاہدہ اس لئے کیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران باکو میں اس کے اپنے تیل کے چشموں کو سخت نقصان پہنچا تھا اور وہ اس نقصان کی تلافی ایران کے ساتھ اشتراک عمل سے کرنا چاہتا تھا۔ اسے ملک کی تعمیر نو کے لئے تیل کی سخت ضرورت تھی۔ مگر اینگلو۔ امریکی سامراج کے لئے یہ معاہدہ نا قابل برداشت تھا۔ اسے ایک خطرہ تو یہ تھا کہ اگر سوویت یونین اور ایران کے درمیان اس معاہدے پر عمل ہوا تو حکومت ایران برطانیہ اور ایران کی مشترکہ اینگلو۔ ایرانین کمپنی کی شرائط بھی از سر نو طے کرنے کا مطالبہ کرے گی۔ پرانی شرائط کے تحت یہ کمپنی ایران کو صرف 20 فیصد منافع دیتی تھی۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ مجوزہ سوویت ایرانین آئل کمپنی کے ایرانی مزدوروں کی تنخواہیں اور دوسری سہولتیں بہتر ہوئیں تو اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کے ایرانی مزدور بھی اپنی شرائط ملازمت کو بہتر کرنے کے لئے ایجی ٹیشن کریں گے اور تیسرا خطرہ یہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ نے سعودی عرب، عراق، کویت اور دوسرے عرب ممالک میں جو مشترکہ آئل کمپنیاں قائم کر رکھی ہیں ان کے منافعوں پر بھی برا اثر پڑے گا۔ کیونکہ ان ممالک کی حکومتیں بھی زود یا بدیر ایسی ہی شرائط کا مطالبہ کریں گی جیسی کہ سوویت یونین اور ایران میں طے پا چکی تھیں۔ اینگلو۔ امریکی سامراج نے ان سنگین خطرات کے پیش نظر ایران میں احمد قوام السلطنت کی حکومت پر زبردست دباؤ ڈالا۔ برطانیہ نے اس مقصد کے لئے جولائی 1946ء میں اپنے تین جنگی جہاز خلیج فارس کے ایرانی سمندر میں بھیجے تھے اور پھر عرب قبائلیوں سے حکومت ایران کے خلاف بغاوت بھی کرائی تھی۔ تہران کے روزنامہ ''رہبر'' کی اطلاع کے مطابق ایک انگریز فوجی افسر کرنل انڈر روڈ (Underwood) نے قبائلی سرداروں کو بغاوت کی ترغیب دینے کے لئے نہ صرف اسلحہ مہیا کیا تھا بلکہ انہیں رشوت بھی دی تھی۔ نتیجتاً سات ماہ کی مقررہ مدت میں مجلس سے اس معاہدہ کی توثیق نہ کرائی گئی۔ جب اگست 1947ء میں نئی ایرانی مجلس وجود میں آنے کے فوراً بعد سوویت یونین نے حکومت ایران سے مطالبہ کیا کہ متذکرہ معاہدہ کی توثیق کرائی جائے تو اس پر برطانیہ اور امریکہ کے اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ نے بہت شور مچایا اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگرچہ سوویت یونین نے مئی 1946ء میں اپنی فوجیں آذربائیجان سے نکال لی تھیں لیکن اب وہ پھر شمالی ایران میں مشترکہ آئل کمپنی کی آڑ

میں اپنا غلبہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جب 15 راگست کو خان آف قلات نے اپنی ریاست کی مکمل آزادی وخودمختاری کا اعلان کیا تھا، اس دن پاکستان اور ساری غیر اشترا کی دنیا کے اخبارات اس مضمون کی خبروں سے بھرے پڑے تھے اور یہ افواہیں بھی گشت کر رہی تھیں کہ قلات کے فرمانروا کا وزیر خارجہ ڈوگلس فل بلوچستان میں تیل کی تلاش کے لئے بعض مغربی آئل کمپنیوں سے بات چیت کر رہا ہے۔

ایسے حالات میں حکومت پاکستان خان قلات کے خلاف فوری طور پر کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنا چاہتی تھی جو بلوچستان کے سرحدی علاقے میں عدم استحکام کا باعث بن سکتی تھی۔ حکومت پاکستان کی پریشانی اس لئے بھی ناگزیر تھی اور اس کی یہ بے عملی اس لئے بھی ضروری تھی کہ افغانستان کے ارباب اقتدار نے پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ صوبہ سرحد کے علاوہ بلوچستان کے وسیع علاقوں پر بھی اپنا حق جتاتے تھے جبکہ خان قلات کا دعویٰ یہ تھا کہ ''15 رگست 1947ء کو ریاست قلات کی وہ خودمختار حیثیت بحال ہوگئی ہے جو اسے 1838ء میں حاصل تھی اور جس کے تحت اس کے افغانستان کے ساتھ حلیفانہ تعلقات تھے۔ اگر قلات اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار نہ ہوئے تو ریاست قلات افغانستان میں شامل ہوسکتی ہے۔''[7]

کوئٹہ میں ہندو۔مسلم فساد اور مقامی وغیر مقامی تضاد میں شدت

خان قلات کے پریشان کن اعلان آزادی کو ابھی چار پانچ دن ہی گزرے تھے کہ کوئٹہ میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے حکومت پاکستان کی بلوچستان کے بارے میں پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ یہ افسوس ناک واقعہ 20 راگست کو پہلے ''ملکی'' اور ''غیر ملکی'' کے درمیان فساد اور پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد کی صورت میں رونما ہوا جس میں لاہور کے اخبار ایسٹرن ٹائمز کی 22 راگست کی اطلاع کے مطابق 30 افراد ہلاک اور 40 زخمی ہوئے۔ آتش زنی اور لوٹ مار کی وسیع پیمانے پر وارداتیں ہوئیں اور اس بنا پر صورت حال اتنی بگڑ گئی کہ سول انتظامیہ کو امن و امان بحال کرنے کے لئے فوج کی امداد طلب کرنا پڑی۔ روزنامہ نوائے وقت کی اس واقعہ کے بارے میں خبر یہ تھی کہ ''حالات مایوس کن ہیں۔ کل چار بجے سے کرفیو نافذ ہے اور ملٹری سڑکوں پر گشت کر رہی ہے۔ بدھ کی رات (20 اگست) کچھ پٹھانوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان

ایک مسجد میں جھنڈا لگانے کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ یہ جھگڑا بعد میں فساد کی صورت اختیار کر گیا اور لوٹ مار اور آتشزدگی وسیع پیمانے پر سارے شہر میں پھیل گئی جس سے شہر کے بہت سے علاقے متاثر ہوئے۔ تین سینماؤں کی عمارتیں جلا کر خاک کر دی گئیں۔ اموات کی تعداد پچاس تک پہنچ چکی ہے۔ کراچی سے دو ہوائی جہاز اقلیت کے کچھ لوگوں کو لانے کے لئے حاصل کر لئے گئے ہیں۔''[8] اس فساد میں نہ صرف مسلمان پنجابی مہاجرین اور مقامی پٹھانوں کے ہاتھوں ہندوؤں کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا بلکہ ''ملکی'' پٹھانوں کے ہاتھوں ''غیر ملکی'' مہاجرین اور پرانے آباد کاروں کی بھی کچھ خونریزی ہوئی۔

جب یہ اطلاع کراچی پہنچی تو پاکستان کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر اور سندھ ایریا کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل اکبر خان فوراً کوئٹہ پہنچے۔ وہ تین دن تک کوئٹہ میں صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد 25 / اگست کو واپس کراچی پہنچے تو ضلع جہلم کے رہنے والے پنجابی جنرل اکبر خان نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ''بلوچستان میں اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت کے لئے ہر ضروری کاروائی کی گئی ہے۔ تقریباً ایک سو ایسے سرداروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے جن پر لوگوں کو اشتعال دلانے کا الزام ہے۔ رفیوجی کیمپوں میں 15000 پناہ گزینوں کو مفت دودھ اور راشن مہیا کیا جا رہا ہے۔''

29 اگست کو کوئٹہ میں ''برطانوی بلوچستان'' کی انتظامیہ کے پبلسٹی آفیسر نے اعلان کیا کہ ''کوئٹہ اور اس کے گردونواح کے دیہات میں بالکل امن و امان ہے۔ چھ روز سے کہیں بھی کوئی فرقہ وارانہ واردات نہیں ہوئی۔ سارے تجارتی مراکز کھل گئے ہیں اور سرکاری دفاتر میں معمول کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ ملیشیا، ملٹری اور پولیس کے دستے وسیع پیمانے پر چھاپے مار رہے ہیں۔ سکاؤٹ دستوں نے گلستان میں کامیاب چھاپے مارے ہیں اور بہت سا لوٹا ہوا مال برآمد کر لیا ہے۔ آٹھ لٹیرے گرفتار ہوئے ہیں۔ کرفیو کے اوقات میں کمی کر دی گئی ہے۔'' اور اسی دن کراچی سے یہ خبر جاری ہوئی کہ ''بلوچستان کو بہت جلد گورنری کا صوبہ بنا دیا جائے گا اور وہاں نمائندہ صوبائی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ ایجنٹ ٹو گورنر جنرل کو گورنر بنا دیا جائے گا اور رائے عامہ کے کسی نمائندے کو ان کا وزیر مقرر کر دیا جائے گا۔ سردست اس صوبہ میں کوئی انتخاب نہیں ہو گا مگر جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بلوچستان کے

لئے آئین مرتب کر لے گی تو وہاں پہلے عام انتخابات ہوں گے۔''[9] یہ خبر پاکستانی اخبارات میں 2 ستمبر کو شائع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی تہران سے موصول شدہ یہ خبر بھی موجود تھی کہ ''ایران کی نئی قومی مجلس نے 71 سالہ قوام السلطنت کو از سر نو وزیر اعظم منتخب کر لیا ہے۔ آقائے قوام ایک بڑا زمیندار ہے اور اس کی نئی حکومت کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ایران اور سوویت یونین کی مشترکہ آئل کمپنی بنانے کے بارے میں 6 اپریل کو جو معاہدہ ہوا تھا اس کی نو منتخب قومی مجلس سے توثیق کرائی جائے۔ اس معاہدے کی ایک شق کے مطابق اس کی توثیق اکتوبر 1946ء کے اواخر تک ہو جانی چاہیے تھی۔'' سیاسی مبصرین نے ان دونوں خبروں کو ایک ساتھ پڑھا تو انہیں یہ تاثر ملا کہ ایران کے حالات بلوچستان کے سرحدی علاقے کے بارے میں حکومت پاکستان کی پالیسی کو متاثر کر رہے ہیں۔

بظاہر اس وقت تک پاکستان کے ارباب اقتدار کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ اس علاقے میں امن و امان قائم رہے اور مقامی عوام کے کسی حلقے میں عدم اطمینان کے باعث سیاسی استحکام کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ غالباً اسی وجہ سے 5 ستمبر کو کراچی میں سرکاری طور پر میجر جنرل اکبر خان کے 25 اگست کے اس بیان کی تردید کر دی گئی کہ ''ایک سو قبائلی سرداروں کو اشتعال انگیزی کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔'' سرکاری تردیدی اعلان میں بتایا گیا کہ ''سرداروں نے بلوچستان میں امن قائم کرنے کے لئے حکام کو پوری مدد پہنچائی ہے۔'' اس سے اگلے دن کوئٹہ میں ایجنٹ ٹو گورنر جنرل جیفرے پرائر نے بھی ایک طویل بیان میں سرداروں، ملکوں اور سرکاری حکام کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے بلوچستان میں فرقہ وارانہ امن و امان بحال کرنے میں مدد دی تھی۔ سر جیفرے نے 20 اگست اور اس کے دو تین دن بعد کے فسادات کی ساری ذمہ داری مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجرین اور آبادکاروں پر عائد کی اور کہا کہ ''یہ لوگ یہاں کے اقلیتی فرقہ کو بے دخل کر کے اس کے سالہا سال کے قائم کردہ کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا رویہ ایسے گدھوں جیسا ہے جو کسی جانور کی لاش کو نوچنے کے لئے اس کے مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں کہ اگر کاروباری عناصر کو یہاں سے زبردستی نکال دیا گیا تو ساری تجارت ٹھپ ہو جائے گی اور اس طرح مقامی معیشت کو بے پناہ نقصان پہنچے گا...... ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل کے اعلان کے مطابق آئندہ بلوچستان میں بہر قیمت فرقہ وارانہ امن و امان برقرار رکھا

جائے گا۔فوج کی طرح ملیشیا، پولیس اور لیویز کو بھی یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص آتشزدگی یا تشدد کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اسے فوراً گولی ماردی جائے جو حکام اس حکم کی تعمیل نہیں کریں گے انہیں تبدیل کردیا جائے گا۔''[10]

سر جیفرے پرائر کا یہ بیان ان پنجابی عناصر کے لئے نا قابل برداشت تھا جو پورے پاکستان کو ایک پنجابی سلطنت بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے اور یہ بیان یو۔پی، دہلی، حیدرآباد (دکن)، بمبئی اور کلکتہ وغیرہ سے آنے والے ان مہاجر عناصر کے لئے بھی قابل قبول نہیں تھا جو پورے پاکستان میں اپنا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی غلبہ قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ چنانچہ لاہور اور کراچی کے اخبارات میں بلوچستان کے اس انگریز منتظم اعلیٰ کی ہندونوازی کے خلاف شدید احتجاج ہوا۔ 13 ستمبر کے پاکستان ٹائمز میں اس سلسلے میں کوئٹہ کے ایک پنجابی آبادکار رفیق احمد کا ایک خط شائع ہوا جس میں یہ الزام لگایا گیا کہ ''حالیہ فسادات کی تحقیقات کا کام ایسے غیر مسلم افسروں کے سپرد کیا گیا ہے جن سے انصاف کی توقع نہیں اور مقامی انتظامیہ ایسے غیر مسلموں کو اسلحہ کے لائسنس جاری کر رہی ہے جو ترک وطن کر کے ہندوستان جا رہے ہیں۔''

19 ستمبر کے نوائے وقت میں ایک گمنام شخص کا طویل خط شائع ہوا جس میں بلوچستان کی انتظامیہ کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھا گیا کہ ''ہماری ہائی کمانڈ نے بلوچستان کے نظام میں جزوی تبدیلی بھی کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ جھنڈا ضرور بدل گیا ہے لیکن ہر محکمے میں بنیادی کرسیاں، انگریزوں، سکھوں اور ہندوؤں کو ہی حاصل ہیں اور اگر کوئی جگہ مسلمان کے حصے میں آئی بھی ہے تو اللہ کے فضل سے وہ مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے علاوہ اور کچھ کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ مثلاً پولیٹیکل ایجنٹ کوئٹہ ہی کو لیجئے۔ جس دن سے تشریف لائے ہیں سٹی مجسٹریٹ کوئٹہ (جو کہ ہندو ہے) کے اشارے کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ بحیثیت مجموعی یہاں کی حکومت میں مسلمان صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ یقین جانیے اگر یہی لیل ونہار رہے تو چندروز میں ہی ایسے حالات رونما ہوجائیں گے جن پر قابو پانے کے لئے بہت بڑی قربانیاں دینی پڑیں گی......انگریز یہ بھی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم غیر مسلم کے بعد اب یہاں ملکی اور غیر ملکی کے سوال پر باہم مسلمانوں میں کشت وخون ہو۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لئے کانگرس پرست لیڈر اور حکام آپس میں مشورے کرتے ہیں اور ہر صبح کو ایسی افواہیں ہر جگہ مشہور کی جاتی ہیں جن

سے مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں۔ اس سلسلے میں آج ایک بڑی چال چلی گئی ہے اور اگر ہم لوگ پورے طور پر ہوشیار نہ ہوتے تو یقیناً بھائی بھائی کا گلا کاٹنے میں کوئی تکلف نہ کرتا۔ وہ چال یہ تھی کہ لڑکیوں اور لڑکوں کے تمام سکول کھلنے کے دو گھنٹے بعد سٹی مجسٹریٹ نے (جو ہندو ہے) یہ کہہ کر بند کرا دیئے کہ بلوچستان اور پنجاب دونوں کا جھگڑا ہونے والا ہے۔ لہٰذا سب طالب علم اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ ظاہر ہے کہ خوف و ہراس اور بداعتمادی پھیلانے کا اس سے بہتر ذریعہ ممکن نہ تھا اور لڑکوں اور لڑکیوں نے سکولوں سے نکلتے ہی جو قیامت برپا کی اس کا اندازہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ جتنے سکھ اور ہندو ملازم ہیں وہ بھی مسلمانوں کو باہم لڑانے کی مہم میں انگریزوں اور کانگرسیوں کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں۔ کوئٹہ میں 20 راگست کو فساد ہوا۔ تین دن سلسلہ جاری رہا۔ چوتھے دن بالکل امن ہو گیا۔ اس وقت سے تا دم تحریر کسی ہندو یا سکھ کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ لیکن کرفیو آرڈر کی لعنت ابھی تک شہریوں پر مسلط ہے۔ صرف اس لئے کہ عوام کو کرفیو کا وقت شروع ہوتے ہی گلیوں اور دروازوں سے اور بعض کو ان کے گھروں میں سے بلا کر گرفتار کیا جائے اور خوب جرمانے کئے جائیں۔ یہ گرفتار ہونے والے سو فیصدی مسلمان ہوتے ہیں۔ اس ظلم بے جا سے تمام مسلمان بہت پریشان ہیں اور اس ''پکڑ دھکڑ'' سے مسلم لیگ کے مخالف اور پاکستان گورنمنٹ کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا ہو رہا ہے۔ شہر میں ہلڑ فرو کرنے کے لئے جو فوج مقرر کی گئی تھی اس میں سب ڈوگرہ اور سکھ سپاہی تھے۔ جنہوں نے اندھا دھند مسلمانوں کو قتل کیا...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سردار پٹیل کے چچا کی حکومت قائم ہے۔ یہاں کے انگریز اور ہندو آفیسر قبائلیوں کو برابر بھڑکا رہے ہیں کہ وہ یہاں کوئی ہنگامہ برپا کریں تو وہ اچھی شرائط پر پاکستان گورنمنٹ سے نئے معاہدے کروا دیں گے۔ اس سلسلے میں قبائلی سرداروں سے گراں قدر رقمیں اور رشوت وصول کر رہے ہیں۔ خلاصۂ کلام اگر دو ہفتے بھی بلوچستان میں یہ انگریز، ہندو اور سکھ شاہی باقی رہی تو نصیب دشمناں یہاں کے مسلمان آپس میں لڑ بھڑ کر تباہ ہو جائیں گے...... آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر پنجابی اور پٹھان کے سوال پر ایک قتل بھی ہو گیا تو یہ آگ بجھائے نہ بجھے گی۔ لہٰذا آپ ارباب حل و عقد کی توجہ جلد از جلد بلوچستان کی طرف منعطف کرائیں۔ میری رائے میں بلوچستان کو خلفشار سے بچانے کے لئے حسب ذیل تدبیریں کارگر ہو سکتی ہیں۔

(1) ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل اور اس کے سیکرٹری بیکن کو (جو سخت مسلم دشمن ہے) اور ہندو نواز

سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سکاٹ (جس نے موجودہ بلوے میں بہت سے مسلمان گولی سے اڑا دیئے) اور اس وقت بھی مسلمانوں کے لئے عذاب بنا ہوا ہے۔ان سب کو برخاست کر دیا جائے اور ان کی جگہ دلیر اور تجربہ کار مسلمانوں کو لگایا جائے۔(2) سٹی مجسٹریٹ کو فوراً تبدیل کیا جائے۔ (3) پولیٹیکل ایجنٹ کو (جو مسلمان ہے(تبدیل کیا جائے اور اس کی جگہ کسی سچے مسلمان کو لگایا جائے۔(4) کانگرسی ایجنٹوں مثلاً عبدالصمد وغیرہ کو فوراً گرفتار کر کے صوبے سے باہر کہیں بند کر دیا جائے۔ (5) مسلم لیگ کے سر برآوردہ کارکنوں کو حکومت میں ذمہ دارانہ جگہیں دی جائیں ......اگر کارکنان مسلم لیگ میں سے بعض افراد جلد از جلد حاکمانہ اقتدار کے ساتھ یہاں کے عوام کے سامنے نہیں آئیں گے تو مسلم لیگ تباہ ہو جائے گی۔ (6) پیر آف مانکی شریف، سردار عبدالرب نشتر اور راجہ غضنفر علی خان صاحب فوراً بلوچستان کا دورہ کریں۔"[11]

جس دن نوائے وقت میں یہ خط شائع ہوا اسی دن کراچی کے روزنامہ "ڈان" نے بھی بلوچستان میں روز افزوں صوبائی تنگ نظری اور یکسوئیت پر سخت تشویش کا اظہار کیا اور الزام عائد کیا کہ وہاں بعض شر پسند عناصر "ملکی" اور "غیر ملکی" کے مسئلہ پر جھگڑا کروانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں...... قائداعظم کے انتباہ کے باوجود جو لوگ صوبائی تعصب کی بنا پر مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کر رہے ہیں وہ قوم و ملک کے دشمن ہیں اور ان کی اس طرح مذمت کرنی چاہیے جس طرح کہ ان لوگوں کی مذمت کی جاتی ہے جو بم بناتے ہیں اور سازشی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر صوبائیت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے ان لوگوں سے سختی سے نمٹنا چاہیے تاکہ یہ فتنہ پھیلنے نہ پائے۔ پاکستان کے ہر شہری کو یہ احساس ہونا چاہیے یا ضروری ہو تو اسے احساس دلانا چاہیے کہ اس کا نعرہ "پاکستان پاکستانیوں کے لئے ہے" ہونا چاہیے نہ کہ "بلوچستان بلوچستانیوں کے لئے" یا "سندھ سندھیوں کے لئے۔" ان داخلی دشمنوں کی شرانگیزی کی صلاحیت کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی ان کی انتشار انگیز سرگرمیوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔"[12]

بلوچستان کی انتظامیہ نے اس قسم کے تنقیدی تبصروں کے پیش نظر روزنامہ "ڈان" کے خلاف تو کوئی کارروائی نہ کی البتہ اس نے "نوائے وقت" کے 19 رستمبر کے شمارے کو ضبط کر لیا۔اس کارروائی کی وجہ بالکل عیاں تھی۔نوائے وقت میں شائع شدہ متذکرہ خط میں غیر مبہم طور پر یہ الزام

عائد کیا گیا تھا کہ بلوچستان میں پٹھانوں اور پنجابیوں کے درمیان کشیدگی کی ذمہ داری سر جیفرے پرائر کی ''ہندو نواز'' انتظامیہ پر عائد کی گئی تھی اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ نہ صرف سر جیفرے اور دوسرے انگریز افسروں کی جگہ ''دلیر اور تجربہ کار مسلمانوں'' (یعنی پنجابیوں کو) لگایا جائے بلکہ مسلمان پولیٹیکل ایجنٹ کی جگہ کسی سچے مسلمان کا (یعنی کسی پنجابی کا) تقرر کیا جائے۔ موجودہ پولیٹیکل ایجنٹ اے۔آر۔خان کا تقرر ستمبر کے اوائل میں ہوا تھا۔ یہ انڈین سول سروس کا افسر تھا اور قیام پاکستان سے قبل حکومت بمبئی کے محکمہ قانون میں جائنٹ سیکرٹری تھا۔ تاہم نوائے وقت کے مراسلہ نگار کی رائے میں محض نام کا مسلمان تھا۔ یہ سچا مسلمان نہیں تھا کیونکہ یہ ''کوئٹہ کے ہندو سٹی مجسٹریٹ کے اشارے کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔'' نوائے وقت اور اس کے مراسلہ نگار کا مؤقف یہ تھا کہ بلوچستان میں پٹھانوں اور پنجابیوں کے درمیان تضاد کی کوئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی بنیاد نہیں ہے بلکہ یہ تضاد سراسر مصنوعی ہے اور اسے انگریزوں، ہندوؤں، سکھوں اور عبدالصمد جیسے کانگرسی مسلمانوں نے محض پاکستان اور مسلم دشمنی کی وجہ سے پیدا کیا ہے اور اس کا حل یہ ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی جگہ دلیر، تجربہ کار اور سچے مسلمان افسروں کا تقرر کیا جائے۔ یہ مؤقف انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت کے اس دیرینہ مؤقف سے مختلف نہیں تھا کہ برصغیر میں ہندو مسلم تضاد کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ یہ محض انگریزوں کا پیدا کردہ ہے اور اسے ''سیکولر'' انڈین نیشنلزم کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم واقعات نے یہ ثابت کیا کہ نہ تو متحدہ ہندوستان کی انڈین نیشنل کانگرس کا پرانا مؤقف بالکل صحیح تھا اور نہ ہی پاکستان میں نوائے وقت اور اس کے ہم خیال ''اسلام پسندوں'' کا نیا مؤقف سراسر صحیح تھا۔ بلوچستان میں پٹھانوں اور پنجابیوں کے درمیان تنازعہ بالکل مصنوعی نہیں تھا۔ اس تنازعہ کی ٹھوس بنیاد یہ تھی کہ ایک طرف تو بلوچستانی پٹھان، جو بلوچیوں کے مقابلے میں نسبتاً ترقی یافتہ تھے، بلوچستان میں اپنا سیاسی، معاشرتی اور معاشی غلبہ قائم کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف پنجابی آبادکار اور مہاجرین، جو بلوچستانی پٹھانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھے، اسی قسم کا عزم رکھتے تھے۔ بلوچستانی پٹھان اپنے مقصد کی تکمیل انگریز اور ہندو افسروں کی امداد سے کرنا چاہتے تھے جبکہ پنجابی عناصر اپنا نصب العین انگریزوں اور ہندوؤں کو بے دخل کر کے پورا کرنے کے متمنی تھے۔ پٹھانوں اور پنجابیوں کے درمیان رسہ کشی میں سر جیفرے پرائر کی انتظامیہ کی ہندو نوازی قائداعظم جناح کی

11 راگست 1947ء کی اس پالیسی تقریر کے عین مطابق تھی جس میں پاکستان کی سیاست کو مذہب سے الگ قرار دے کر اقلیتوں کو مساوی حقوق کا یقین دلایا گیا تھا اور سر جیفرے کی پٹھان نوازی بھی حکومت پاکستان کی اس پالیسی کے مطابق تھی کہ خلیج فارس کے علاقے میں بڑی طاقتوں کے درمیان رقابت کے پیش نظر بلوچستان میں بہر قیمت امن وامان قائم رکھنا چاہیے۔ قائداعظم جناح نے اپنی اسی پالیسی کے تحت 10 راگست کو بلوچستانی قبائلیوں کے نام ایک پیغام میں انہیں یقین دلایا تھا کہ انھوں نے انگریزوں سے جو معاہدات کر رکھے تھے ان سب کی پابندی کی جائے گی۔ پرانے سارے قوانین برقرار رہیں گے۔ قبائلیوں کے ''رواج'' میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی اور انہیں بدستور الاؤنس ملتے رہیں گے۔ [13] پولیٹیکل ایجنٹ اے۔ آر۔ خان یہی پالیسی لے کر 2 رستمبر کو کوئٹہ پہنچا تھا۔ صوبہ سرحد میں گورنر سر جارج کننگھم بھی ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس پالیسی پر عمل کرنا اس لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ان دنوں بلوچستان سے ملحقہ ایران سے تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں۔ ایران اور سوویت یونین کے درمیان 6 راپریل 1946ء کے معاہدے کی توثیق کے مسئلہ کی وجہ سے وہاں بہت کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ ماسکو میں ایرانی سفیر پرنس مظفر فیروز کو برطرف کر دیا گیا تھا اور سوویت یونین سے ملحقہ صوبہ آذربائیجان میں پھر بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

خان قلات کی پاکستان سے الحاق پر ٹال مٹول، خلیجی علاقے کی بین الاقوامی سیاست کے تناظر میں

بلوچستان کی انتظامیہ کے خلاف لاہور اور کراچی کے اخبارات کا مسلسل احتجاج بالآخر مؤثر ثابت ہوا اور حکومت پاکستان نے ستمبر کے اواخر میں احتیاط ومصلحت کی روش ترک کر دی۔ ایجنٹ ٹو گورنر جنرل سر جیفرے پرائر کو ریٹائر کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ایک اور انگریز افسر اے۔ ڈی ڈنڈوس (A.D.Dundus) کا تقرر ہوا۔ 30 رستمبر کو اس سلسلے میں جب سرکاری اعلان جاری ہوا تو اس وقت نیو یارک سے یہ خبر مل چکی تھی کہ افغانستان نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے داخلہ کے خلاف ووٹ دیا ہے اور کراچی کے سیاسی حلقوں میں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ خان قلات کے وزیر خارجہ ڈگلس فل نے ریاست کی ''آزادی وخود مختاری'' کے تحفظ کے لئے

حکومت برطانیہ سے رابطہ پیدا کیا ہے اور خان کے چچا اور بھائی نے اس مقصد کے لئے کابل سے امداد طلب کی ہے۔ مزید براں یہ خبر بھی آئی تھی کہ ایران کی قومی مجلس، سوویت یونین۔ ایرانین آئل کمپنی کے قیام سے متعلقہ 6/اپریل 1946ء کے معاہدے کی توثیق نہیں کرے گی۔ کردستان کے ایک رکن مجلس فرض اللہ آصف کا بیان تھا کہ ''چونکہ وزیر اعظم قوام السلطنت نے یہ معاہدہ دباؤ کے تحت کیا تھا اس لئے حکومت ایران پر اس کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ جب یہ معاہدہ ہوا تھا اس وقت آذربائیجان میں سوویت فوجیں موجود تھیں۔''

پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے غالباً ایسی ہی خبروں کے پیش نظر خان قلات کو اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں کراچی آنے کی دعوت دی۔ قبل ازیں ''خان معظم'' کے ''وزیر خارجہ'' ڈوگلس فل نے کراچی کے متعلقہ حکام سے قلات اور پاکستان کے درمیان ''معاہداتی تعلقات'' استوار کرنے کے لئے جو بات چیت شروع کی تھی وہ ناکام ہو چکی تھی۔ خان قلات اپنے عملے اور بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ کے ہمراہ 16/اکتوبر 1947ء کو کراچی پہنچا تو ہوائی اڈے پر گورنر جنرل کے اے۔ ڈی۔ سی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ خان دو تین دن تک بطور سرکاری مہمان گورنر جنرل ہاوس میں ہی مقیم رہا اور اس دوران اس نے قائداعظم جناح سے قلات اور پاکستان کے درمیان تعلقات کے مسئلہ پر مفصل بات چیت کی۔ لیکن یہ بات چیت بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ خان کا اپنا بیان یہ ہے کہ اس بات چیت کے دوران قائداعظم نے یہ کہا تھا کہ ''میں آپ کے بڑے بھائی اور دوست کی حیثیت سے یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اپنی ریاست کو پاکستان میں مدغم کر لیں۔ اس سے قلات اور پاکستان دونوں کو فائدہ ہوگا۔ جہاں تک قلات کے مطالبات اور دوسرے مسائل کا تعلق ہے ان کا باہمی دوستی کے جذبہ کے تحت قطعی فیصلہ ہو جائے گا۔''[14] لیکن ''خان معظم'' کے لئے یہ برادرانہ اور دوستانہ مشورہ قابل قبول نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ ''میں آپ کے مشورے کی قدر کرتا ہوں۔ میرا اپنا یہی خیال ہے کہ پاکستان کو مضبوط کرنے کے لئے قلات کا اس کے ساتھ ادغام لازمی ہے۔ مگر اس سلسلے میں لازمی ہے کہ میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے لوگوں سے مشورہ کر لوں۔ بلوچستان میں بہت سے قبائل رہتے ہیں۔ مروجہ قبائلی روایت کے مطابق اگر ان کا خان انہیں اعتماد میں لئے بغیر کوئی فیصلہ کر لے تو وہ اس کے پابند نہیں ہوں گے۔''[15] خان قلات کے اس جواب کا مطلب دراصل یہ تھا کہ وہ بدستور

اپنی ایک آزاد وخودمختار بلوچ سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

خان نے یہ شہنشاہی خواب 1945ء کے اواخر میں ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا جبکہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب برطانوی سامراج برصغیر پر براہ راست اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکے گا۔ اس نے 1946ء میں وزارتی مشن کے روبرو جو میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں اپنی ریاست کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ حکومت برطانیہ اس کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے میں زیادہ پس و پیش نہیں کریگی کیونکہ بلوچستان میں تیل کی موجودگی بعید از امکان نہیں تھی اور یہ علاقہ فوجی لحاظ سے بھی بہت اہم تھا۔ خان اپنی سلطنت کی '' آزادی وخودمختاری کے عوض برطانوی آئل کمپنیوں کو زیادہ سے زیادہ رعایت دینے پر آمادہ تھا اور اس امر پر بھی تیار تھا کہ برطانیہ اس علاقے میں اپنا مستقل فوجی اڈہ قائم کرلے۔ لندن میں چرچل (Churchill) کی زیر قیادت مخلوط قومی حکومت کے دور میں اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا گیا تھا۔ وزیر ہند ایمری (Amery) نے اس سلسلے میں وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) کو ایک اعلیٰ فوجی افسر کی رپورٹ بھی بھیجی تھی۔ لیکن جب جولائی 1946ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو کی توجہ اس خبر کی طرف مبذول کرائی گئی تھی کہ خان قلات برطانوی بلوچستان کا علاقہ واپس مانگتا ہے اور وہ پورے بلوچستان میں ایک آزاد وخودمختار ریاست قائم کرنے کا عزم رکھتا ہے تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''موجودہ حالات میں برطانوی بلوچستان کے علاقے کو قلات کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مستقبل قریب میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ قلات ایک سرحدی ریاست ہے اس کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ سرحدی علاقے ہمیشہ سٹریٹیجک علاقے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قلات اپنے علاقوں کے نزدیک غیر ملکی فوجوں کے قیام کی پیش کش کرے لیکن آزاد ہندوستان اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا۔''[16] جواہر لال نہرو نے بلوچستانی گاندھی خان عبدالصمد خان کے نام ایک خط میں بھی خان قلات کے اس مطالبے کو مسترد کر دیا تھا کہ کوئٹہ اور پشین کے مستجار علاقے قلات کے حوالے کر دیئے جائیں۔ نہرو کا اس خط میں مزید موقف یہ تھا کہ '' قلات ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے اور ہم اپنی سرحدوں پر کسی ایسی مملکت کا وجود برداشت نہیں کر سکتے جو یونین سے علیحدہ ہو کر آزاد رہنا چاہے۔ کانگرس اس مطالبے کی پرزور مزاحمت کرے گی۔''[17] تاہم خان

قلات کو یہ امید لگی رہی کہ برطانوی سامراج تیل اور فوجی اڈے کے لالچ کی بنا پر آزاد وخود مختار بلوچ سلطنت کے مطالبے کو مسترد نہیں کرے گا۔ اس کی اس امید کو جون۔ جولائی 1947ء میں بہت تقویت ملی جبکہ مسلم لیگ کی قیادت نے کئی بار اپنے اس مؤقف کا اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی ریاستوں کو اپنی آزادی وخود مختاری کا اعلان کرنے کا پورا قانونی حق حاصل ہے۔

اکتوبر 1947ء میں کراچی کی ''برادرانہ'' بات چیت کی ناکامی کے چند دن بعد 22/اکتوبر کو جب ایران کی قومی مجلس نے سوویت ایرانین آئل کمپنی کے قیام سے متعلقہ 1946ء کے معاہدے کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا تو خلیج فارس کے علاقے میں سخت کشیدگی پھیل گئی۔ ایرانی مجلس نے اس سلسلے میں جو قانون منظور کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی سے متعلقہ برطانیہ اور ایران کے درمیان طے شدہ 50/سالہ معاہدہ برقرار رہے گا لیکن غیر ملکی سرمایہ سے کسی نئی آئل کمپنی کے قیام کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس قانون کی منظوری سے پہلے مئی 1947ء میں امریکہ ایران کو اڑھائی کروڑ ڈالر کی مالی امداد دے چکا تھا۔ اس نے ایرانی فوج کو جدید اسلحہ کی سپلائی بھی شروع کر دی تھی اور یہ بھی غالباً امریکہ کے ہی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ افغانستان نے 30/ستمبر 1947ء کو اقوام متحدہ میں پاکستان کی شمولیت کی تجویز کے خلاف جو ووٹ دیا تھا وہ اس نے 20/اکتوبر کو واپس لے لیا تھا اور پھر چند دن کے بعد اس نے پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا۔

10/نومبر کو یہ خبر آئی کہ ''سوویت یونین نے ایرانی مجلس کے 22/اکتوبر کے فیصلے پر سخت برہمی کا اظہار کیا ہے اور اس نے حکومت ایران کو احتجاجی نوٹ میں متنبہ کیا ہے کہ اس کے اس معاندانہ اقدام کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔ اس خبر سے کراچی اور دنیا کے دوسرے دارالحکومتوں میں سنسنی پھیل گئی کیونکہ سوویت یونین کے اس احتجاجی نوٹ کی زبان بڑی سخت تھی اور اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ امریکی صدر ٹرومین (Truman) نے 12/مارچ 1947ء کو سوویت یونین اور ساری دنیا کے انقلاب پسند عوام کے خلاف جس سرد جنگ کا اعلان کیا تھا اس کے شعلے خلیج فارس کے علاقے میں بھی پہنچ گئے ہیں اور عام خیال یہ تھا کہ بلوچستان ان شعلوں کی لپیٹ سے نہیں بچ سکے گا۔

14/نومبر کو روز نامہ ''ڈان'' میں کراچی کی بلوچ جمعیت کے سیکرٹری اورانی کا ایک

بیان شائع ہوا جس میں خان قلات کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی تھی کہ جغرافیائی اتصال اور 30 لاکھ بلوچیوں کی خواہش کے پیش نظر ریاست قلات کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہونا چاہیے......قلات نیشنل پارٹی، جو خان کو الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دے رہی ہے، دراصل ان پرانے ''قوم پرستوں'' پر مشتمل ہے جنہوں نے ریفرنڈم میں شکست کھانے کے بعد اپنا ہیڈ کوارٹر کوئٹہ سے قلات میں منتقل کرلیا ہے''۔ بظاہر یہ بیان حکومت پاکستان کے اشارے پر جاری کیا گیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے اور اب وہ زیادہ دیر تک خان قلات کے شہنشاہی عزم کو برداشت نہیں کریں گے۔ اینگلو۔امریکی سامراج کو بلوچستان کی غیر یقینی صورت حال پر تشویش تھی جبکہ ایران میں روس نواز تودہ پارٹی اور سامراج نواز حکومت ایران کے درمیان محاذ آرائی کے باعث وہاں سیاسی عدم استحکام کی علامتیں روز بروز نمایاں ہو رہی تھیں۔

باب نمبر: 6

قبائلی سرداران، خان قلات اور حکومت پاکستان......تینوں کے الگ راستے

بلوچستان اور سندھ کے مسلم لیگی رہنماؤں کی جانب سے سندھ اور بلوچستان کے ادغام کی تجویز

26 رنومبر کو بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ نے، جو 1945ء سے ایران میں ''روسی سامراج'' کی سرگرمیوں سے بہت پریشان تھا، ایک انٹرویو میں اس تجویز کی پرزور تائید کی کہ بلوچستان کو صوبہ سندھ میں مدغم کر دیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نہ صرف بلوچستان میں صوبہ پرستی کا خاتمہ ہوجائے گا بلکہ حکومت پاکستان کو ایک کروڑ روپے کی رقم کی بچت بھی ہوگی جو وہ ہر سال بلوچستان کے امداد کے لئے دیتی ہے۔ جب قاضی عیسیٰ سے پوچھا گیا کہ آیا بلوچستان کے عوام اس تجویز سے اتفاق کریں گے تو اس نے کہا کہ بلوچستان مسلم لیگ نے اس سلسلے میں 1943ء میں ایک قرارداد منظور کی تھی۔ سندھ کے سات اضلاع اور بلوچستان کے پانچ اضلاع کے ادغام سے ایک خاصے بڑے صوبے کی تشکیل ہوجائے گی۔ اس نے بلوچستان کے صوبہ سرحد کے ساتھ ادغام کی اس بنا پر مخالفت کی کہ چونکہ صوبہ سرحد خسارہ کا صوبہ ہے اس لئے وہ بلوچستان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گا۔''[1]

اسی دن (یعنی 26 رنومبر کو) بلوچستان سے آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسلر چودھری محمد امین کا ایک بیان میں مطالبہ یہ تھا کہ ''بلوچستان میں ایک شخص (اے۔جی۔جی) کے آمرانہ

راج کوختم کر کے وہاں فوری طور پر پاکستان کے دوسرے صوبوں کی طرح کی جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں اور اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مرکزی کابینہ میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے۔ چودھری امین نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ماضی میں قائداعظم جناح اور مسلم لیگ بلوچستان کے عوام کو جمہوری حقوق دینے کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں مگر اب قیام پاکستان کے بعد یہ کہا جارہا ہے کہ بلوچستان میں مطلوبہ اصلاحات اس وقت نافذ کی جائیں گی جبکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نیا آئین مرتب کرلے گی۔ اس نے کہا کہ یہ مؤقف بلوچستانی عوام کے لئے اطمینان بخش نہیں ہے۔ پاکستان کا نیا آئین بننے میں بہت سے سال لگیں گے۔ اگر اس وقت تک وہاں کے عوام کو ان کے جائز جمہوری حقوق سے محروم رکھا گیا تو یہ امر خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس وقت بلوچستان میں کوئی ایسی حکومت نہیں ہے جو عوام کے سامنے جواب دہ ہو۔ مرکزی حکومت میں بلوچستانی عوام کو کوئی نمائندگی حاصل ہے اور نہ ہی بلوچستان کے لئے درآمدی و برآمدی تجارت میں کوئی الگ کوٹہ مقرر ہے۔ یہ صورت حال غیر معین عرصہ کے لئے جاری نہیں رہ سکتی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بلوچستان میں بلا تاخیر دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں۔''[2]

قاضی عیسیٰ اور چودھری محمد امین کے ان بیانات کا مطلب یہ تھا کہ بلوچستان کی مسلم لیگ کے پٹھان اور پنجابی عناصر صوبہ اور مرکز میں اپنے لئے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے خواہاں تھے جبکہ ایک طرف تو بلوچ قبائلی سردار ''خان معظم آف قلات'' کی زیر قیادت ''بلوچ قوم'' کی ''آزادی وخودمختاری'' کا خواب دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف کوئٹہ، پشین اور لورالائی وغیرہ کے پٹھان قبائلی ملک یا تو بلوچستان سے پنجابیوں کو بے دخل کر کے بلا شرکت غیرے اپنی سیاسی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے یا وہ صوبہ سرحد کے خان عبدالغفار خان کے پروپیگنڈے کے زیر اثر اپنے پٹھان علاقوں کو صوبہ سرحد سے منسلک کر کے ایک ''عظیم پختونستان'' کے قیام کے متمنی تھے اور تیسری طرف لس بیلہ اور مکران کے سندھی عناصر بلوچستان کو صوبہ سندھ سے وابستہ کر کے اپنی سیاسی قوت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

جس دوران بلوچستان کے ان عناصر کے درمیان چہار طرفہ سیاسی رسہ کشی زور شور سے جاری تھی گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح لاہور میں تنازعہ کشمیر سلجھانے میں مصروف تھے۔ وادیٔ کشمیر میں ہندوستانی فوجوں اور صوبہ سرحد کے قبائلیوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہورہی

تھی اور جموں کے علاقے میں مسلمانوں کا ایک منصوبہ کے تحت قتل عام ہو رہا تھا۔ قائداعظم لاہور میں 35 دن تک قیام کے بعد جب کشمیر کے مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس ہو گئے اور دسمبر 1947ء کو واپس کراچی پہنچے تو ایران میں شدید سیاسی بحران کی خبریں آ رہی تھیں۔ اس بحران کی فوری وجہ یہ تھی کہ ایران کے قوم پرست وزیراعظم قوام السلطنت کی حکومت اور برطانوی سامراج کے درمیان جزیرہ بحرین کے مستقبل کے بارے میں اور اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی سے متعلقہ معاہدے کی شرائط پر نظر ثانی کے مسئلہ پر بہت سخت جھگڑا ہو گیا تھا اور اس بنا پر حکومت برطانیہ شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی اور حزب اختلاف کی ہر طرح سے امداد کر کے قوام السلطنت کا تختہ الٹنے کے درپے تھی۔

4 دسمبر کو بلوچستان مسلم لیگ کے نائب صدر میر قادر بخش نے ایک بیان میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ مرکزی کابینہ میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے اور صوبہ میں بلا تاخیر جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔ اس نے کہا کہ ''قائداعظم جناح نے 1943ء اور 1945ء میں اپنے دورۂ بلوچستان کے دوران کئی ایک تقریروں میں یقین دلایا تھا کہ بلوچستان مکمل اصلاحات کا مستحق ہے مگر بدقسمتی سے بلوچستانی عوام کے اس دیرینہ مطالبہ کی تکمیل کے لئے ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اور بظاہر مستقبل قریب میں ایسی کوئی کاروائی ہونے کا امکان بھی نظر نہیں آتا۔ بلوچستان کے عوام موجودہ غیر جمہوری حکومت سے تنگ آ چکے ہیں کیونکہ اس میں رائے عامہ کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ہمیں دستور ساز اسمبلی کی جانب سے نئے آئین کی ترتیب تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بلا تاخیر کوئی ایسا عارضی انتظام کیا جائے کہ صوبائی حکومت جمہوریت کے زیادہ سے زیادہ قریب آ جائے۔''[3]

8 دسمبر کو صوبہ سندھ کے وزیراعلیٰ محمد ایوب کھوڑو نے ایک انٹرویو میں میر قادر بخش کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے پرزور الفاظ میں یہ تجویز دہرائی کہ بلوچستان کو صوبہ سندھ میں مدغم کر دیا جائے۔ اس نے کہا ''اس تجویز پر عمل کرنے سے مرکزی حکومت کو سالانہ ایک کروڑ روپے کی بچت ہوگی۔ جغرافیائی لحاظ سے سندھ اور بلوچستان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ مثلاً بلوچستان میں آبپاشی کے نظام کا انحصار دریائے سندھ کے پانی پر ہے۔ اگر ان دونوں صوبوں کا ادغام ہو جائے تو اس طرح دونوں ہی کا فائدہ ہوگا۔ موسم گرما میں صوبائی حکومت کوئٹہ میں منتقل ہو سکتی ہے۔''[4]

9؍دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ایک بلوچستانی رکن چودھری محمد امین نے کونسل کے 14 ؍دسمبر کو ہونے والے اجلاس میں اس مضمون کی قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا کہ ''چونکہ بلوچستان کی انتظامیہ میں رائے عامہ کو کوئی دخل نہیں ہے اس لئے حکومت پاکستان کو صوبہ میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے فوری طور پر مناسب اقدام کرنا چاہیے اور جب تک مطلوبہ اصلاحات نافذ نہیں ہوتیں، اس وقت تک مرکزی کابینہ میں کسی بلوچستانی نمائندہ کو شامل کیا جائے۔'' اسی دن بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ نے ایک بیان میں اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے اس تجویز کی تائید کی ہے کہ بلوچستان اور سندھ کو مدغم کر دیا جائے۔ اس نے کہا کہ اس طرح نہ صرف حکومت پاکستان کو مالی بچت ہو گی بلکہ بلوچستان میں صوبہ پرستی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ قاضی عیسیٰ کی مزید رائے یہ تھی کہ موجودہ جدید ذرائع مواصلات کی موجودگی میں مغربی پاکستان میں الگ الگ صوبوں کا وجود غیر ضروری ہے۔ ان سارے صوبوں کو ''ون یونٹ'' میں منسلک کر دینا چاہیے۔ اس طرح انتظامیہ کی کارگردگی بہتر ہو گی اور اس کے خرچ میں کمی ہونے کے باعث پسماندہ علاقوں کی ترقی لئے سرمایہ مہیا ہو گا۔ اس نے کہا کہ جو لوگ بلوچستان سے ناواقف ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس صوبہ میں رہنے والے سارے لوگ بلوچی نہیں ہیں۔ بلوچ اس صوبہ کی آبادی کا محض ایک حصہ ہیں اور بہت سے بلوچ کئی نسلوں سے بلوچستان سے باہر دوسرے علاقوں میں بھی آباد ہیں۔ بلوچستان میں رہنے والے سارے لوگوں کو بلوچی کہنا صحیح نہیں البتہ انہیں بلوچستانی کہا جائے تو صحیح ہو گا۔''[5]

9؍دسمبر کو کراچی کی لس بیلہ نیشنل پارٹی کے صدر محمد حسن نے قاضی عیسیٰ اور ایوب کھوڑو کی اس تحریک کا خیر مقدم کیا کہ بلوچستان اور سندھ کو مدغم کر دیا جائے۔ اس نے کہا کہ لس بیلہ بھی جغرافیائی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے سندھ سے منسلک ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ لس بیلہ کو بھی سندھ میں مدغم کیا جائے اور میں نے اس مقصد کے لئے اپنی پارٹی کا ایک جلسہ بلایا ہے۔''[6]

چودھری محمد امین، قاضی عیسیٰ اور ایوب کھوڑو کے بیانات کا ایک مطلب یہ تھا کہ قلات کا ''خان معظم'' کوئٹہ، پشین اور لورالائی وغیرہ کے علاقوں پر اپنی ملکیت کا جو حق جتا تا ہے اسے قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور محمد حسن کے بیان کا مطلب یہ تھا کہ خان قلات نے 15 ؍اگست 1947ء کو اپنی ''آزادی و خودمختاری'' کا جو اعلان کیا تھا لس بیلہ کی ساحلی ریاست اس کی پابند نہیں تھی۔

قدرتی طور پر کراچی سے اٹھنے والی یہ آوازیں قلات کے ''خان معظم'' کے علاوہ بلوچستان کے کانگرسی عناصر کے لئے بھی خوش کن نہیں تھیں۔ چنانچہ بلوچستانی گاندھی خان عبدالصمد خان اچکزئی نے 12 ردسمبر کوئٹہ دہلی میں ایک اخباری بیان کے ذریعے بلوچستان اور سندھ کے ادغام کی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کے وفاق کے اندر آزاد پٹھانستان اور آزاد بلوچستان کی خودمختار جمہوریتیں قائم ہونی چاہئیں۔ اس نے کہا کہ'' آزاد پٹھانستان کی تحریک خان عبدالغفار خان کی طرف سے چلائی جارہی ہے تاکہ منتشر پٹھان قبائل کو ایک سیاسی اکائی کے طور پر متحد کیا جائے۔ آزاد بلوچستان کی تحریک کے مقاصد بھی بلوچستان قبائل کے حوالے سے اسی قسم کے ہیں۔ بلوچ قبائل بالائی سندھ کے اضلاع سے لے کر ایران کے بعض مشرقی اضلاع تک آباد ہیں۔ اس سارے علاقے کو قلات کی آزاد ریاست میں شامل کر کے پاکستان کے اندر ایک خودمختار جمہوریت کی تشکیل کرنا چاہیے۔ بلوچیوں کی اس خودمختار جمہوریت کا مستقبل بہت پر مسرت اور خوشحال ہوگا۔''[7] خان عبدالصمد خان کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ قلات کے ''خان معظم'' نے اپنی سلطنت کی'' آزادی وخودمختاری'' کے تحفظ کے لئے نہ صرف اپنے'' وزیر خارجہ'' ڈوگلس فل کے ذریعے حکومت برطانیہ سے رابطہ کیا تھا بلکہ اس نے اس سلسلے میں ''بلوچستانی گاندھی'' کے ذریعے حکومت ہندوستان سے بھی تعلق قائم کیا تھا درآنحالیکہ اس کے چچا اور بھائی کابل سے امداد کے طلبگار تھے۔ لیکن اسی دن کوئٹہ سٹی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ملک محمد عثمان خان کانسی کا جو بیان جاری ہوا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب کراچی کے ارباب اقتدار خان قلات اور کانگرسی عناصر کے عزائم سے غافل نہیں تھے اور انہوں نے بلوچستان کے سیاسی مستقبل کے مسئلہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرلیا تھا۔ عثمان کانسی کا بیان یہ تھا کہ'' اگر حکومت پاکستان کسی وجہ سے بلوچستان کو فوری طور پر ایک ذمہ دار حکومت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو کم از کم ایک مشاورتی بورڈ کی تشکیل بلاتاخیر ہونی چاہیے تاکہ وہاں کے عوام کو ایک مطلق العنان حکومت کے چنگل سے نجات حاصل ہوسکے۔''[8]

اس سے قبل 4 ردسمبر کو بلوچستان مسلم لیگ کا نائب صدر میر قادر بخش بھی اسی قسم کا بیان دے چکا تھا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر بلوچستان کے عوام کو فوری طور پر مکمل جمہوری حقوق نہیں دیئے جاسکتے تو فوری طور پر کوئی ایسا عارضی انتظام کیا جائے کہ صوبائی حکومت جمہوریت کے زیادہ

سے زیادہ قریب آجائے۔ پھر میر قادر بخش نے 14 ردسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پیش کرنے کے لئے اس مضمون کی قرارداد کا نوٹس دیا کہ ''بلوچستان کی انتظامیہ میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ وہ قائداعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں کے وعدوں کے مطابق عوام کی نمائندہ بن جائے اور وہ عوام کے سامنے جوابدہ ہو۔'' 15 ردسمبر کو میر قادر بخش نے ایک بیان میں بلوچستان کی تعلیمی پسماندگی پر بڑے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ 1876ء سے لے کر 1947ء تک برطانوی اقتدار میں بلوچستانی عوام کو دانستہ طور پر جدید تعلیم سے بے بہرہ رکھا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اس صوبہ کی دس لاکھ کی آبادی میں گریجوایٹوں کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہے۔ تاہم اس نے بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی طرح کی قانون ساز اسمبلی قائم ہونی چاہیے اور مرکزی کابینہ میں ایک بلوچستانی وزیر کا تقرر ہونا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے فوری طور پر صوبائی قانون ساز اسمبلی قائم نہیں ہوسکتی تو ایک بااختیار مشاورتی بورڈ کی تشکیل ہونی چاہیے۔''[9]

ان بیانات سے یہ حقیقت واضح تھی کہ بلوچستان مسلم لیگ کے لیڈروں کو وزیراعظم لیاقت علی خان اور پاکستان کے دوسرے ارباب اقتدار سے ملاقاتوں میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ بلوچستان کو بوجوہ فوری طور پر صوبائی درجہ نہیں دیا جائے گا۔ البتہ کسی نہ کسی نوعیت کے مشاورتی بورڈ کی تشکیل ہو سکے گی۔ لہٰذا وہ گندم کی عدم موجودگی میں بھس کو ہی غنیمت سمجھنے لگے تھے۔ قاضی عیسیٰ اور اس کے حواری سیاسی طور پر نہایت موقع پرست تھے۔ وہ بہر قیمت کسی نہ کسی حد تک سیاسی اقتدار کے متمنی تھے۔ قاضی عیسیٰ کی خواہش تھی کہ اسے مرکزی وزارت مل جائے اور میر قادر بخش اور چودھری محمد امین وغیرہ کی تمنا تھی کہ انہیں صوبائی اقتدار میں کوئی تھوڑا بہت حصہ مل جائے۔ وہ اس مقصد کے لئے بلوچستان کو سندھ میں مدغم کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ میر قادر بخش کی شرط صرف یہ تھی کہ بلوچستان اور سندھ کے مجوزہ متحدہ صوبہ کی کابینہ میں بلوچستان کو ایک تہائی حصہ ملنا چاہیے۔ یہ بلوچستانی لیڈر اس مقصد کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے دوروزہ اجلاس میں تو کوئی قرارداد پیش نہ کر سکے البتہ جب 16 ردسمبر کو کونسل کا اجلاس ختم ہوا تو اس کے دو تین دن بعد انہوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان اور دوسرے مرکزی وزراء سے ملاقاتیں کیں اور اس رائے سے اتفاق کیا کہ بلوچستان میں مکمل طور پر ذمہ دار حکومت کے قیام میں قدرتی طور پر کچھ دیر لگے

گی۔ تاہم ان کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں مرکزی کابینہ میں نمائندگی دی جائے اور درآمدی اور برآمدی تجارت میں حصہ دیا جائے۔[10]

حکومت پاکستان کا بلوچستان میں سخت اقدام جبکہ ریاست قلات کے ساتھ نرم رویہ

22 ر دسمبر کو حکومت پاکستان نے بذریعہ آرڈیننس اعلان کیا کہ آئندہ بلوچستان کے کسی علاقے میں کسی قسم کی بدامنی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس آرڈیننس میں قرار دیا گیا تھا کہ آئندہ بلوچستان کا چیف کمشنر جن علاقوں کو فساد زدہ قرار دے گا ان میں قانون شکنی کرنے والوں کو گولی ماردی جائے گی۔ بری اور ہوائی فوج کے چھوٹے بڑے افسروں کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ بلا وارنٹ کسی بھی ایسے شخص کو گرفتار کر سکتے ہیں جس کے بارے میں یہ شبہ ہو کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے یا کوئی جرم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ فوجی افسر ہر جگہ کی بلا وارنٹ تلاشی بھی لے سکیں گے۔ چونکہ اس آرڈیننس کے نفاذ سے چند دن قبل ایران میں قوام السلطنت کا تختہ الٹا جا چکا تھا اور اس کی جگہ قومی مجلس کے صدر فخر حکمت کا بطور وزیر اعظم انتخاب ہوا تھا اور اس کے ساتھ یہ خبریں بھی آئی تھیں کہ ایران کے شمالی صوبے آذربائیجان میں سخت بدامنی پھیل گئی ہے۔ اس لئے کراچی کے بعض سیاسی حلقوں کا خیال تھا کہ آئندہ حکومت پاکستان خان قلات اور اس کے حواریوں سے بھی سختی کرے گی اور اس طرح پورے بلوچستان میں اپنا اقتدار قائم کر کے وہاں ہر قسم کی بدامنی کا مؤثر سد باب کرے گی۔

مگر 29 ر دسمبر کو یہ خیال غلط ثابت ہوا جبکہ سر محمد ظفر اللہ خان نے پاکستان کی وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی پالیسی تقریر میں زوردار الفاظ میں بتایا کہ ”پاکستان ریاست قلات کے الحاق کے لئے اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال رہا ہے۔ ریاست قلات کے بارے میں پاکستان کا رویہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ اس نے ان دوسری ریاستوں کے بارے میں اختیار کیا تھا جو پاکستان سے ملحق ہو چکی ہیں یا عنقریب ملحق ہونے والی ہیں۔ پاکستان گفت وشنید کے ذریعے ریاست قلات سے دوستانہ تصفیہ کا خواہاں ہے۔ پاکستان اس آئینی سمجھوتے کی پوری طرح پابندی کر رہا ہے اور کرتا رہے گا جو اس نے انڈین یونین اور ریاستوں کے ساتھ کیا تھا۔“[11]

سر محمد ظفر اللہ خان کی اس تقریر میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس میں یہ حقیقت بالکل واضح تھی کہ پاکستان کے ارباب اقتدار نے ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں ہندوستان کے ارباب اقتدار سے کمر توڑ دھوکہ کھانے کے باوجود ریاستوں کے بارے میں اپنی غیر جمہوری پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ غالباً پاکستانی ارباب اقتدار اس وقت بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کے آئینی دلائل کے زور سے نہ صرف ریاست حیدر آباد (دکن) ایک آزاد وخود مختار مسلم مملکت کی حیثیت اختیار کر سکے گی بلکہ ریاست جموں وکشمیر بھی بالآخر پاکستان میں شامل ہو جائے گی۔ یہ پالیسی کس قدر غلط اور نقصان دہ تھی اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب سر ظفر اللہ خان نے یہ تقریر کی تھی اس وقت بیگلر بیگی خان معظم سر احمد یار خان فرمانروائے قلات کے سرمائی دار الحکومت ڈھاڈر میں اس کے نام نہاد دار العوام و دار الامراء کے مشترکہ اجلاس ہو رہے تھے جن میں نہ صرف ریاست قلات بلکہ پورے بلوچستان کی مکمل آزادی وخود مختاری کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

ریاست قلات کے ''دار العوام'' اور ''دار الامراء'' میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے خلاف تقریریں

دار العوام کا اجلاس 16 ردسمبر کو شروع ہوا تھا اور اسی دن ''خان معظم'' کے انگریز وزیر خارجہ ڈگلس فل نے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ ''قلات نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اس کا ہماری ہمسایہ مملکت پاکستان کے ساتھ دوستانہ اور باعزت سمجھوتہ ہو جائے لیکن اس کے باوجود ان دونوں مملکتوں کے آئندہ کے تعلقات کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ بات چیت ابھی جاری ہے لیکن اس کی کامیابی کے راستے میں بڑی رکاوٹیں حائل ہیں۔ پہلی رکاوٹ یہ ہے کہ قلات سے پاکستان کے ساتھ الحاق ہو یا معاہدہ ہو، قلات ایک معاہدہ کے تحت دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کے امور پاکستان کے حوالے کرنے پر آمادہ ہے لیکن پاکستان الحاق کا مطالبہ کرتا ہے۔ دوسری رکاوٹ مستجار علاقوں کے بارے میں ہے۔ برطانوی اقتدار اعلیٰ کے خاتمہ کے بعد مستجار علاقے واپس قلات کی تحویل میں آجانے چاہئیں تھے لیکن پاکستان اس وقت تک اس مسئلہ پر غور کرنے پر تیار نہیں جب تک کہ الحاق کا مسئلہ طے نہ ہو جائے۔ تیسری رکاوٹ قلات اور دیگر ریاستوں یعنی خاران اور لس بیلہ کے بارے میں ہے۔ یہ دونوں ریاستیں اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے

سے انکار کرتی ہیں اور پاکستان کے رویے سے ان کی حوصلہ افزائی ہورہی ہے۔" [12]

وزیر خارجہ کے اس بیان کے بعد قلات نیشنل پارٹی کے ممتاز لیڈر میر غوث بخش خان بزنجو کی تقریر یہ تھی کہ "ہم مسلمان ہیں لیکن ضروری نہیں کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم آزادی کھو کر دوسروں میں جذب ہو جائیں۔ اگر محض مسلمان حکومت ہونے کے باعث ہمارا پاکستان میں شامل ہونا ضروری ہے تو پھر افغانستان اور ایران کی اسلامی حکومتوں کو بھی پاکستان میں مدغم ہو جانا چاہیے۔ ہمارے سامنے پنجاب اور سندھ کی مثال پیش کی جاتی ہے حالانکہ پنجاب اور سندھ میں کوئی ایک بڑی قوم نہیں ہے۔ اس میں مختلف فرقہ جات ہیں۔ ان کا کوئی جدا تمدن نہیں ہے۔ یہ اور بات تھی کہ انگریزی حکومت نے جبر سے، تلوار کے زور سے تمام ایشیا کو غلام بنایا۔ بلوچی حکومت کو جس کے وطن کا نام بلوچستان تھا اس کو بھی غلام بنایا۔ اگرچہ ہم نے بغاوتیں کیں لیکن حکومت برطانیہ ایک جابر اور ظالم حکومت تھی۔ اس نے ہماری آزادی کو سلب کیا۔ ہم اس سے پیشتر کبھی ہندوستان کا حصہ نہیں تھے۔ پاکستان کی ناقابل قبول تمنا کہ قلات، جو اس سے پہلے بلوچستان کے نام سے موسوم تھا اور بلوچوں کا قومی گھر تھا، اس میں مدغم ہو جائے، یہ ناممکن ہے۔ ہمارا رویہ پاکستان کے ساتھ کیا تھا اور پاکستان نے کیا رویہ اختیار کیا یہ کسی سے مخفی نہیں۔ پاکستان قائم ہونے سے پیشتر ہمارے خان نے مسلم لیگ کو اپنے علاقے میں جنم دیا۔ ہمارے گھر، بنگلے اور موٹریں اس کے لئے وقف تھیں اور ہر ممکن کوشش سے بلوچوں کی اکثریت نے خان قلات کی رہنمائی کے تحت اس کو کامیاب بنایا۔ لیکن پاکستان اس کے صلے میں ہمارے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ ہمارے مستجار اور قبائلی علاقے، بیلہ اور خاران جو ہمارا حصہ رہے ہیں، ہمیں نہیں دینا چاہتا۔ ہم بیلہ اور خاران کو غلامی کی صورت میں اپنے ساتھ نہیں ملانا چاہتے بلکہ وہ ہمارے قومی بھائی ہیں۔ اس قومی حیثیت کے باعث وہ قلات کا جزو چلے آتے ہیں۔ پاکستان نے اس کے متعلق بات چیت کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے اور شرط یہ پیش کی ہے کہ بلوچوں کی حکومت جب تک شرمندہ ہو کر نہیں جھکتی اور ذلیل ہو کر سامنے نہیں آتی اس وقت تک وہ بات چیت نہیں کر سکتے...... خاران اور بیلہ کا اقتدار اعلیٰ برٹش حکومت ہمارے سپرد کر گئی تھی لیکن پاکستان نے ہم سے مشورہ کئے بغیر براہ راست خاران اور بیلہ کی سپلائی ان کے حوالے کر دی۔ ہم باعزت طریق پر دوستی کرنے کے لئے تیار ہیں، ذلت سے نہیں۔ پاکستان کی حدود میں شامل ہونے کے لئے کسی صورت میں تیار نہیں۔

ہمیں موت کا ڈراوا دیا جاتا ہے گویا کہ ڈیڑھ کروڑ ایشیائی بلوچوں کی موت کی دستاویز پر ہم خود دستخط کر دیں۔ ہم اتنے بڑے جرم کے مجرم نہیں بن سکتے کہ بلوچ قوم کو ذلیل کر کے غیر بلوچ قوم میں مدغم کر دیویں۔ میری رائے یہ ہے کہ پاکستان جو کل بنا ہے ہم اس کے راستے میں رکاوٹ کا باعث نہ بنیں۔ ڈیفنس، خارجہ، رسل ورسائل کا تعلق ہے تو ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ بلوچ قوم اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایٹم کا زمانہ ہے۔ کیا افغانستان، ایران اور پاکستان کے معیار پر اپنی حفاظت کر سکتے ہیں؟ آج روس اور امریکہ اگر چاہیں تو تمام ایسی سلطنتوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو دوسری بے شمار سلطنتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ ماڈرن سٹیٹ کے معیار پر اس وقت کوئی ایشیائی ریاست ماڈرن نہیں ہے۔ خود پاکستان بھی ماڈرن سٹیٹ نہیں ہے۔ اگر چہ ہمارے پاس نقد روپیہ نہیں ہے لیکن ہمارے پاس بے شمار ذرائع آمدنی ہیں۔ ہمارے پاس معدنیات ہیں۔ ہمارے پاس بندرگاہیں ہیں۔ ہمارے پاس پٹرول ہے۔ اقتصادیات کی آڑ میں ہم کو غلامی کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ اگر پاکستان ایک آزاد قوم کی طرح ہم سے معاہدہ کرنا چاہے تو ہم دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اور اگر پاکستان اس پر رضامند نہیں ہوتا تو یقیناً پاکستان کی طرف سے یہ ایک غیر جمہوری رویہ ہوگا جو ہمارے لئے کسی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتا اور اگر ہم کو اس غیر جمہوری طریقے سے مجبور کیا گیا تو بلوچ قوم کا بچہ بچہ اپنی آزادی بچانے کے لئے جان دے دے گا۔''[13]

میر غوث بخش خان بزنجو خان قلات کے نام نہاد دارالعوام کا سب سے زیادہ ترقی پسند رکن تھا۔ قیام پاکستان سے قبل اس کا سیاسی رجحان آل انڈیا کانگرس کے انڈین نیشنلزم کے ''سیکولر نظریہ'' کی جانب تھا لیکن جب کانگرس کی بورژوا ہندو قیادت کی تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کے باعث ہندوستانی قوم پرستی کے اس ''سیکولر نظریے'' کے پرخچے اڑ گئے اور برصغیر، ہندوستان اور پاکستان کی دو مملکتوں میں تقسیم ہو گیا تو بزنجو کی قوم پرستی یکا یک بلوچ شاونزم تک محدود ہو گئی تھی۔ بزنجو کی اس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دسمبر 1947ء میں اس کے سیاسی شعور کا معیار بہت ہی پست تھا۔ وہ ان خارجی اور داخلی محرکات وعوامل سے نا آشنا تھا جو برصغیر کی تقسیم کا باعث بنے تھے اور جن کی موجودگی میں ریاست قلات اور بلوچستان کی آزادی وخود مختاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بلوچستان کے علاقے کے پٹھانوں، بروہیوں، سندھیوں، بلوچیوں اور پنجابی

آبادکاروں کے باہمی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تضادات کی اہمیت سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان تضادات کو حل کیے بغیر بلوچستان کی آزادی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ اس کے جذبۂ آزادی کا طبقاتی تضادات سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ محض بلوچ قبائلی سرداروں کے مفادات تک محدود تھا۔ وہ قلات کے ''خان معظم'' کے بدترین قسم کے استبدادی نظام حکومت کے تحت بلوچستان کی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کا متمنی تھا۔ یہ وہی خان قلات تھا جس کے آباءواجداد نے پہلے 1838ء میں برطانوی سامراج کی فوجوں کو افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے اپنے علاقے سے بحفاظت گزرنے کی سہولت مہیا کی تھی۔ 1854ء میں انہوں نے پچاس ہزار روپے سالانہ وظیفہ کے عوض اپنی وفاداری برطانیہ کے پاس فروخت کردی تھی اور پھر 1876ء میں اپنی سلطنت کی آزادی سے بالکل ہی دستبردار ہو گئے تھے۔ یہ وہی خان قلات تھا جس نے 1933ء تک چاغی لیویز فورس میں بطور ایڈ جوٹنٹ برطانوی سامراج کی گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہاں تک کہ اس نے برطانیہ کے لئے سوویت یونین کے خلاف جاسوسی کے فرائض بھی سرانجام دیئے تھے۔ میر غوث بخش بزنجو اس عوام دشمن سامراجی پٹھو کی زیر قیادت بلوچستان کی آزادی کا خواہاں تھا جو اپنے انگریز ''وزیر خارجہ'' کی وساطت سے برطانوی سامراج کو اپنے آزاد بلوچستان میں ہر قسم کی فوجی اور دیگر سہولتیں دینے پر آمادہ تھا۔ دسمبر 1947ء میں بزنجو کے غیر فرقہ وارانہ بلوچ شاونزم کا نعرہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ قیام پاکستان سے قبل پنجاب کے سامراج نواز جاگیردار غیر فرقہ وارانہ پنجابی شاونزم کا نعرہ لگاتے تھے۔ بلاشبہ کراچی اور پنجاب کے مفاد پرست عناصر ابتدا ہی سے بلوچستان اور پاکستان کے دوسرے پس ماندہ علاقوں کے عوام کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق غصب کرنے کے درپے تھے اور کراچی کے ارباب اقتدار اپنی خارجی اور داخلی مصلحتوں کی بنا پر بلوچستان میں جمہوری اصلاحات رائج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے حالانکہ ماضی میں 1927ء کے بعد وہ خود مسلسل ایسی اصلاحات کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔ تاہم دسمبر 1947ء میں ایک حقائق آشنا اور صحیح معنوں میں ترقی پسند سیاسی لیڈر کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بلوچستان کے غریب، مظلوم اور پسماندہ عوام کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق ریاست قلات کے ایک ایسے عوام دشمن نواب کی زیر قیادت حاصل نہیں کئے جا سکتے جو اپنے لئے قرون وسطیٰ کی سی جاگیری سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔

بلوچستانی عوام کے حقوق کے لئے کامیاب جدوجہد عوامی میدان میں ہی ہوسکتی تھی۔ یہ کٹھن کام نواب قلات کے نام نہاد دارالعوام اور دارالامراء میں سرانجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

بلوچ ''خان معظم'' کے پٹھوؤں کے اس احتجاج میں میر غوث بخش بزنجو کے علاوہ متعدد دوسرے بلوچ مولویوں اور قبائلی سرداروں نے بھی اسی قسم کی تقریریں کیں۔ مولوی محمد عمر کا کہنا یہ تھا کہ ''بزنجو نے جو تقریر کی ہے وہ اگرچہ اس کی زبان سے نکلی ہے لیکن دراصل اس نے ایک ایک بلوچ کی ترجمانی کی ہے جو پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ ہم پاکستان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ خارجہ، دفاع اور رسل ورسائل کے امور اس کے حوالے کر دیئے جائیں۔

''اس طرح ہمارا ملک پاکستان کا جزو بن سکتا ہے اور ہماری قوم اس میں مدغم ہو جاتی ہے۔ ہم اس کو اپنی مکمل آزادی چھن جانے پر محمول کریں گے'' مولوی عرض محمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''پاکستان بڑی حکومت ہے۔ اس کو چاہیے تھا کہ ہم سے کہتا آدھا سندھ لے لو، مستجار علاقے لے لو۔ لیکن اس کے برعکس پاکستان ایکسیشن (الحاق Accession) کا زور دیکر ہماری آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے جس کے لئے ہم ہرگز ہرگز تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم ایک باعزت اور دوستانہ سمجھوتہ چاہتے ہیں اور اس رنگ میں پاکستان جو چیز ہم سے مانگے ہم دینے کو تیار ہیں۔'' مولوی نور محمد نے کہا کہ ''ہمارا پاکستان سے یہ شکوہ ہے کہ ہمارا دوست ہوتے ہوئے اس نے ہمارے حصوں یعنی خاران اور لس بیلہ کو، جو ہمارے وجود کے ایک جزو کی حیثیت سے ہیں، ہمارے ساتھ نہیں جوڑا اور نہ ہی مستجار علاقوں کے متعلق کوئی جواب دیا ہے...... جب تک پاکستان ہمارے ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کرتا، مستجار علاقے و خاران اور لس بیلہ واپس نہیں کرتا اس سے دوستی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ ہم دوستی کے لئے تیار ہیں اور دوستی کے لئے ہر خدمت اپنے اوپر بسروچشم تسلیم کریں گے لیکن اپنے ملک کو پاکستان کی حدود میں مدغم نہیں کر سکتے۔'' ملک فیض محمد خان نے کہا کہ ''پاکستان اور قلات میں دوستانہ معاہدہ ہو تو بہتر ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز طلب کی جاتی ہے جس سے ہم غلام بن جائیں اور ہماری قومی جداگانہ حیثیت نہ رہے تو ہم بلوچ اسے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔'' مرزا خدا بخش خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''اگرچہ اس وقت بلوچ قوم میں طاقت نہیں ہے لیکن اس نے اپنی روایات کو فراموش نہیں کیا۔ پاکستان کو فراخدلی سے کام لینا چاہیے تھا۔ لس بیلہ و خاران اور دیگر حصص جو ہماری قومی حکومت کے دائرے

سے اس وقت باہر ہیں، ان کے ذہن میں یہ ڈال دیا گیا ہے کہ علیحدہ رہو اور حکومت کرو......
میرے خیال میں لس بیلہ اور خاران کو پس پردہ ایسی ترغیبات دی گئی ہیں اور ان کے ساتھ
''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا سلسلہ اختیار کیا گیا ہے کہ واقعات یہ بتلا رہے ہیں کہ پاکستان کی
طرف سے جابرانہ طریق پر یہ خواہش کی جا رہی ہے کہ اپنی سلطنت کو ہر طریق سے بڑھایا
جاوے۔ ہم اپنے آپ کو چھوٹا بھائی سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کرنا
چاہتے ہیں۔ خارجی اور حفاظتی رسل ورسائل بھی ان کے سپرد کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ وہ وعدہ
کریں کہ ہمیں واپس کر دیویں گے۔ دوستانہ معاہدے کے لئے ہم بالکل تیار ہیں۔'' مرزا خدا بخش
کی اس تقریر کے بعد ایوان کے سارے ارکان نے ''بیک آواز یہ اعلان کیا کہ ہم سب متفق ہیں کہ
ایکسیشن کسی صورت میں منظور نہ کیا جاوے اور ہم باعزت دوستانہ معاہدے چاہتے ہیں۔'' [14]

اس کے بعد ''دارالامراء'' کا اجلاس ہوا جس میں سربراہ مملکت قلات بلوچی ''خان
معظم'' سر احمد یار خان نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ میری
بلوچ قوم اور حکومت خداداد پاکستان کے مابین چند ایسے مسائل ہیں جن کے سبب میری قوم میں
کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور ہر طرف سے بلوچ تعجیلی فیصلے کے لئے میری طرف
دیکھ رہے ہیں میری آپ سے اور تمام قوم سے پرزور اپیل ہے کہ جلدی مت کیجئے۔ جذبات سے
کام مت لو۔ صبر وتحمل کے ساتھ مجھے وقت دو...... دونوں حکومتوں کے نمائندے خط وکتابت اور
زبانی گفت وشنید کر رہے ہیں...... پاکستان کا بانی و معمار اعلیٰ حضرت قائداعظم دنیا کے قابل ترین
اشخاص میں سے ایک ہے۔ ان کی قابلیت اور انصاف پسندی بے مثال ہے۔ میرے ان کے
ساتھ دس سال سے دوستانہ مراسم ہیں۔ اس طویل مدت کا تجربہ یہ ہے کہ ان کے دل میں بلوچ قوم
کی فلاح وبہبود کا درد موجود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے ہر معاملے میں اپنے قیمتی مشوروں سے
نوازتے رہے۔'''' خان معظم'' نے اپنی اس تقریر کے آخر میں 4 راگست 1947ء کا وہ مشترکہ
اعلان پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت پاکستان تسلیم کرتی ہے کہ '' قلات ایک آزاد
ریاست ہے جس کا درجہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے مختلف ہے۔'' اس تقریر کے بعد
''ریاست قلات بلوچی'' کے ''دارالامراء'' کے ارکان نے بھی اسی قسم کے خیالات وجذبات کا
اظہار کیا۔ سردار بہادر نواب سر حاجی محمد اسد اللہ خان رئیسانی نے کہا کہ ''اعلیٰ حضرت خان معظم

اور قائداعظم محمد علی جناح کے جو تعلقات ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ تعلقات پدرانہ اور فرزندانہ رنگ رکھتے ہیں۔ یہ تعلقات پاکستان کے قائم ہونے سے بھی بہت پہلے کے قائم ہیں۔ اعلیٰ حضرت خان معظم جو ہمارے بادشاہ ہیں...... ہمیں یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت خان معظم سابقہ بلوچی روایات کے پیش نظر حکومت پاکستان کے ساتھ ایک ایسا خوشگوار فیصلہ فرمائیں گے جو قوم بلوچ کی آزادی وخودمختاری کو قائم رکھتے ہوئے اس کے لئے باعث عزت وسربلندی ہوگا۔'' خان صاحب وڈیرہ شیر محمد خان سربراہ، سردار صاحب رند نے کہا کہ ''اگر حکومت پاکستان خاص شرائط کے تحت حکومت قلات کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کرنا چاہتی ہے تو ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم انگریزوں کی غلامی سے نکلے ہیں۔ ہمیں اب دوسری غلامی میں جانا قبول نہیں ہے۔ ہم اپنے وطن کی ہستی کو عزت وآبرو کے ساتھ جدا رکھتے ہوئے ہر دوستانہ معاہدے کے لئے تیار ہیں۔'' خان صاحب سید اورنگ شاہ نے کہا کہ ''قائداعظم صاحب نے ریاست قلات کی آزادی کو جو تسلیم کیا ہے اس کے لئے ہم سب قائداعظم کے بہت شکرگزار ہیں۔ الحاق یا شمولیت کے لئے ہم تیار نہیں۔ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت قلات ایک باعزت طریق پر حکومت پاکستان کے ساتھ سمجھوتہ کرے۔'' خان صاحب سردار محبوب علی خان مگسی نے کہا کہ ''چونکہ اعلیٰ حضرت خان معظم اور قائداعظم صاحب کے تعلقات خوشگوار ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہر دو اسلامی حکومتوں کے مابین خوشگوار رنگ میں تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ جس سے دونوں حکومتیں خوش رہیں۔ یہ تعلقات ایک دوستانہ معاہدہ کی بنا پر ہوں نہ کہ ایسے الحاق کی صورت میں جس میں ہماری جداگانہ قومی ہستی و وقار ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔'' نواب میر نوروز خان صاحب سربراہ سردار زرک زئی نے کہا کہ ''ہم الحاق یا شمولیت کسی صورت میں گوارا نہیں کرسکتے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ حکومت قلات اور حکومت پاکستان کے مابین ایسا سمجھوتہ ہوجائے جو ہر دو کے لئے اطمینان وخوشی کا باعث ہو۔'' سردار بہادر حاجی محمد خان شاہوانی نے کہا کہ ''جس طرح پٹھان قوم کو آزادی عزیز ہے اسی طرح بلوچ بھی اسے عزیز سمجھتے ہیں۔ ہم اس امر کے لئے تیار ہیں کہ پاکستان کو بڑا بھائی سمجھیں اور اپنے کو چھوٹا بھائی۔ لیکن اس سے پہلے ہم اپنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور کسی صورت میں اپنی حاصل شدہ آزادی کو کھونے پر تیار نہیں۔ ہم اپنی مکمل آزادی وخودمختاری کو قائم رکھتے ہوئے ہر قسم کے دوستانہ معاہدہ کے لئے تیار ہیں۔'' سردار بہادر

وڈیرہ حاجی نور محمد خان بنگلزئی، خان بہادر سردار میر سمندر خان شہی، سردار میر کہرا خان بزنجو اور سردار میر غلام حیدر خان سریرہ نے فرداً فرداً مؤخرالذکر ممبر کے ساتھ اتفاق کیا[15] اور پھر صدر ایوان کے دریافت کرنے پر تمام معززین مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ ''چونکہ الحاق کی تجویز ریاست قلات اور بلوچوں کی گذشتہ روایات اور مؤرخہ 4/اگست 1947ء کے معاہدہ جاریہ مابین پاکستان و قلات اور قانون آزادئ ہند 1947ء کے سراسر منافی ہے، اس لئے حکومت پاکستان کے ساتھ مزید گفت وشنید معاہداتی تعلقات کی بنیاد پر ہونا زیادہ مفید ومناسب ہے۔''[16] چنانچہ دونوں ایوانوں کا یہ فیصلہ پاکستان کے محکمہ خارجہ کو بھیج دیا گیا۔

''مملکت قلات بلوچی'' کے سربراہ ''خان معظم'' میر احمد یار خان اور اس کے حواریوں کی ان تقریروں اور ان کے اس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ وہ سب اپنے خیالات وافکار کے لحاظ سے قرون وسطیٰ میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی سیاست میں کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ نواب قلات سر احمد یار خان ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ اور ریاست حیدرآباد (دکن) کے نواب میر عثمان علی خان کی طرح اپنی آزادی وخودمختاری کا ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا جس کی 1947ء میں تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس مقصد کے لئے ان دونوں والیان ریاست کی طرح برطانوی سامراج کی امداد و پشت پناہی کی توقع کرتا تھا۔ وہ اس احساس سے عاری تھا کہ برطانوی سامراج نے برصغیر کی دو مملکتوں میں تقسیم طوعاً وکرھاً محض اس امید میں تسلیم کی تھی کہ بٹوارہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔ 1947ء میں برصغیر کی بلقان کی طرح کی تقسیم اینگلو۔امریکی سامراج کے عالمی مفاد کے منافی تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اجتماعی سیاست کے تقاضوں کے سامنے انفرادی سطح کے پیشہ وارانہ یا دوستانہ یا برادرانہ یا فرزندانہ یا پدرانہ تعلقات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ اس نے 1936ء میں قائداعظم جناح کو اپنا آئینی مشیر مقرر کیا تھا۔ چونکہ اس نے 1943ء اور 1945ء میں قائداعظم جناح کی میزبانی کی تھی اور چونکہ 1946ء میں قائداعظم جناح نے وزارتی مشن کے روبرو اس کا میمورنڈم پیش کیا تھا اس لئے قائداعظم جناح اب 1947ء میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ماضی کے ذاتی خوش گوار تعلقات کا لحاظ کریں گے اور اسے ایک آزاد وخودمختار بلوچ سلطنت قائم کرنے کی بخوشی اجازت دے دیں گے۔ وہ اسلام اور مسلم

لیگ کے لئے اپنی ''گرانقدر'' خدمات کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلاتا تھا کہ (1) میں قائداعظم کی طویل عرصہ اپنے ہاں کوئٹہ، مستونگ اور قلات میں میز بانی کیا کرتا تھا۔ ان کو اور مس جناح کو شاہانہ انتظامات کے ساتھ خوش آمدید اور رخصت کیا جاتا تھا۔ بیش قیمت تحائف پیش کئے جاتے تھے اور ان کے قیام میں سہولت اور آرام کے لئے قیمتی اشیاء بیرون ملک سے منگوائی جاتی تھیں۔ (2) قائداعظم اور مس جناح کو پہلے چاندی میں اور پھر سونے میں تولا۔ دونوں کے وزن کے برابر چاندی اور دونوں کے وزن کے برابر سونا ان کی نذر کیا'' مجھے یاد ہے کہ ستمبر 1945ء میں وہ بمبئی سے بلوچستان آئے۔ قائداعظم اور مس جناح کا وزن علی الترتیب 124 پونڈ اور 104 پونڈ بنتا تھا۔ جب یہ دونوں رخصت ہوئے تھے تو ان کا وزن علی الترتیب 112 پونڈ اور 111 پونڈ تھا۔ اس وزن کے مطابق چاندی اور سونا انہیں پیش کیا۔ ایک لاکھ روپے کی مالیت کا ہار مس جناح کو اس کے علاوہ پیش کیا۔ اس پر دونوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ میں نے کہا یہ ہمارا بلوچی دستور ہے۔'' (3) قائداعظم پر جب کسی مغالطے میں یا دانستہ خاکساروں نے قاتلانہ حملہ کیا تو میں نے ان کی حفاظت کے لئے اپنا ذاتی باڈی گارڈ ان کے حوالے کر دیا۔ یہ باڈی گارڈ دہلی، بمبئی وغیرہ میں اور پھر کراچی میں 7راگست 1947ء تک ان کی حفاظت پر رہا۔''[17] لیکن ذاتی تعلقات کے اس پس منظر کے باوجود قائداعظم جناح نے اکتوبر 1947ء میں بطور گورنر جنرل پاکستان ''خان معظم'' کو ایک بڑے بھائی اور دوست کی حیثیت سے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر لے۔ یہ مشورہ اس وقت کے خارجی و داخلی سیاست کے ایسے تقاضوں کے مطابق تھا جن کے پیش نظر ماضی کے ذاتی تعلقات اور اپنی پوزیشن کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ گورنر جنرل پاکستان اس کے علاوہ کوئی اور مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔

جب خان قلات کے نام نہاد دونوں ایوانوں کا متذکرہ فیصلہ جنوری 1948ء میں پاکستان کے محکمہ خارجہ میں پہنچا تو اس کے چند دن بعد 13رجنوری کو قلات کے وزیر دفاع لیفٹیننٹ کرنل میر حیدر خان نے پشاور میں پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی مگر اس کا بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ 2رفروری کو خان قلات کے ''وزیراعظم'' نوابزادہ محمد اسلم نے کراچی میں قائداعظم سے ملاقات کر کے قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے مسئلہ پر بات چیت کی تھی اور اس بات چیت کے بعد قائداعظم نے خان کے نام ایک دستی خط میں اسے ایک مرتبہ اور مشورہ دیا تھا

کہ ”میں تمہارے ایک دوست اور خیر خواہ کی حیثیت سے تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم مزید تاخیر کے بغیر پاکستان میں شامل ہو جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملے پر اچھی طرح غور کر کے مجھے اپنے قطعی جواب سے مطلع کرو گے۔ تم نے مطلوبہ قطعی جواب کا وعدہ کراچی میں مجھ سے اس ملاقات کے دوران کیا تھا جس میں ہم نے اس سارے سوال کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی تھی۔“ [18]

قائداعظم کا دورۂ سبی اور اس کا خارجی و داخلی پس منظر

متذکرہ ملاقات کے چند دن بعد 11 رفروری کو گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سبی پہنچے۔ چونکہ گورنر جنرل نے سبی میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران بلوچستان اور قلات کے بارے میں حکومت پاکستان کے نہایت اہم فیصلے کا اعلان کرنا تھا اس لئے مرکزی محکمہ اطلاعات نے بہت سے پاکستانی، برطانوی اور امریکی نامہ نگاروں کو ایک خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعے 10 رفروری کو ہی سبی پہنچا دیا تھا۔

گورنر جنرل کے اس تاریخی دورے کا بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ اینگلو۔ امریکی سامراج نے ایران میں سوویت یونین کے خطرے کا سد باب کرنے کے بعد مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان سے بھی فوجی معاہدے کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کراچی کے روزنامہ ”ڈان“ کی لندن سے رپورٹ یہ تھی کہ ”برطانیہ ایک فوجی معاہدے کے لئے بہت جلد ہندوستان اور پاکستان سے رابطہ پیدا کرے گا۔ اس معاہدے کا مقصد یہ ہوگا کہ بحر ہند، شمالی کشمیر اور نیپال سے اشترا کی جارحیت کے سد باب کے لئے طاقتور دفاعی مراکز قائم کئے جائیں۔“ [19] 9 رجنوری کو افغانستان کا وزیراعظم سردار محمود شاہ غازی کراچی آیا تھا جہاں وہ تین چار دن تک قیام کرنے کے بعد براستہ کوئٹہ واپس کابل گیا تھا۔ کوئٹہ میں خان قلات نے دو دن اس کی میزبانی کی تھی۔ 15 رجون کو برطانیہ اور عراق کے درمیان 1930ء کے اینگلو۔عراقی معاہدے کی جگہ ایک نئے 15 سالہ دفاعی معاہدے پر دستخط کئے گئے تھے جس میں قرار دیا گیا تھا کہ نہ صرف جنگ کی صورت میں برطانیہ کی افواج عراق میں قیام کرسکیں گی بلکہ امن کے حالات میں بھی برطانیہ کو عراق میں فوجی سہولتیں مہیا ہوں گی۔ جب اس معاہدے کی خبر بغداد پہنچی تھی تو وہاں کے قوم پرست عناصر نے برطانوی سامراج اور اس کے پٹھو وزیراعظم صالح جبر کی حکومت

کے خلاف زبردست مظاہرے شروع کر دیئے تھے۔ تاہم ''ڈان'' کی پہلی خبر تو یہ تھی کہ برطانیہ کا وزیر خارجہ ارنسٹ بیون(Ernest Beven) مشرق وسطیٰ کے دوسرے تمام ممالک سے بھی 15رجنوری کے اینگلو۔عراقی معاہدے کی طرح کے دفاعی معاہدے کرنے کا خواہاں ہے۔ خبر میں مزید کہا گیا تھا کہ اس وقت برطانیہ کا سعودی عرب، یمن، شام اور لبنان کے ساتھ کوئی دفاعی معاہدہ نہیں ہے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ لندن میں یہ افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ سعودی عرب کا وزیر خارجہ امیر فیصل عنقریب برطانیہ کا دورہ کرے گا۔''[20] اور دو تین دن بعد دوسری خبر یہ تھی کہ برطانوی وزیر خارجہ بیون نے مشرق وسطیٰ میں فوجی گٹھ جوڑ کا جو منصوبہ بنایا ہے عرب ملکوں میں اس کے خلاف سخت غم وغصہ پھیل رہا ہے۔ لندن میں مقیم عرب طلباء نے ایک جلسہ میں اعلان کیا ہے کہ ہم نے 15رجنوری کے اینگلو۔عراقی معاہدے کے خلاف بغداد میں جو مظاہرے کئے ہیں وہ تو محض ایک ابتدا ہیں۔ سارے عرب طلباء اور عرب نوجوان اس قومی تذلیل کے خلاف بغاوت کریں گے۔''[21]

جنوری کے آخری ہفتے میں بغداد میں شدید ترین مظاہرے ہوئے جن میں 15 طلباء ہلاک ہوئے تھے۔ چنانچہ عراقی پارلیمنٹ کے 30ارکان اور چار وزراء بطور احتجاج مستعفی ہو گئے اور اسی دن 27رجنوری کو صالح جبر کی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا تھا۔ 29رجنوری کو عراق میں ایک قوم پرست لیڈر سید محمد صدر کی سربراہی میں نئی حکومت قائم ہوئی تو 2رفروری کو سوویت یونین نے ایران کی حکومت کے نام ایک سخت احتجاجی نوٹ میں متنبہ کیا تھا کہ ''ایران میں امریکی فوجی مشن کی سرگرمیوں کے باعث سوویت یونین کی سرحدوں کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔'' سوویت یونین کی جانب سے ایران کو اس انتباہ کے دو دن بعد 4رفروری کو عراق کی نئی کابینہ نے 15رجنوری 1948ء کے اینگلو۔عراقی فوجی معاہدے کو مسترد کر دیا تھا اور 5رفروری کو لندن کے ہفت روزہ ''نیوسٹیٹسمین'' کا تبصرہ یہ تھا کہ ایران کے نام سوویت نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''روسی عالمی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ میں دوسرے محاذ کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگر روسیوں نے مشرق وسطیٰ میں فتح حاصل کر لی تو یورپ میں ''مارشل پلان'' بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اس طرح مغربی طاقتوں کو تیل کی سپلائی بند ہو جائے گی اور فوجی طاقت کا توازن ایک بار پھر سوویت یونین کے حق میں ہو جائے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر برطانوی وزیر خارجہ بیون نے مشرق وسطیٰ کے فلاحین (غریب کسانوں) کو جاگیردارانہ استحصال سے نجات دلانے کی پالیسی کو ترک کر کے

ایسے عناصر کے مشورہ پر عمل شروع کر دیا ہے جن کا مؤقف یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ سے روسیوں کو باہر رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ عربوں کے ایسے ٹولوں سے اشتراک عمل کیا جائے جو معاشرتی انقلاب سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ وہ ہر اس مغربی ملک کے ساتھ سودا کر لیں گے جو ان کے تیل خرید کر انہیں ہتھیار دے گا۔''

قائداعظم کے اس دورۂ بلوچستان کا داخلی پس منظر یہ تھا کہ 8 رفروری کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں تنازعہ کشمیر پر بحث حکومت ہند کی خواہش کے مطابق ملتوی ہوگئی تھی اور آثار یہ تھے کہ اب حکومت ہندوستان کے سفارتی دباؤ کی وجہ سے اقوام متحدہ کے ذریعے اس تنازعے کے پرامن تصفیہ کا امکان نہیں رہا اور اس کا فیصلہ میدان جنگ میں ہی ہوگا۔ سندھ میں کراچی کی صوبہ سے علیحدگی کی تجویز کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن جاری تھی۔ مشرقی پاکستان میں لسانی تنازعہ روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا اور پنجاب میں ممتاز دولتانہ اور نواب ممدوٹ کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کھلم کھلا شروع ہو چکی تھی جبکہ صوبہ سرحد میں وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے سیاسی مخالفین کے خلاف ایسی سکھا شاہی شروع کر دی تھی کہ ملک کے جمہوریت پسند عناصر بلبلا اٹھے تھے۔ بلوچستان میں عوام الناس کے لئے ''ایجنٹ راج'' ناقابل برداشت ہو گیا تھا جبکہ کاروباری ہندوؤں کے انخلا کے باعث اس سرحدی علاقے کی معیشت بہت دگرگوں ہوگئی تھی۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے بلوچستان مسلم لیگ کی جانب سے 20 رجنوری کو حکومت پاکستان کے روبرو ایک میمورنڈم میں کہا گیا تھا کہ بلوچستان کے بارے میں جس غفلت کو روا رکھا جا رہا ہے اس سے مقامی دشمنان پاکستان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں فوری طور پر ''ایجنٹ راج'' ختم کر کے جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔ صوبہ میں عوام کی ایک نمائندہ حکومت قائم کی جائے اور مرکزی کابینہ میں ایک بلوچستانی نمائندے کو شامل کیا جائے۔ میمورنڈم میں مزید مطالبہ کیا گیا تھا کہ بلوچستان میں سکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ بڑھا کر اسے ڈگری کالج بنایا جائے۔ عوام کے علاج معالجے کے لئے ''کوالیفائیڈ ڈاکٹروں'' کا انتظام کیا جائے، ایک ریڈیو سٹیشن قائم کیا جائے، کوئٹہ کی متروکہ کانوں کو ایسے لوگوں کے حوالے کیا جائے جو ان میں سے کوئلہ نکال کر ملک کی صنعتی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور ایسے کارخانے قائم کئے جائیں جن کے لئے خام مال مقامی طور پر مہیا ہوسکتا ہے۔''[22] 26 رجنوری کو

ژوب اور لورالائی کے مسلم لیگی رہنماؤں اور قبائلی سرداروں کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ چونکہ بلوچستان ملک کے دفاع کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے اس لئے یہاں نمائندہ حکومت قائم کی جائے اور مرکزی کابینہ میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے۔ [23]

29 رجنوری کو بلوچستان مسلم لیگ کے نائب صدر میر قادر بخش زہری نے پاکستان کے وزیر تجارت کو ایک دس نکاتی میمورنڈم پیش کر کے مطالبہ کیا تھا کہ ملک کی تجارت میں بلوچستان کے لوگوں کو حصہ لینے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ بلوچستان کے لئے الگ ڈالر کوٹہ مقرر کیا جائے اور وہ درآمدی و برآمدی لائسنس جو پہلے ہندوؤں کو دیئے جاتے تھے وہ مقامی مسلم لیگ کی سفارش کے مطابق مسلمان تاجروں کو دیئے جائیں۔ کوئٹہ میں حبیب بنک کی ایک شاخ کھولی جائے کیونکہ امپیریل بنک آف انڈیا کاروباری حلقوں کے مطالبات پورے نہیں کر سکتا۔ مزید براں پورے صوبہ میں کوآپریٹو بنک کھولے جائیں۔ [24]

قائداعظم سے خان قلات و دیگر سرداروں کا پرانے نظام کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا مطالبہ

تاہم جب 3 رفروری کو کراچی سے یہ اعلان ہوا کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح 10 رفروری کو سبی کے لئے روانہ ہوں گے جہاں وہ چار روزہ قیام کے دوران ممتاز قبائلی لیڈروں اور دوسرے بلوچستانی لیڈروں سے ملاقاتیں کریں گے تو اس کے پانچ چھ دن بعد بلوچستانی پٹھانوں کے کاکڑ قبیلہ کے سردار اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن نواب محمد خان جوگیزئی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ بلوچستان کے لئے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ قبل از وقت ہے کیونکہ ابھی بلوچستان کے لوگ صوبہ کا نظم ونسق چلانے کے اہل نہیں ہیں۔ اگر آج سرداری نظام اور جرگہ سسٹم ختم کر دیا جائے تو پورے بلوچستان میں افراتفری مچ جائے گی۔ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس نے قبل از وقت بنیادی اصلاحات کر کے عوام کی حالت بہتر کرنے کی کوشش کی تھی۔ بلوچستان میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کی جانب پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ یہاں کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو نظم ونسق چلانے کے کام میں ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کی امداد کرے۔ فی الحال بلوچستان کے مسئلے کا بظاہر حل یہی ہوسکتا ہے۔'' [25]

قائداعظم نے سبی پہنچنے کے اگلے دن 12رفروری کو صبح شاہی جرگہ کے ارکان، بلوچستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان اور قلات کے قبائلی سرداروں کے وفود سے ملاقاتیں کیں اور پھر انہوں نے سہ پہر کو نائب تحصیل دار کے عہدہ تک کے سول اہلکاروں سے خطاب کیا۔ کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' نے قائداعظم کی ان مصروفیتوں کے بارے میں 14رفروری کو جو رپورٹ شائع کی اس میں بتایا گیا تھا کہ ''شاہی جرگہ کے ارکان کا مطالبہ یہ ہے کہ ''ان کے جرگہ کو زیادہ اختیارات دیئے جائیں کیونکہ بلوچستان ابھی صوبائی خودمختاری کی حدتک کی اصلاحات کے لئے تیار نہیں ہے۔'' ڈان نے اس جرگہ سسٹم کو مختصراً یوں بیان کیا تھا کہ'' برطانوی بلوچستان دو حصوں......اے اور بی...... میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کوئٹہ میونسپلٹی اور پانچ اضلاع پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصہ میں مختلف قبائل کے پہاڑی علاقے شامل ہیں۔ پہلے حصہ میں سارے دیوانی اورفوج داری تنازعات کا فیصلہ برطانوی قانون کے تحت عدالتوں میں ہوتا ہے لیکن دوسرے حصہ میں سارے تنازعات کے فیصلے ضلعی اورشاہی جرگہ میں ہوتے ہیں۔ چھوٹے تنازعات کا فیصلہ ضلعی جرگہ میں اور بڑے مقدموں کا فیصلہ شاہی جرگہ میں ہوتا ہے۔ جرگہ کے فیصلے کسی قاعدہ وقانون کے تحت نہیں ہوتے اور ان فیصلوں کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کو نظر ثانی کی درخواست دی جاسکتی ہے۔'' ڈان کی مزید رپورٹ یہ تھی کہ صوبائی مسلم لیگ اس سسٹم کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس کی مجلس عاملہ کے وفد نے قائداعظم سے ملاقات کے دوران اپنی 7رفروری کی قرارداد کے مطابق یہ مطالبہ کیا ہے کہ بلوچستان میں مکمل جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں اور مرکزی کابینہ میں بلوچستانی نمائندہ کو شامل کیا جائے۔ اس وفد کی رائے یہ ہے کہ اگر جرگہ سسٹم کو برقرار رکھنا ہی ہے تو اس کے ارکان کی نامزدگی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان کا باقاعدہ انتخاب ہونا چاہیئے۔'' اس رپورٹ کے آخر میں بتایا گیا تھا کہ ریاست قلات کے قبائلی سرداروں کے وفد نے قائداعظم کے روبرو ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ قیام پاکستان کے بعد قلات میں کوئی پولیٹیکل ایجنٹ نہیں ہے اس لئے انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ خان قلات ان کے حقوق و مراعات میں دخل اندازی کرے گا۔ یہ قبائلی سردار ریاست قلات کے شمالی علاقوں یعنی سرنام، جھلاواں اور کچھی کے رہنے والے ہیں۔ ریاست قلات کے جنوب میں خاران اور لس بیلہ کی ریاستیں ہیں جو اپنی آزادی کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن قلات کا اصرار

یہ ہے کہ اسے ان پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ خاران اور لس بیلہ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کی درخواست دے رکھی ہے لیکن ابھی تک انکی اس درخواست کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔"[26] اسی دن ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی رپورٹ یہ تھی کہ "بلوچستان کی سیاست ایسی ہی پیچیدہ اور بے رنگ ہے جیسی کہ اس کی سرزمین ہے۔ پاکستان کے اس پسماندہ صوبہ میں قائداعظم کے اس دورہ کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے متضاد مفادات میں مفاہمت پیدا کر کے انہیں صوبہ کی ترقی کے مشترکہ نصب العین کے تحت متحد کیا جائے۔ ایک طرف تو ریاست قلات کے الحاق کا مسئلہ گورنر جنرل کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور دوسری طرف فیوڈل سردار اور عوامی لیڈر ایسے اقدامات کا مطالبہ کر رہے ہیں جن سے ان کی اپنی اپنی پوزیشن کو تقویت ملے۔ فیوڈل سردار اپنے حقوق و مراعات کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں جبکہ عوامی لیڈر آئینی اصلاحات کے خواہاں ہیں۔ قائداعظم نے آج صبح شاہی جرگہ سے خطاب کیا جو قبائلی سرداروں کی نامزد اسمبلی ہے۔ 55 ارکان پر مشتمل اس شاہی جرگہ کی عنان قیادت نواب محمد خان جوگیزئی کے ہاتھ میں ہے۔"[27]

13 رفروری کو قائداعظم نے سبی میں خان آف قلات سے ملاقات کی اور اسے ایک مرتبہ اور مشورہ دیا کہ دوسرے والیان ریاست کی طرح الحاق نامے پر دستخط کر دے۔ مگر "خان معظم" ابھی تک اپنے شہنشاہی خواب سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اس مشورے کو قبول نہ کیا اور اپنی مملکت کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لئے اپنی "بلوچ کنفیڈریسی" کی طرف سے یہ چار شرائط پیش کیں کہ (1) بلوچوں کے قدیم تاریخی اور روایتی رسم و رواج میں ان کی مرضی و منشا معلوم کئے بغیر کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ حفظ ماتقدم اور گارنٹی کے طور پر ایک دستاویز پر خان اور قائداعظم دستخط کریں۔ (2) الحاق سے متعلق جب بھی کوئی معاہدہ ضبط تحریر میں لایا جائے "بلوچ کنفیڈریسی" کے قبائلی سرداروں کی اجتماعی موجودگی ضروری ہے اور ان کے سامنے ہی خان اور قائداعظم دونوں دستخط ثبت کریں۔ (3) تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور اسلام کی سربلندی و ناموس کے لئے خان بلوچ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، قائداعظم اور حکومت پاکستان سرکاری طور پر ایک اعلامیہ کے ذریعے اعتراف کریں اور سراہیں تاکہ ان کے (خان بلوچ کے) کارہائے نمایاں تاریخ میں جگہ پاسکیں اور بلوچ قوم اسے سرمایۂ عزت خیال کرے۔ (4) قائداعظم بلوچوں کے روایتی اجتماع میں سرداران قبائل کو ان کے اعزازات کے مطابق ان کی

تحریک پاکستان میں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خراج تحسین ادا کریں کیونکہ یہ امر بلوچوں کے روایتی تقاضوں کے تحت لازمی ہے۔"[28] قدرتی طور پر گورنر جنرل پاکستان کے لئے مشروط یا ضمانتی معاہداتی الحاق کی یہ پیش کش قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی حالانکہ خان قلات نے اس ملاقات میں قائداعظم سے اپنے دس سالہ دوستانہ مراسم کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ ملاقات کسی سمجھوتے کے بغیر ختم ہوئی تو یہ طے پایا کہ اگلے دن اس مسئلہ پر بات چیت ہوگی۔ مگر اسی شام "خان معظم" اپنے سرمائی دارالحکومت ڈھاڈر چلا گیا اور پھر بیماری کا عذر کر کے خلاف وعدہ 14 رفروری کو سبی نہ آیا۔

تاہم پروگرام کے مطابق اس دن پہلے تو قبائلی سرداروں نے گورنر جنرل کے روبرو اپنا میمورنڈم پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ "بلوچستان میں شریعت کے مطابق دیوانی اور فوج داری قوانین نافذ کئے جائیں اور ایسی آئینی اصلاحات نافذ نہ کی جائیں جو ان کی موجودہ پوزیشن اور درجہ پر اثر انداز ہوسکتی ہوں۔"[29] بالفاظِ دیگر وہ اپنے جاگیرداری وقبائلی حقوق ومراعات کے تحفظ کے لئے انگریزوں کا رائج کردہ سرداری و جرگہ نظام برقرار رکھنا چاہتے تھے جسے وہ اسلامی شریعت کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ انہیں خطرہ لاحق تھا کہ اگر بلوچستان مسلم لیگ کے مطالبہ کے مطابق آئینی اصلاحات نافذ کی گئیں تو ان کے سرداری الاؤنس بند ہو جائیں گے، وہ قبائلی عوام سے سرداری ٹیکس وصول نہیں کرسکیں گے، ان کے عدالتی اختیارات ختم ہو جائیں گے اور یہ صورت حال اسلام کے سراسر منافی ہوگی۔ وہ بلوچستان لیبر فیڈریشن کے سخت دشمن تھے جو آئینی اصلاحات کے علاوہ محنت کشوں کے لئے حقوق ومراعات کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس فیڈریشن کے زیر اہتمام 12 رفروری کو سبی میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا تھا جس میں بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ نے متنبہ کیا تھا کہ ملک میں طبقاتی امتیازات پیدا نہ کئے جائیں اور ایک طاقتور اور خوشحال پاکستان کی تعمیر کے لئے امراء کو بھی غریبوں کے ساتھ مل کر قربانی کرنا چاہیے۔

قائداعظم کا اعلان سبی......صوبائی درجہ دینے کے وعدہ سے انحراف

قائداعظم نے قبائلی سرداروں سے متذکرہ میمورنڈم کی وصولی کے بعد روایتی شاہی دربار کو خطاب کرتے ہوئے ایک تاریخی اعلان کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ چونکہ دستور ساز اسمبلی کو پاکستان کا آئین مرتب کرنے میں ڈیڑھ دو سال کا عرصہ لگ جائے گا اس لئے بلوچستان میں فوری طور پر آئینی اصلاحات نافذ کرنا ممکن نہیں۔ تاہم اس عبوری دور کے لئے اس صوبہ کا

نظم ونسق براہ راست گورنر جنرل کی نگرانی میں چلایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے گورنر جنرل کی ایک مشاورتی کونسل نامزد کی جائے گی۔ اس مشاورتی کونسل میں صوبہ کے سارے مفادات کو نمائندگی دی جائے گی۔ کونسل کسی بھی مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے چیف کمشنر کی وساطت سے گورنر جنرل کے روبرو پیش کرنے کی مجاز ہوگی اور گورنر جنرل کسی بھی معاملے کے بارے میں کونسل کی رائے طلب کر سکے گا۔ کونسل صوبہ کے سالانہ بجٹ کا تفصیل سے جائزہ لے گی اور اسے بجٹ میں ردوبدل کے لئے گورنر جنرل کے روبرو اپنی سفارشات پیش کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ آئندہ صوبہ کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے سارے منصوبے مشاورتی کونسل کے ذریعے تیار کئے جائیں گے اور گورنر جنرل اس امر کا انتظام کرے گا کہ یہ منصوبے کونسل کے مشورہ کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ تاہم اس کونسل کے قیام سے چیف کمشنر کے زیر انتظام علاقوں اور قبائلی علاقوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور ان علاقوں کے لوگوں کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنی رسوم وروایات کے مطابق اپنے لئے آئین مرتب کریں اور انتظامیہ کی تشکیل کریں۔ جیسا کہ میں پہلے حکم صادر کر چکا ہوں اور علاقوں میں وہ سارے قوانین نافذ رہیں گے جو برطانوی عہد میں نافذ کئے گئے تھے اور الاؤنسوں اور مالی امداد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ان وجوہ کی بنا پر آئندہ یہ صوبہ کئی لحاظ سے پاکستان کے دوسرے صوبوں سے بہتر ہوگا۔ یہ گورنر جنرل کا صوبہ ہوگا اور یہاں کے عوام کی دیکھ بھال کی خصوصی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگی۔''[30]

چونکہ قائداعظم کا یہ اعلان بلوچستان کے بارے میں مسلم لیگ کی گذشتہ دس سال کی پالیسی کے منافی تھا اس لئے نہ صرف بلوچستان کے عوامی حلقوں بلکہ پورے پاکستان کے جمہوریت پسندوں کو اس پر خاصی مایوسی ہوئی جس کا اظہار 15 رفروری کو قائداعظم کی سبی میں منعقدہ پریس کانفرنس میں بھی ہوا۔ اس کانفرنس میں جب یہ پوچھا گیا کہ بلوچستان کو گورنر جنرل کا صوبہ کیوں بنایا گیا ہے اور کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں تو قائداعظم کا جواب یہ تھا کہ ''میرے خیال میں یہ انتظام بلوچستان کے لئے بہتر ہوگا۔ ہر کام جلدی سے ہوگا اور پارلیمانی مباحثے کی وجہ سے اس میں تاخیر نہیں ہوگی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آمریت کے حق میں ہوں۔'' قائداعظم نے مزید کہا کہ ''پاکستان کے دوسرے صوبے پارلیمانی اصلاحات کے سارے ابتدائی مراحل سے گزرے ہیں اس لئے وہ پارلیمانی حکومتیں چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

بلوچستان میں اس کام کا سارا بوجھ گورنر جنرل پر ڈالنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ بلوچستان کے عوام پوری طرح منظم نہیں ہیں اور وہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہی ہیں تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میری حکومت اس علاقے کو صوبائی درجہ دینے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ مناسب وقت پر اسے مکمل طور پر صوبائی درجہ دیا جائے گا۔'' ایک اور سوال کے جواب میں قائداعظم نے بتایا کہ ''خان قلات نے اپنی ریاست کے الحاق کے بارے میں مشورہ کرنے کے لئے اپنی پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا ہے امید ہے کہ یہ پارلیمنٹ ماہ رواں کے اواخر میں فیصلہ کر لے گی۔''[31]

قائداعظم کے آخری جواب کی بنیاد یہ تھی کہ جب خان قلات اپنے وعدے کے برعکس 14رفروری کو سبی نہیں آیا تھا تو محکمہ خارجہ کے سیکرٹری کرنل اے۔ ایس۔ بی شاہ کو اس کے پاس ڈھاڈر بھیجا گیا تھا جہاں اس نے قلات کے الحاق کے بارے میں مفصل بات چیت کی تھی جس کے نتیجہ میں خان نے قائداعظم کے نام ایک مفصل خط میں بتایا تھا کہ ''میں نے الحاق کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی ''پارلیمنٹ'' کا اجلاس 21رفروری کو طلب کیا ہے۔'' کرنل شاہ نے اسی دن سبی واپس آ کر خان قلات کا خط اور زبانی پیغام قائداعظم کو دیا اور پھر خان کے نام ایک جوابی خط میں لکھا کہ میں نے قائداعظم کو بتا دیا ہے کہ (1) آپ بالآخر قلاتی عوام کی بھلائی کی خاطر ریاست قلات کو پاکستان کے ساتھ مدغم کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔(2) آپ نے دارالعوام اور دارالامراء کا اجلاس ماہ رواں کی 21رتاریخ کو بلایا ہے اور یہ کہ آپ اپنے ان دونوں ایوانوں کے فیصلے سے ہمیں آگاہ کر دیں گے۔ قائداعظم نے اس بنا پر مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انہیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا ہے کہ آپ کی طبعیت ناساز ہو گئی تھی۔ انہیں یہ امید ہے کہ آپ اپنے قطعی فیصلے سے ماہ رواں کے آخر تک اطلاع دے دیں گے۔''[32]

باب نمبر: 7

ریاست قلات کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا ڈرامہ

آزاد ریاست قلات کا وجود اور سامراجی مفادات

خان قلات کے دیوان عام کا اجلاس اس کی موعودہ تاریخ 21رفروری کے بجائے 25رفروری کو ڈھاڈر میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے مسئلہ پر ایوان کا مؤقف اب بھی وہی ہے جو 14ردسمبر 1947ء کو اختیار کیا گیا تھا یعنی یہ کہ قلات اور پاکستان کے درمیان تعلقات ایک معاہدہ کی بنیاد پر استوار ہونے چاہئیں۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ قلات کے دونوں ایوانوں اور حکومت کا ایک وفد کراچی جا کر دونوں مملکتوں کے درمیان تعلقات کے بارے میں سابقہ حکومت ہند کے اس اعلان کی روشنی میں گفت وشنید کرے گا جس میں قلات کی آزادی کو تسلیم کیا گیا تھا۔[1] ظاہر ہے کہ یہ قرارداد خان قلات کے اس پیغام کے منافی تھی جو اس نے 14رفروری کو کرنل اے۔ایس۔بی شاہ کی وساطت سے قائداعظم کو بھیجا تھا۔

اس قرارداد کے بین الاقوامی پس منظر میں بعض برطانوی عناصر کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ اگر حکومت پاکستان نے خان آف قلات سے کوئی اطمینان بخش سمجھوتہ نہ کیا تو اس علاقے میں بدامنی ہوگی جس کی بنا پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان تصادم کا خطرہ لاحق ہوجائے گا اور اگر یہ تصادم ہو گیا تو سوویت یونین اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ افغانستان میں سابق برطانوی سفیر سر ولیم فریزر ٹائٹلر (William Fraser Tytler) کی رائے یہ تھی کہ اگر پاک افغان سرحد پر آتشگیر مادہ میں شعلے بھڑک اٹھے تو اس سے روس کو ''اپنے مواقع'' مل جائیں گے۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ جرمنی اور جاپان کا خطرہ دور ہو جانے کے بعد اور دریائے اوکس کے اس پار نئی

جمہوریتوں میں بڑھتی ہوئی صنعت کاری کے باعث روسیوں نے جنوب کی طرف کراچی پر اپنی نظریں ڈالی ہوئی ہیں۔ زود یا بدیران کے کاکیشیا سے لے کر پامیر تک طویل جنوبی سرحد کے ساتھ ایک گرم پانی کی بندرگاہ کی ضرورت ناگزیر ہو جائے گی اور بظاہر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کراچی کا انتخاب ہوگا۔ تاہم روسیوں کی اس جانب پیش قدمی اسی صورت میں ہوگی کہ دریائے اوکس کے جنوبی ممالک میں دیرینہ عدم استحکام کا مظاہرہ ہوتا رہے۔''[2]

لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ (Economist) کا خیال یہ تھا کہ ''خان آف قلات کو یہ خطرہ ہے کہ اگر اس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا تو اس کی ریاست ایک بادشاہ کی بجائے دوسرے بادشاہ کے زیر نگیں چلی جائے گی۔ خان مستجار علاقوں کے پرانے معاہدوں کی شرائط سے غیر مطمئن ہے اور وہ ان پر اپنے حق نظر ثانی کا خواہاں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کوئٹہ جیسے مضافات کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے اس کے پاس انتظامی عملہ نہیں ہے اور وہ افغانستان اور ایران کے ساتھ سرحد کی فوجی ذمہ داری تنہا اپنے کندھوں پر بھی لینا نہیں چاہتا ہے۔ لیکن اس کا اصرار ہے کہ مستجار علاقوں پر اس کے بنیادی اقتدار اعلیٰ کو، بالخصوص معدنی حقوق کو تسلیم کرنا چاہیے۔ پاکستان خان کے ان دعووں کو تسلیم کرنے میں بہت تامل کرتا رہا ہے۔ لیکن دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان دعووں کو زیادہ سے زیادہ حد تک تسلیم کر لیا جائے کیونکہ پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ اس کے پہلو میں ایک طاقتور اور دوست ریاست قلات کا وجود ہو۔ اگر پاکستان درہ بولان، کوئٹہ اور مغرب کی جانب ایران کی سرحد تک کی ریلوے لائن کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے اور اس طرح افغانستان کی جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ دفاعی نظام کو برقرار رکھنے کا خواہاں ہے تو یہ ضروری ہے کہ بلوچستان کے اندر قبائل کے ساتھ تعلقات میں کوئی خرابی پیدا نہ کی جائے اور اس مقصد کے تکمیل کی بہترین ضمانت یہ ہے کہ خان کے اقتدار کو برقرار رکھا جائے۔ اگر پاکستان نے بزور قوت خان کو اس کے دارالحکومت سے نکال بھی دیا تو اس وسیع و عریض پہاڑی علاقے میں براہ راست نظم و نسق قائم کرنے سے پاکستان کے مالی اور انتظامی ذرائع پر ایسے وقت میں بہت بوجھ پڑے گا جبکہ مسٹر جناح کو دوسرے بہت بڑے مسائل درپیش ہیں۔ لہٰذا امید کرنی چاہیے کہ پاکستان اور قلات کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ قلات پاکستان کا ایک مضبوط اتحادی بن جائے گا جبکہ اس کی آزادی میں نامناسب مداخلت نہیں ہوگی اور اس طرح ایشیا میں بدامنی کے

ایک اور مرکز کا اضافہ نہیں ہوگا۔ اگر قلات نے پاکستان کے دباؤ کی مزاحمت کرنے کے لئے افغانستان کی حمایت طلب کی تو سنگین نتائج سے بھرپور صورت حال پیدا ہونے کا امکان ہوگا۔''[3]
لندن کے ایک سوشلسٹ ہفت روزہ پیپل (People) کی رائے یہ تھی کہ ''حال ہی میں جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس کی وجہ سے افغانستان سوویت یونین کے حلقۂ اثر میں چلا گیا ہے اور افغانوں کو یہ ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ بلوچستان میں ایک بندرگاہ پر قبضہ کرلیں۔ اس طرح روس کو بحر ہند میں پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔''[4]

خان کے ''دارالعوام'' میں اس قرارداد کی منظوری کے بعد اس کا انگریز وزیر خارجہ ڈوگلس فل لندن روانہ ہوگیا جبکہ قلات نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری میر غوث بخش بزنجو نے ایک انٹرویو میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان اور قلات کے درمیان سمجھوتے کے راستے میں واحد رکاوٹ یہ ہے کہ الحاق اور معاہدے کے تنازعہ کا کوئی تصفیہ نہیں ہوسکا۔ اس نے کہا کہ ''یہ محض وقار کا سوال ہے۔ کوئی بڑے اختلافی مسائل نہیں ہیں کیونکہ ہم دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے تمام امور پاکستان کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان جو کہ خود ایک جمہوری ریاست ہے، ہمارے عوام کی منشا کے خلاف کوئی کارروائی کرنا پسند نہیں کرے گی۔''[5] میر غوث بخش بزنجو کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔ یہ محض وقار کا سوال نہیں تھا۔ اصل سوال یہ تھا کہ اس کا ''خان معظم'' کوئٹہ اور چیف کمشنر کے زیر انتظام دوسرے علاقوں پر اپنی ملکیت کا قانونی حق منوانا چاہتا تھا۔ اس کی نظریں اس علاقے کے معدنی ذرائع پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی آزاد و خودمختار سلطنت کے پاکستان کے ساتھ ایک ایسے معاہدے کے تحت تعلقات استوار ہوں کہ سابقہ برطانوی بلوچستان کے دفاع اور نظم و نسق اور مواصلات کی ذمہ داری تو پاکستان پر عائد ہو لیکن اس علاقے کی معدنی دولت سے وہ خود گلچھرے اڑائے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کے علاقے میں قرون وسطیٰ کا استبدادی نظام قائم رہے۔ وہ بلوچوں کی دیرینہ رسوم و روایات کو برقرار رکھنے پر بہت زور دیتا تھا اور وہ رسوم و روایات یہ تھیں کہ غریب بلوچ عوام بدستور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہیں اور قبائلی سردار اپنے ''خان معظم'' کی سربراہی میں ان کا خون چوستے رہیں۔ اس نے اپنا یہ مقصد پورا کرنے کے لئے بلوچ شاونزم کو بہت ابھارا تھا لیکن اس کی یہ تدبیر خود اس کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ اس طرح بلوچستان کے غیر بلوچی عوام کی بھی قبائلی اور نسلی

عصبیت کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور اس پسماندہ صوبہ کے مختلف نسلی، لسانی اور ثقافتی گروہوں کے درمیان سیاسی، معاشرتی اور معاشی تضادات کی شدت میں اضافہ ہوگیا اور پاکستان کے رجعت پسند عناصر کو ان تضادات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

خان قلات کی انگریزوں سے وفاداری کا پس منظر اور آزاد ریاست کے لئے برطانوی مدد کے حصول کی کوشش

یہ نام نہاد ''خان معظم'' بلوچستان کے عوام کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ یہ برطانوی سامراج کا پشتینی پٹھو تھا اور وہ اس حیثیت سے سوویت یونین کے خلاف جاسوسی بھی کرتا رہا تھا۔ وہ خود لکھتا ہے کہ ''1947ء میں مجھے چاغی میں بطور ایڈ جوٹنٹ مقرر کر دیا گیا۔ کوئٹہ سے زاہدان تک کے پانچ سو میل لمبے علاقے کا انچارج تھا۔ چاغی لیویز جو بہت تھوڑی فورس تھی، اس کی نفری 150 تھی۔ میں نے اس تعداد کو بڑھا کر 600 نفری کر دیا۔ میرا علاقہ مختلف پوسٹوں میں منقسم تھا۔ ژوب اور چاغی کی سروس میں مجھے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا اس لئے مجھے افغانستان اور ایران کی سرحدات بالخصوص روسی کمیونزم کے پھیلاؤ کی رفتار سے متعلق مخصوص فرائض سرانجام دینے پڑتے تھے۔ انگریز روس کی فارورڈ پالیسی سے خوفزدہ تھے۔ وہ اپنی سیاسی پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے افغانستان، ایران اور ہندوستان کے لوگوں کو خوفزدہ کرتے تھے۔ میں نے 1947ء میں دو اہم رپورٹیں حکام کو پہنچائیں۔ ایک یہ کہ ایران، افغانستان اور چاغی سے بلوچ قوم کے افراد آہستہ آہستہ روسی علاقوں مرو اور اشک آباد کی طرف جا رہے ہیں۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچ کر پیغام بھیجتے ہیں کہ ''ہمارا ملک بلوچستان انگریزوں کے قبضہ میں ہے، وہاں ظلم و جبر ہے اور لوگ بھوک سے مرتے ہیں۔ اس کے برعکس روس میں ہم کو اس قدر غلہ ملتا ہے کہ لکڑی اور کوئلہ کی بجائے ہم اپنے فالتو غلے کو جلاتے ہیں۔ روس میں ہمارے بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمیں رہنے کو مکانات ملتے ہیں۔ ہم بہت آرام وسکون سے ہیں۔ تم بلوچ بے دریغ چلے آؤ، زیادہ سے زیادہ۔ چنانچہ اس وقت تک دو اڑھائی لاکھ بلوچ روس کے متذکرہ مقامات پر آباد ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ جکنصور (Jaknsur) کے راستے جاتے ہیں۔'' دوسری رپورٹ میں نے 1928ء میں دی تھی کہ امیر امان اللہ خان سوشلسٹ روس کی حمایت سے امداد حاصل کر رہا

ہے۔ وہ خاصا مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔ پٹھان نیشنلزم کا علمبردار ہے۔ اگر پانچ چھ سال یہی ترقی پسند بادشاہ حکومت کرتا رہا تو ہندوستان میں انگریزوں کی پوزیشن بہت کمزور ہو جائے گی۔ صوبہ سرحد، بلوچستان اور ایرانی بلوچستان با آسانی روس کے زیر اثر چلے جائیں گے۔ برطانوی اقتدار ختم ہوتا جائے گا۔ دوسری طرف بلوچ اور پٹھان کمیونسٹ بن جائیں گے۔ اس سے ایران کی سالمیت کو شدید خطرہ لاحق ہوگا اور بلوچ یعنی ایران اور بلوچستان کے بلوچ، صوبہ سرحد کے پشتون اور افغانستان کے پٹھان، روس کی امداد سے تمام ہندوستان پر 1935ء سے 1940ء تک قبضہ کر لیں گے۔ کانگرس مکمل طور پر ان کا ساتھ دے گی۔ اے جی جی بلوچستان نے مجھے، پی۔ اے چاغی اور پی۔ اے قلات کو فوراً خصوصی طور پر طلب کیا اور مجھ سے مکمل رپورٹ حاصل کی اور طویل مناظرہ کرتے رہے۔''[6] بظاہر ''خان معظم'' کو توقع تھی کہ برطانوی سامراج اس کی ایسی ہی گراں قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر اپنی آزاد و خودمختار استبدادی سلطنت قائم کرنے میں مدد دے گا اور اس نے اسی توقع کے تحت جون 1946ء میں برطانیہ کے ساتھ نئے معاہداتی تعلقات کی پیش کش کی تھی اور پھر اگست 1927ء میں ایک انگریز کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ برطانوی سامراج روس کے خلاف فوجی اڈے اور تیل کے لالچ میں آ جائے گا اور اس بنا پر وہ اس کے آزادی و خودمختاری کے دعوے کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرے گا۔ میر غوث بخش بزنجو کو ان سارے حقائق کا علم تھا مگر وہ اپنی غیر حقیقت پسندانہ سیاست اور قبائلی عصبیت سے مجبور تھا اور اس لئے وہ اپنے ''خان معظم'' کا ساتھ دے کر اس کے شہنشاہی عزائم کو بلوچستان کے عوام کی منشا قرار دے رہا تھا۔

''خان معظم'' کے دارالعوام'' کی 25 رفروری 1948ء کی قرارداد کی اطلاع کراچی پہنچی تو خود خان کے بقول قائداعظم نے الحاق کا مسئلہ اپنی نو آموز کابینہ کے سپرد کر دیا'' جبکہ یہ خبریں آ رہی تھیں کہ عراق میں برطانیہ کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایران میں کرد قبائلیوں کی بغاوت کا خطرہ پھر پیدا ہو گیا ہے اور یمن کے حکمران امام یحییٰ کے اپنے بیٹے سیف الاسلام احمد کے ہاتھوں کے قتل کے بعد وہاں بھی سیاسی استحکام باقی نہیں رہا اور خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے اور برطانیہ کا ایک بحری جنگی جہاز امیر سیف الاسلام احمد کی امداد کے لئے عدن پہنچ رہا ہے۔

پاکستان کی کابینہ ابھی اس قرارداد کی بنا پر پیدا شدہ حال سے نپٹنے کے لئے مختلف

تجاویز پر غور کر رہی تھی کہ یکم مارچ کو کوئٹہ سے ایک برطانوی خبر رساں ایجنسی ''سٹار'' کی یہ خبر موصول ہوئی کہ ''خان اپنی افواج کی تنظیم نو اور توسیع کے لئے ایک بڑی سکیم پر عمل کر رہا ہے۔ اس کے ''وزیر خارجہ'' وائی۔ ڈی۔ فل نے اس مقصد کے لئے متعدد غیر ملکی فوجی افسروں کی خدمات حاصل کی ہیں جن میں ایک انگریز فوجی افسر بریگیڈئیر پیویز (Pewes) بھی شامل ہے۔ وزیر خارجہ ڈوگلس فل جنوری 1948ء کے پہلے ہفتے میں انگلستان گیا تھا اور 15 مارچ تک اس کی واپسی کی توقع ہے۔ بریگیڈئیر پیوز کا، جسے وزیر دفاع مقرر کیا گیا ہے، فوجی کیریر طویل اور شاندار ہے۔ اس کو مقامی حالات اور ضروریات کا پورا علم ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ژوب بریگیڈ کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ آج کل ریاست کی فوج تربیت یافتہ پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل ہے جن کے پاس رائفلیں اور مشین گنیں ہیں۔ ان کے علاوہ لیوی کور اور فوجی پولیس میں ملیشیا کے پانچ سو ارکان ہیں۔ قلات کی آبادی تقریباً چار لاکھ ہے جس کی اکثریت خانہ بدوش قبائلیوں پر مشتمل ہے۔ ان قبائلیوں کے پاس دیسی ساخت کی بندوقیں ہیں اور یہ بلوچستان کی مخصوص نوعیت کی سرزمین میں ہنگامی حالات کے دوران گوریلا جنگ اچھی طرح لڑ سکتے ہیں۔ جب قلات کے وزیر اعظم نوابزادہ محمد اسلم خان سے اس سکیم کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس میں کوئی خفیہ بات نہیں ہے۔ ہم یہ حفاظتی اقدامات اپنے داخلی تقاضوں کے پیش نظر کر رہے ہیں۔''[7]

خان قلات کی فوجی تیاریوں پر پاکستان کے حکمران طبقوں کی تشویش

چونکہ متذکرہ خبر پاکستان کے ارباب اقتدار کے لئے پریشان کن اور اشتعال انگیز تھی اس لئے مارچ کے پہلے ہفتہ میں یہ قطعی فیصلہ ہو گیا کہ آئندہ ریاست قلات کے الحاق کے لئے سخت پالیسی پر عمل ہو گا۔ اس نئی پالیسی کا اعلان کراچی میں بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ کے بیان کے ذریعے کیا گیا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ ''ریاست قلات کے عوام اور سردار مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو۔ ریاست کا حکمران دراصل سرداروں کی کنفیڈریسی کا سربراہ ہے اور یہ سردار جب چاہیں کسی بھی شخص کو اپنا حکمران بنا سکتے ہیں یا اسے ہٹا سکتے ہیں۔ قاضی عیسیٰ نے قلات کے ایوان زیریں کی 25 فروری کی قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم ریاست قلات کے ایوان عام کے اس

فیصلے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یہ ایوان دراصل ایک ڈھونگ ہے جس کی بنیاد ایک پُرفریب طریقۂ انتخاب پر ہے۔ مسلم لیگ نے قلات کے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا اور قلات نیشنل پارٹی جس کا ایوان عام پر غلبہ ہے رائے عامہ کے ایک چھوٹے سے حصہ کی بھی نمائندگی نہیں کرتی۔ یہ پارٹی ابھی تک ہندوستانی لیڈروں کے اشاروں پر چلتی ہے اور اس نے ابھی تک آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس سے تعلقات منقطع نہیں کئے۔ چونکہ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ نے ریاست کے الحاق کے مسئلہ کا حل حکومت پاکستان پر چھوڑ رکھا ہے اس لئے ہم نے ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلم لیگ ریاست کے اندر اور باہر اتنی طاقتور ہے کہ وہ خود ایسے معاملات کو نپٹا سکتی ہے۔''[8] اور پھر 8 ر مارچ کو کوئٹہ کے ''سیاسی حلقوں'' کی اس رائے کی تشہیر ہوئی کہ ''قلات کے فرمانروا احمد یار خان خود ذاتی طور پر قلات کی پاکستان میں شمولیت کے مخالف ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ نیشنل پارٹی اور ایوان عام کو اپنا آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ اگر وہ شمولیت کا فیصلہ کر لیں تو قانونی طور پر ایوان عام ان کی اس کارروائی میں حائل نہیں ہوسکتا۔ حقیقت میں ایوان عام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ قلات کے تعلقات کے سلسلے میں خان کو ہدایت دے۔''[9]

لاہور کے روزنامہ ''نوائے وقت'' نے 10 ر مارچ کو کوئٹہ کے سیاسی حلقوں کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ ''ریاست قلات نے پاکستان سے الحاق کے سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ دیسی ریاستوں کی آزادی و خودمختاری کا دور ختم ہو چکا ہے...... ہمیں افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ہز ہائی نس خان قلات آزادی و خودمختاری کے خبط میں ایک خطرناک رستہ پر ہو لئے ہیں۔ پاکستان، بلوچستان، قلات، اہل قلات اور خود ہز ہائی نس کے مفاد مقتضی ہیں کہ وہ اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کرتے ہوئے بلاتوقف پاکستان میں شرکت کا اعلان کر دیں۔ بصورت دیگر حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں زیادہ مضبوط رویہ اختیار کرتے ہوئے خان قلات کو اپنا اور اپنے ملک کا نفع نقصان پہچاننے پر مجبور کر دے۔''[10] لیکن نوائے وقت نے حکومت پاکستان کو یہ مشورہ دیتے ہوئے اس حقیقت کا ذکر نہیں کیا تھا کہ خان قلات نے آزادی و خودمختاری کے خبط میں جو خطرناک رستہ اختیار کیا تھا وہ دراصل مسلم لیگ کی دیسی ریاستوں کے بارے میں غیر

جمہوری اور غیر دانشمندانہ پالیسی سے ہی ہموار ہوا تھا۔اسی پالیسی کے نتیجے میں ریاست جموں وکشمیر پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اسی پالیسی کے پیش نظر نواب بہاولپور بھی ''جلالتہ الملک'' کا لقب اختیار کر کے اپنی آزادی وخودمختاری کا خواب دیکھ رہا تھا جبکہ مدیر نوائے وقت کا محسن نواب مشتاق احمد گرمانی اس ریاست کا وزیر اعظم تھا۔

11 رمارچ کر حکومت پاکستان کے لئے نوائے وقت کے اس ادارتی مشورے پر عمل کرنے کے لئے راستہ بالکل ہموار ہو گیا جبکہ لندن کی ایک خبر سے یہ واضح ہو گیا کہ وہاں خان قلات کے ''وزیر خارجہ'' ڈوگلس فل کا مشن ناکام ہو گیا ہے کیونکہ حکومت برطانیہ نے قلات کی آزاد وخودمختار مملکت سے کوئی دوستی یا فوجی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔خبر یہ تھی کہ ''جب برطانوی پارلیمنٹ میں کنزرویٹو پارٹی کے ایک رکن پیٹرک ڈونر (Patrick Donner) نے اس سلسلے میں ایک سوال پوچھا تو لیبر حکومت کی وزارت کامن ویلتھ کے انڈر سیکرٹیری گارڈن واکر (Gordon Walker) نے یہ جواب دیا کہ ''میری توجہ اس اخباری رپورٹ کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ قلات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔تاہم میرے پاس یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ گفت وشنید ختم ہو گئی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ معاہدہ جاریہ ابھی تک نافذ ہے۔''[11] گارڈن واکر کی طرف سے اس جواب کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بلوچستان کے قریبی ممالک ایران، عراق اور یمن سخت بدامنی کا شکار تھے اور اینگلو۔امریکی سامراج ایسی صورت حال میں بلوچستان میں قلات کی ایک ایسی آزاد مملکت اپنے لئے سودمند نہیں سمجھتا تھا جس کے پاس تربیت یافتہ فوجیوں کی تعداد پانچ سو تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ حکومت برطانیہ نے حکومت ہند کے زبردست سفارتی دباؤ کے تحت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کشمیر کے متعلق اپنی پاکستان نواز پالیسی ترک کر دی تھی اس لئے سامراجی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ پاکستان کو مزید ناراض نہ کیا جائے بالخصوص ایسی حالت میں کہ کراچی کے ارباب اقتدار بلوچستان میں اینگلو۔امریکی سامراج کو وہ ساری سہولتیں دینے کو تیار تھے جن کی پیش کش خان قلات نے اپنے وزیر خارجہ کی وساطت سے کی تھی۔گارڈن واکر کا یہ بیان غلط نہیں تھا کہ قلات کے الحاق کے بارے میں گفت وشنید بالکل ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ خان قلات نے لندن میں اپنے وزیر خارجہ کی ناکامی کی اطلاع پا کر حکومت پاکستان کو مطلع کیا تھا کہ ''(1) حکومت قلات تین ماہ کے اندر اندر

الحاق کی کاروائی مکمل کردے گی۔(2) جب الحاق نامے کی دستاویزات مکمل ہوجائیں گی تو خان اعظم بلوچ روایات کے مطابق اپنے مشیروں کو ساتھ لے کر کراچی جائے گا اور وہاں الحاق نامے پر دستخط کردے گا۔"[12]

لیکن حکومت پاکستان ماضی کے تلخ تجربے کے پیش نظر اب خان قلات کو مزید مہلت دینے پر آمادہ نہیں تھی کیونکہ ان دنوں یہ خبریں بھی شائع ہوئی تھیں کہ خان قلات نے اپنے شہنشاہی عزم کی تکمیل کے لئے افغانستان کے علاوہ ہندوستان سے بھی رابطہ پیدا کررکھا ہے اور ہندوستان نواز قلات نیشنل پارٹی اور چیف کمشنر کے زیر انتظام علاقوں کی آزاد وطن پارٹی کے پاکستان مخالف رویہ سے اس افواہ کی تائید ہوتی تھی۔ مزید براں انہی دنوں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے جی۔ایم۔سید اور عبدالصمد اچکزئی وغیرہ کے ساتھ مل کر اپنی مجوزہ پیپلز پارٹی کا جو منشور شائع کیا تھا اس میں تجویز یہ تھی کہ پاکستان کا آئینی وسیاسی ڈھانچہ آزاد سوشلسٹ جمہوریتوں پر مشتمل ایک یونین کی صورت میں ہونا چاہیے۔

لس بیلہ، مکران اور خاران کا پاکستان کے ساتھ الحاق اور خان قلات کی برہمی

اس پس منظر میں 13 مارچ کو کراچی میں اخباری نمائندوں کو یہ خبر دی گئی کہ "جام صاحب لس بیلہ نے ریاستی مسلم لیگ کے صدر کو ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ دعوت اس ملاقات کا نتیجہ ہے جو حال ہی میں لس بیلہ، خاران اور مکران کی ریاستوں کے حکمرانوں کی ریاستی مسلم لیگ کے صدر کے ساتھ ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ گزشتہ ماہ لس بیلہ کے عوام کی جانب سے کراچی میں ریاستی مسلم لیگ کو ایک میمورنڈم پیش کیا گیا تھا جس میں مقامی حکام کے خلاف شکائتیں درج تھیں۔ ریاستی مسلم لیگ نے ان شکایات کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک وفد بھیجا تھا لیکن دریائے ہب کے نزدیک ریاستی سرحد پر ایک پولیس چوکی نے اس وفد کو یہ حکم دکھا کر روک دیا تھا کہ ریاست میں اس کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس وقت وفد نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی اور اس کی کراچی میں واپسی پر اس مسئلہ کے بارے میں ریاست کے حکمران سے رابطہ پیدا کیا گیا تھا۔"[13] اس خبر کی اشاعت کے چار دن بعد 17 مارچ کو خاران، لس بیلہ اور مکران کی ساحلی ریاستوں کے حکمرانوں نے کراچی میں پاکستان کے ساتھ

الحاق کی دعوت دی اور وہ فوراً ہی قبول کر لی گئی۔

چودھری محمد علی کے بقول ''ان تینوں ریاستوں کا الحاق منظور ہونے سے ریاست قلات الگ تھلگ ہو کر رہ گئی۔ اب یہ ریاست چاروں طرف سے پاکستان کے علاقہ میں گھر گئی تھی۔ ان حالات میں خان آف قلات کو بھی ہوش آ گیا۔''[14] لیکن خان قلات لکھتا ہے کہ ''حکومت پاکستان کا یہ اقدام انتہائی غلط، عاقبت نااندیشانہ، احمقانہ، سنگدلانہ، اور غیر قانونی تھا۔ اس کا ردعمل انتہائی شدید ہوا۔ بلوچ جو برس ہا برس سے پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دیتے چلے آ رہے تھے، بلوچ جو اس نوزائیدہ مملکت کے قابل فخر شہری اور بازوئے شمشیر زن ثابت ہونے کی خواہش مند تھے، جو اس ملک سے بہترین توقعات وابستہ کرتے چلے آ رہے تھے، مایوس و دل شکستہ ہو گئے۔ ان کی تمام آرزوؤں کا خون کر دیا گیا۔ بلوچوں کی عظیم وقدیم مرکزیت کو یوں پاش پاش کر دینا معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلوچستان کے عوام یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ بلوچوں کی ایثار کیشی اور وفا شعاری کا یوں بھی مذاق اڑایا جائے گا۔ وہ اپنے چار سو سالہ قدیم روایتی سربراہ خان کی خدمات جلیلہ اور بے پناہ ذاتی اور قومی قربانیوں کا یہ صلہ پا کر حیران و ششدر رہ گئے۔ سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔ ان کے اعتماد کا خون کیا جا چکا تھا اور وہ سخت ہیجانی کیفیت میں بغاوت پر آمادہ ہو رہے تھے۔''[15] بظاہر یہ خان قلات کی اسی ہیجانی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ حکومت قلات نے حکومت پاکستان کے اس اقدام کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ قلات کا وزیر خارجہ ڈوگلس فیل اس وقت تک لندن سے واپس آ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اس سلسلے میں پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری محمد ظفر اللہ خان کے نام ایک احتجاجی تار بھیجا جسے حکومت پاکستان نے مسترد کر دیا۔[16] اور وزیر اعظم پاکستان نے بلوچستان میں مقیم پاکستانی فوج کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ روابط افشا ہونے پر خان قلات کو پاکستان کے فوجی دباؤ کے تحت الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنا پڑے

حکومت پاکستان کے اس سخت رویے کے پیش نظر قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لئے پھر مذاکرات شروع ہوئے۔ خان قلات نے اس مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے 25/ مارچ کو کوئٹہ میں اپنے نام نہاد دارالامراء کا اجلاس بلایا مگر مکران، خاران اور لس بیلہ کی ریاستوں کے

حکمرانوں نے اس اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کردیا۔24 ؍مارچ کو بلوچستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن میر نبی بخش بلوچ نے سٹار نیوز ایجنسی سے ایک انٹرویو میں تجویز پیش کی کہ خان قلات کو اپنے وقار کو بحال کرنے کے لئے ریاست میں پاکستان دشمن عناصر سے گلوخلاصی کرا کر اپنی ریاست کا پاکستان کے ساتھ فوراًالحاق کردینا چاہئے۔ نبی بخش نے خیال ظاہر کیا کہ ''اگر خان قلات اس قسم کی دوستانہ کاروائی کرے گا تو پاکستان کے ارباب اقتدار کے لئے بلوچستان کی ریاستوں کی یونین کی تجویز پر غور کرنا ناممکن نہیں ہوگا۔''[17] نبی بخش نے یہ انٹرویو دراصل حکومت پاکستان کے اشارے پر دیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ قلات کے الحاق کے لئے کسی فوجی کاروائی کی ضرورت پیش نہ آئے اور خان قلات ریاستوں کی یونین کے لالچ کے تحت راہ راست پر آ جائے۔ چنانچہ یہ تدبیر مؤثر ثابت ہوئی اور ''خان معظم'' نے 26 ؍مارچ کو کوئٹہ میں ایک اخباری انٹرویو کے ذریعے ان خبروں کی پرزور تردید کی کہ وہ ہندوستان یا افغانستان سے مذاکرات کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ''میں پاکستان کے لئے خیر سگالی کے جذبات کا حامل ہوں اور میں اپنی ریاست میں پاکستان کے خلاف کوئی پروپیگنڈا برداشت نہیں کروں گا۔ میں خاران، مکران اور لس بیلہ کے تنازعہ کے بارے میں حکومت پاکستان کے ساتھ دوستانہ تصفیہ کا خواہاں ہوں۔''[18]

خان قلات کا یہ انٹرویو 27 ؍مارچ کے اخبارات میں شائع ہوا تو اسی دن حکومت ہندوستان کی وزارت ریاستی امور کے سیکرٹری وی۔ پی۔ مینن نے دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اس خبر کی تصدیق کردی کہ خان قلات نے بالواسطہ طور پر حکومت ہندوستان سے رابطہ پیدا کیا تھا۔ مینن نے کہا کہ ''قلات نے دو ایک ماہ قبل اپنے ایک ایجنٹ کے ذریعے ہم سے رابطہ پیدا کیا تھا لیکن ہم نے قلات سے کوئی تعلق قائم کرنے سے انکار کردیا تھا کیونکہ ہم اپنے اس عہد پر قائم ہیں کہ ہم کسی ایسی ریاست کو ہاتھ نہیں لگائیں گے جو جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کے اندر واقع ہے اور اس بنا پر پاکستان کی ملکیت ہے۔ پاکستان نے جوناگڑھ کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی ہے، ہم بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔ یہ الزام غلط ہے کہ میری حکومت نے قلات کو 30 لاکھ پونڈ کی رشوت کی پیش کش کی ہے۔ ہمارے نزدیک ریاست قلات اتنی قیمتی نہیں ہے۔ ویسے بھی نفع ونقصان کا لحاظ کئے بغیر ہم اس کے نزدیک نہیں جائیں گے۔''[19] جب یہ پریس کانفرنس اسی دن آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی تو خان قلات کے

ہوش بالکل ہی ٹھکانے آ گئے اوراس نے تین دن بعد 30 ؍مارچ کو کراچی آ کر پاکستان کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔

اسی دن ہندوستان کے وزیراعظم جواہرلال نہرو نے اپنی پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر ایک بیان دیا تھا جو حسب معمول ذومعنی تھا۔اس میں وی۔ پی۔مینن کے متذکرہ بیان کی تردید بھی کی گئی تھی اور تصدیق بھی۔نہرو نے مینن کے اس بیان کی تردید کی کہ خان قلات نے کبھی ہندوستانی یونین میں شمولیت کی درخواست کی تھی۔اس نے کہا کہ آل انڈیا ریڈیو سے 27 ؍مارچ کو اس بارے میں جو خبر نشر ہوئی ہے وہ بے بنیاد اور کسی نامہ نگار کی غلط نگارش کا نتیجہ ہے......تاہم نہرو نے انکشاف کیا کہ والئی قلات کی طرف سے ایک خط حکومت ہندوستان کو اس مضمون کا موصول ہوا تھا کہ پاکستان نے ریاست کی آزادی وخودمختاری کو تسلیم کیا ہے۔ہندوستان بھی ایسے ہی اعلان کے ذریعے اس کی تصدیق کر دے۔لیکن حکومت ہندوستان کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔اس نے مزید بتایا کہ نئی دہلی میں تجارتی ایجنسی قائم کرنے کے سلسلے میں خان قلات نے جو مراسلہ بھجوایا تھا حکومت ہندوستان کی طرف سے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا۔[20] اس سے اگلے دن 31 ؍مارچ کو ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے بھی خان قلات کے ایک احتجاجی تار کے جواب میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ آل انڈیا ریڈیو سے ایک غلط خبر کی تشہیر ہو گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے جوابی تار میں مزید کہا گیا تھا کہ ''ہندوستان کے وزیراعظم نے اسمبلی میں اس بارے میں اپنی حکومت کی پوزیشن واضح کر دی ہے۔''

خان قلات خرابی بسیار کے بعد اپنی اس بعجلت کاروائی کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ''حکومت پاکستان نے کوئٹہ کے بریگیڈیئر کو یہ حکم دے دیا تھا کہ قلات کے خلاف کاروائی کے لئے تیار رہو اوراے۔جی۔جی بلوچستان قلات کے خلاف پولیس ایکشن کی تیاری کر رہا تھا۔مجھے خوفناک تصادم قریب تر محسوس ہونے لگا۔یہ عالم وہ تھا کہ (1) وادیٔ کشمیر میں خون آشام جنگ جاری ہو چکی تھی (2) لاکھوں مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ہندوستان کی سرزمین خون مسلم سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ (3) افغانستان نے پختونستان کی تحریک چلا کر خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی اور (4) روس کی نگاہیں گوادر پر گڑی ہوئی تھیں۔میں نے سوچا کہ قدیم اتحاد بلوچی کے ایوان عام اور دیوان خاص کے ارکان کے ساتھ مزید گفت وشنید کرنے یا ان سب

کو ہمراہ لے کر کراچی میں الحاق نامہ پر دستخط کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ملک خطرناک صورت حال سے دو چار تھا۔ کئی محاذ کھلے ہوئے تھے۔ بلوچستان کا محاذ پاکستان کے شیرازے کو بکھیر سکتا تھا۔ یہ بات میں اپنی زندگی میں کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ میں پاکستان کی سلامتی اور ناموس اسلام کے لئے فکرمند تھا۔ میں مسلمانوں کی مزید ہلاکت و بربادی کے لامتناہی اور ہولناک سلسلے کو روکنا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر اور بروقت...... اگر میں الحاق کے لئے عجلت کا مظاہرہ نہ کرتا تو زیرک انگریز کی جانشین نوکر شاہی آگ و خون کی ہولی شروع کرا چکی ہوتی اور یہ سلسلہ ملک کے نقشہ کو اسی وقت بگاڑ کر رکھ دیتا۔ روس پیش قدمی کرتا۔ افغانستان کی فوجیں بلوچستان میں داخل ہو چکی ہوتیں۔ ہندوستان کے جنگی جہاز ساحل مکران پر لنگر انداز ہوتے۔ میں نے اپنی قوم کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور مایوسی و بددلی کے احساس کو ختم کرنے کی سعی کی، اپنے قبائلی رہنماؤں اور حکومت پاکستان دونوں سے مسلسل رابطہ بھی قائم رکھا تاکہ کشیدگی ختم اور خیرسگالی کا ماحول پیدا ہو۔ کہیں کوئی چنگاری بھڑک کر شعلہ نہ بن جائے۔"[21]

خان قلات کا موقع پرستانہ کردار

ریاست قلات کے الحاق کے اس ہفت ماہی ڈرامے کی تفصیل سے بالکل واضح ہے کہ بلوچستان کی اس بے آب و گیاہ ریاست کا حکمران سر احمد یار خان ایک نہایت مکار و عیار جاگیردار تھا۔ اس نے اپنی یہ غیر معمولی مکاری و عیاری اپنی والدہ سے ورثہ میں پائی تھی۔ اس کے والد اعظم جان کی دو بیویاں تھیں۔ اس کی بڑی بیوی کے سب سے بڑے لڑکے نام اکرم جان تھا اور روایت کے مطابق 1933ء میں اعظم جان کے انتقال کے بعد اسے ریاست کا والی بننا چاہیے تھا، مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اعظم جان کی بڑی بیوی بڑی سادہ لوح تھی جبکہ اس کی چھوٹی بیوی بڑی مکار اور چالاک تھی۔ اس نے ایک ابلیسی منصوبے کے تحت اکرم جان کو آہستہ آہستہ افیون، چرس، بھنگ اور دوسری منشیات کا اس قدر عادی بنا دیا تھا کہ 1933ء تک وہ اپنا دماغی توازن ہی کھو بیٹھا تھا چنانچہ اس صورت حال میں اسے اپنے بیٹے احمد یار خان کو گدی نشین کروانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔[22]

انگریزوں کو بھی اس انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ احمد یار خان ایک آزمودہ کار سامراجی پٹھو تھا اور اس نے چاغی لیویز فورس میں "اعلیٰ" خدمات سرانجام دی تھیں۔ مزید براں وہ

عملی سیاسیات کا بہت ماہر خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی نظر میں عملی سیاسیات کا تعلق صرف اقتدار کی جدوجہد سے تھا۔ اس نے محلاتی سازش، مکاری اور عیاری کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے اسے اپنے آباء واجداد کی طرح ریاست کے عوام کی فلاح و بہبود میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سارا وقت اس کوشش میں گزرتا تھا کہ ریاست میں قبائلی سرداروں کے مقابلے میں اپنی پوزیشن کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کیا جائے اور بالآخران پر قطعی بالادستی حاصل کی جائے۔ 36-1933ء میں اس کے ایک نوجوان انگریز وزیر اعظم کی خواہش تھی کہ سارے قبائلی سرداروں کو متحد کر کے غریب عوام کی فلاح کے لئے تھوڑا بہت کام کیا جائے۔ مگر احمد یار خان نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ وہ انڈین سول سروس کے اس نوجوان اور غیر تجربہ کار انگریز افسر کے خیالات کو احمقانہ اور غیر حقیقت پسندانہ تصور کرتا تھا۔ وہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے اصول کا بہت قائل تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے قبائلی سرداروں میں تفرقہ اندازی نہ کی تو وہ جمع ہو کر یا تو اس کا تختہ الٹ دیں گے یا اس کے اختیارات میں کمی کر دیں گے۔"[23]

عملی سیاسیات میں اسی مہارت کی بنا پر اس نے 1936ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کو اپنا آئینی مشیر مقرر کیا تھا۔ 1945ء میں اس نے قائد اعظم اور مس جناح کو پہلے چاندی اور پھر سونے میں تولا اور دونوں کے وزن کے برابر چاندی اور دونوں کے وزن کے برابر سونا ان کی نذر کیا۔ 1946ء میں اس نے قائد اعظم کی وساطت سے وزارتی مشن کے روبرو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ چونکہ ریاست قلات کی حیثیت دوسری دیسی ریاستوں سے مختلف ہے اس لئے برصغیر سے برطانیہ کی دستبرداری کے بعد اسے پورے بلوچستان میں اپنی آزاد و خود مختار سلطنت قائم کرنے کا قانونی حق حاصل ہوگا اور پھر اگست 1947ء میں اس نے پہلے تو مسلم لیگ سے یہ تسلیم کروایا کہ ریاست قلات کی آئینی حیثیت ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے مختلف ہے اور بعد میں اس نے میر غوث بخش بزنجو کی قلات نیشنل پارٹی، عبدالصمد اچکزئی کی آزاد وطن پارٹی، اپنے وزیر خارجہ ڈوگلس فل اور اپنے بڑے بھائی اور چچا کی وساطت سے ہندوستان، برطانیہ اور افغانستان سے اپنی یہی حیثیت تسلیم کروانے کی کوشش کی۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ چونکہ ماضی میں اس نے قائد اعظم اور مس جناح کو سونے اور چاندی میں تولا تھا اس لئے اب حکومت پاکستان اس کی اس کوشش میں حائل نہیں ہوگی۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ

پاکستان معرض وجود میں آتے ہی بے شمار داخلی و خارجی مشکلات میں مبتلا ہو گیا ہے، اس لئے بلوچوں کی بغاوت کی دھمکی دے کر بآسانی بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ بلوچ شاونزم کو بہت ہوا دیتا تھا۔ قائداعظم نے 14 رفروری 1948ء تک اس کے اس رویے کو طوعاً و کرہاً برداشت کیا لیکن وہ کسی صورت راہ راست پر نہ آیا تو ریاستی امور کے محکمہ کے سیکرٹری کرنل اے۔ ایس۔ بی شاہ کو حکم دے دیا گیا کہ وہ قلات کے الحاق کے لئے مناسب کاروائی کرے اور اس کاروائی کی بنا پر صرف ڈیڑھ ماہ کے بعد 20 رمارچ کو الحاق کا ڈرامہ ختم ہو گیا۔

الحاق نامہ پر دستخط کے باوجود خان قلات اور حکومت پاکستان کے مابین کشمکش جاری رہی

3 راپریل کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے کراچی کے ''سیاسی حلقوں'' کے حوالے سے خبر دی کہ ''قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد اس تجویز پر غور کیا جا رہا ہے کہ بلوچستان کی چار ریاستوں قلات، خاران، لس بیلہ اور مکران کی ایک نئی کنفیڈریسی کی تشکیل کی جائے جس میں چاروں کو مساوی درجہ حاصل ہو۔ آئندہ قلات کو کسی ریاست پر اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہو گا اور ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کے ذریعے ان ریاستوں کے درمیان اتحاد کے لئے رابطہ ہو گا۔ اس خبر میں مزید کہا گیا تھا کہ ''جہاں تک مستجار علاقوں کا تعلق ہے قلات کے الحاق کے بعد دفاع اور مواصلات کے بارے میں ان کے انتظام کے نئے رنگ و روپ سے ان پر پاکستان کے دعویٰ کو مزید تقویت ملی ہے اور ویسے بھی چونکہ ماضی میں ان علاقوں کی ترقی پر کروڑ ہا روپے خرچ ہوئے تھے اس لئے حکومت پاکستان اس سرمایہ کاری کی دعویدار ہے۔''[24]

7 راپریل کو لندن ٹائمز نے قلات کے الحاق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''اب ریاست قلات پاکستان کے ایک یونٹ کی حیثیت سے سلامتی اور ترقی کی امید کر سکتی ہے۔ صرف کراچی کے مسلسل دباؤ سے ہی خان قلات اپنی آزادی کے خواب کو ترک کر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتا تھا۔ جب سے بلوچستان میں برطانیہ کا اقتدار ختم ہوا ہے خان اپنی خودمختاری کا دعویٰ کر کے پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی دھمکیاں دیتا رہا ہے اور یہ مطالبہ کرتا رہا ہے کہ درۂ بولان اور کوئٹہ کے مستجار علاقے اسے واپس دے دیئے جائیں۔ اس کے اپنے ذرائع

زیادہ نہیں ہیں لیکن اس کی ریاست کی سرحدیں ایران اور افغانستان سے ملتی ہیں جہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس کی امنگوں کی حوصلہ افزائی کرنا پسند کریں گے۔ اندرون ملک جو لوگ آزاد پٹھانستان کی خطرناک تحریک کی حمایت کرتے ہیں وہ قلات کو بڑی بے چینی سے دیکھتے رہے ہیں۔ تاہم گزشتہ ماہ کے اواخر میں خان آف قلات نے گھٹنے ٹیک کر الحاق پر دستخط کر دیئے۔ ریاست قلات خود اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ مغربی علاقے کے دفاعی انتظامات کی مضبوطی کے لئے خطرہ پیدا کر کے پاکستان کی کمزوری کا باعث بن سکتی ہے۔ جبکہ پاکستان کے ایک یونٹ کی حیثیت سے وہ اپنی سلامتی اور ترقی کی امید کر سکتی ہے۔''[25]

تاہم ''خان معظم'' کو الحاق نامے پر دستخط کرنے کے باوجود یہ امید لگی ہوئی تھی کہ گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ریاست قلات کی حدود کے اندر اس کی مطلق العنانیت میں کوئی دخل اندازی نہیں ہونے دیں گے اور اس نے اسی امید کی بنیاد پر پہلے تو یکم اپریل کو قلات نیشنل پارٹی کے دو ممتاز لیڈروں مولوی محمد عمر اور میر گل خان کو گرفتار کیا اور پھر 12 / اپریل کو اپنے قاضی القضاۃ مولوی عبدالصمد سے یہ بیان دلوایا تھا کہ چونکہ خان آف قلات کے 26 / مارچ کے اعلان کے مطابق ریاست قلات ایک اسلامی ریاست ہے اس لئے یہاں اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور یہاں شریعت کا مکمل نفاذ ہو گا۔''[26] 13 / اپریل کو خان قلات نے قلات نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری غوث بخش بزنجو کو بھی گرفتار کر لیا۔ بزنجو اور اس کے متذکرہ دونوں ساتھیوں پر الزام تھا کہ وہ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے۔[27]

''خان معظم'' کی اس کاروائی سے غوث بخش بزنجو کی اس وقت کی سیاست کا دیوالیہ پن اظہر من الشمس ہو گیا۔ اس نے اپنی پرانی کانگرسی سیاست کے زیر اثر پاکستان کے خلاف اپنے ''خان معظم'' سے اتحاد کیا تھا۔ مگر جب ''خان معظم'' کو یہ محسوس ہوا کہ اس کا یہ اتحاد اس کے مفاد کے منافی ہے تو اس نے توڑنے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا۔ بزنجو نے ''خان بلوچ'' سے یہ گٹھ جوڑ قیام پاکستان سے کچھ ہی عرصہ پہلے کیا تھا جبکہ اس کی پارٹی نے ایک قرارداد میں ''اعلیٰ حضرت میر احمد یار خان قلات'' کی دانشمندی اور اس کی اعلیٰ تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی سکیموں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''ان کی ذات پر صرف بلوچستان اور سندھ کے بلوچ ہی نہیں بلکہ ایران اور افغانستان کے بلوچ بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ قلات نیشنل پارٹی بلوچستان اور

بلوچ قوم کے لئے اعلیٰ حضرت میر احمد یار خان قلات کی ان قابل قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر بلوچ قوم کی طرف سے ان کو ''خان معظم'' کا لقب پیش کرتی ہے۔''[28]

14 ر اپریل کو حکومت بلوچستان نے مکران میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے ژوب ملیشیا کا ایک دستہ بھیج دیا اور ریاست کے حکمران سردار بھائی خان گچکی کی جگہ اس کے بیٹے محب اللہ خان کی دستار بندی کرا دی۔ اس وقت تک خان قلات کا دعویٰ یہ تھا کہ مکران کا ساحلی علاقہ اس کی ریاست کا ایک جزو ہے۔ چونکہ یہ علاقہ فوجی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل تھا اور اس میں گوادر اور پسنی کی دو بندرگاہیں تھیں اس لئے خان نے اس کا نظم و نسق چلانے کے لئے اپنا ایک گورنر مقرر کر رکھا تھا۔

17 ر اپریل کو ریاست خاران کے حکمران نواب میر حبیب اللہ خان نوشیروانی نے اپنی ریاست کے قبائلی سرداروں کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ آئندہ 17 ر مارچ کا دن یوم آزادی کے طور پر منایا جائے گا کیونکہ اس دن حکومت پاکستان نے خاران کا الحاق نامہ منظور کیا تھا۔[29] نواب خاران کا یہ اعلان بلوچستان کے مختلف نسلی اور لسانی گروہوں کے باہمی تضادات کا آئینہ دار تھا اور حکومت پاکستان نے انہی تضادات سے فائدہ اٹھا کر خان قلات کو پاکستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کر دیا تھا۔

نواب خاران کے اس اعلان سے دو دن پہلے 15 ر اپریل کو ریاست قلات میں خان معظم میر احمد یار خان کی مطلق العنانیت کو ختم کیا جا چکا تھا۔ اس دن بلوچستان کے اے۔ جی۔ جی سیوتج (Savidge) نے قلات پہنچ کر ''خان کو قائد اعظم کا یہ حکم سنایا تھا کہ قلات کی برطانوی دور کی حیثیت کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے...... ایک پولیٹیکل ایجنٹ قلات کے لئے مقرر کیا جائے گا جو اے۔ جی۔ جی بلوچستان کے ماتحت ہوگا۔ امور داخلہ کے لئے وزیر اعلیٰ کو پولیٹیکل ایجنٹ سے ہدایات لینی ہونگی۔ امید کی جاتی ہے کہ خان اعظم کو اس تجویز سے اختلاف نہ ہوگا۔'' خان قلات لکھتا ہے کہ ''یہ حکم میرے لئے غیر متوقع تھا۔ اس حکم کے مطابق میری حیثیت 1933ء کی سی ہوگئی۔ میں کوئی حکم جاری نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی قومی معاملات پر بلوچ سرداروں سے بات چیت کر سکتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایسی ہی پابندیوں سے نجات پانے کے لئے میں نے 1936ء میں قائد اعظم کو ریاست قلات کا آئینی مشیر مقرر کیا تھا۔ یہ طرز عمل بلوچوں کے خان کے

نزدیک انگریزوں کے سلوک سے بھی بدتر تھا...... ہمارے حکمرانوں نے انگریزوں کے برعکس عمل کیا۔ انہوں نے اپنے بے ہودہ طرزِ عمل سے ذلیل ورسوا کر کے مقصد نکالنے کی پالیسی کو اپنایا اور اس راہ میں کسی کے احسان، کسی کی قربانی، کسی کا ایثار، کسی کا علم اور کسی کا تجربہ ان کے نزدیک بے وقعت تھا۔"[30] خان نے اس حکم کی وصولی کے بعد برطانیہ اور بعض اسلامی ممالک کے دورے کا پروگرام بنایا مگر حکومت پاکستان نے اسے ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ دی کیونکہ وہ اپنے ساتھ جن افراد کو لے جانا چاہتا تھا ان میں اس کا وزیر خارجہ ڈوگلس فل بھی تھا جس نے قبل ازیں لندن میں تقریباً دو ماہ قیام کر کے یہ کوشش کی تھی کہ حکومت برطانیہ قلات کی آزادی وخود مختاری کو تسلیم کر لے اور غالباً یہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ نے 21 رفروری کو ایک مضمون لکھا تھا کہ اگر حکومت پاکستان نے قلات سے اطمینان بخش سمجھوتہ نہ کیا تو بلوچوں کا وسیع وعریض پہاڑی علاقہ بدامنی کا مرکز بن جائے گا اور اگر خان نے پاکستان کے دباؤ کی مزاحمت کے لئے افغانستان کی حمایت طلب کی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔

17ء اپریل کو ہفت روزہ اکونومسٹ نے پھر ایک اداریہ لکھا جس میں مسٹر جناح کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اب جبکہ خان قلات نے الحاق نامہ پر دستخط کر دیئے ہیں تو وہاں کے قبائل پر نوکر شاہی کی مرکزیت مسلط کر کے بلوچوں کی بغاوت کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ بلوچ قبائل ابھی قلات کی بالادستی قبول کرتے ہیں۔ اکونومسٹ نے مزید لکھا کہ "اگرچہ خان قلات نے اس خبر کی تردید کی ہے کہ اس نے ہندوستان سے الحاق کی کوئی تحریک کی تھی تاہم ہندوستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بعض عناصر ایسے موجود ہیں جو یہ خیال کرتے رہے ہیں کہ ہندوستان، پٹھانستان اور قلات کے درمیان اتحاد ہو جائے تو پاکستان شکنجے میں آ جائے گا۔ لیکن قلات کے لئے اس سکیم میں کوئی زیادہ دلکشی نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بلوچوں اور پٹھانوں میں یک جہتی نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خان قلات روسی اثر ورسوخ کے خلاف ہے جو پٹھانستان کی تحریک کی حمایت کر رہا ہے۔"[31]

اس اداریہ کی اشاعت کے تین دن بعد 20 راپریل کو برطانوی خبر رساں ایجنسی "سٹار" کی کوئٹہ سے یہ خبر موصول ہوئی کہ "20 راپریل کو قلات میں زبردست فساد ہوا۔ تقریباً دو ہزار کے ہجوم نے انسپکٹر جنرل پولیس کے بنگلہ کا گھیراؤ کر کے اس پر اینٹیں برسائیں اور کھڑکیاں توڑ دیں۔

ریاستی حکام کا بیان تھا کہ فساد اس لئے ہوا کہ شہر کے بس ڈرائیوروں نے محکمہ ٹرانسپورٹ کے سخت رویے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہڑتال کر دی تھی۔ جب پولیس نے بعض ہڑتالیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تو تقریباً دو ہزار لوگوں نے جمع ہو کر ہنگامہ کر دیا۔ چنانچہ فوراً ہی پورے شہر میں ہڑتال ہو گئی اور انسپکٹر جنرل پولیس کے بنگلہ پر پتھراؤ کیا گیا۔ خان قلات کے چھوٹے بھائی شہزادہ عبدالکریم نے بڑی مشکل سے صورت حال پر قابو پایا اور اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ریاست کے وزیر داخلہ میر احمد اور شہزادہ عبدالکریم پر مشتمل ایک کمیٹی اس مظاہرے اور ہڑتال کی وجوہ کی تحقیقات کرے گی۔''[32]

لیکن 27 راپریل کو ریاست کے انسپکٹر جنرل پولیس میر حیدر خان نے کوئٹہ پہنچ کر اس فساد کی جو تفصیل بتائی وہ متذکرہ خبر سے مختلف تھی۔ اس نے کہا کہ ''یہ فساد پاکستان کے دشمنوں کی جانب سے کرایا گیا تھا۔ اس میں ریاست کے پاکستانی ملازمین پر حملے کئے گئے، انہیں لوٹا گیا اور ان کی بے آبروئی کی گئی۔ ان ملازمین کا جان و مال شدید خطرے میں ہے اور انہیں فوری اور مؤثر امداد کی ضرورت ہے۔ میر حیدر نے الزام عائد کیا کہ اس فساد سے پہلے ریاستی فوج میں مکرانیوں کو غیر مسلح کر کے انہیں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے بھی چار پانچ گھنٹے تک قید رکھا گیا تھا اور بعض لوگوں نے حکومت پاکستان سے امداد طلب کرنے کے لئے جو تار دیئے تھے وہ وہیں روک لئے گئے تھے۔'' میر حیدر خان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا اور وہ گزشتہ دو برس سے ریاست کے وزیر دفاع اور انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر فائز تھا۔[33] لیکن اب اس نے 15 راپریل کو حکومت پاکستان کی جانب سے قلات پولیٹیکل ایجنٹ کے تقرر سے متعلقہ حکم صادر ہونے کے بعد اپنی وفاداری کا محور بدل لیا تھا اور 25 راپریل کو اس نے خان کی ہدایت کے مطابق اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ خان کا الزام یہ تھا کہ اس نے ہڑتالی بس ڈرائیوروں پر بلا وجہ لوگوں کو اشتعال دلایا تھا۔

تاہم حکومت پاکستان نے قلات کے اس فساد کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس نے قلات میں اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے فوری طور پر اپنا کوئی پولیٹیکل ایجنٹ مقرر نہ کیا۔ البتہ کوئٹہ کی انتظامیہ کے زیر تحویل علاقوں کے سیاسی اور انتظامی حالات کو بہتر بنانے کے لئے مناسب کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لئے 4 رمئی کو میر گل خان مینگل کو رہا کر دیا گیا۔

اسے یکم اپریل کو نوشکی میں بلوچستان سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔اس کے خلاف پاکستان کے خلاف سرگرم عمل ہونے کا الزام تھا۔جس دن اس کی رہائی کی خبر چھپی اس سے اگلے دن روزنامہ ''ڈان'' میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت پاکستان نے بلوچستان کے قبائلی علاقوں کی تعلیمی ترقی کے لئے سکیم تیار کی ہے۔ پاکستان کے بجٹ میں بلوچستان اور سرحد کے قبائلی عوام کی تعلیمی ترقی کے لئے پانچ لاکھ روپے مختص کئے گئے تھے۔

7 رمئی کو پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں کوئٹہ پہنچا اور دوسرے دن یہ خبر شائع ہوئی کہ ''بلوچستان کے پانچ اضلاع میں لیگ کی رکن سازی کی مہم بڑے زور شور سے جاری ہے۔صرف کوئٹہ شہر میں 25 ہزار لوگ لیگ کے رکن بن چکے ہیں۔ژوب میں چالیس ہزار،نوشکی میں تیس ہزار، سبی میں بیس ہزار اور لورالائی میں دس ہزار افراد صوبائی لیگ کے رکن بنائے گئے ہیں۔اگر رکن سازی کی رفتار یہی رہی تو امید ہے کہ ان پانچوں اضلاع میں مسلم لیگ کے ارکان کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد ہوگی۔''

13 رمئی کو بلوچستان انجمن وطن کے صدر عبدالصمد اچکزئی اور قلات نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری غوث بخش بزنجو کو بھی رہا کر دیا گیا اور پھر 14 رمئی کو مکران میں خان قلات کے مقرر کردہ گورنر شہزادہ عبدالکریم کو برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر عمل میں آیا۔

اس ساری کاروائی کے پس منظر میں خارجی اور داخلی حقائق یہ تھے کہ (1) حکومت پاکستان نے تنازعہ کشمیر کے بارے میں اینگلو۔امریکی بلاک کی سرد مہری کے پیش نظر سوویت یونین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اس سلسلے میں 2 رمئی کو سوویت خبر رساں ایجنسی ''تاس'' کی رپورٹ یہ تھی کہ ''نیو یارک میں پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے سوویت یونین کے نائب وزیر خارجہ گرومیکو سے ملاقات کے دوران دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور بعد میں اس سلسلے میں خطوط کا بھی تبادلہ ہوا تھا۔'' (2) پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی ختم ہوگئی تھی اور دونوں ملکوں میں سفیروں کا بھی تقرر ہو گیا تھا۔افغانستان کا سفیر 23 راپریل کو کراچی پہنچا تھا اور اس نے پاکستان کے گورنر جنرل کو اپنے کاغذات تقرری پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ افغانستان کے عوام اور حکومت کو

پاکستان کے قیام پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔میری دعا ہے کہ ہماری برادر اور ہمسایہ مملکت کی عظمت اور شان وشوکت میں روز بروز اضافہ ہو۔(3) ایران اور پاکستان کے تعلقات بہت ہی اچھے ہو گئے تھے اور ایران کے اخبار نویسوں اور ارباب اقتدار کی طرف سے پاکستان کے لئے خیر سگالی کے بے پناہ جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔(4) اقوام متحدہ میں پاکستان کی جانب سے فلسطینیوں کی پرزور حمایت کے باعث عالم عرب میں پاکستان کو بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔(5) مارچ 1948ء میں پاکستان کے پہلے بجٹ سے ساری دنیا پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ یہ نوزائیدہ ملک مالی لحاظ سے دیوالیہ نہیں ہے اور اب اس کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ (6) پاکستان نے مشرقی پنجاب اور دہلی کے لاکھوں مہاجرین کا بوجھ برداشت کر لیا تھا اور مشرقی بنگال اور سندھ میں صوبائی خود مختاری کی تحریکوں کے باوجود بحیثیت مجموعی سیاسی،معاشرتی اور معاشی استحکام کی علامتیں واضح طور پر دکھائی دینے لگی تھیں۔اور(7) اپریل 1948ء میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ پاکستان کی باقاعدہ فوج کشمیر میں مداخلت کر کے ہندوستانی فوج کی پیش قدمی روکے گی اور مئی کے اوائل میں اس مقصد کے لئے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

باب: 8

بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت
سیاسی اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ بن گئی

قلات کے شہزادہ عبدالکریم کا افغانستان کو فرار اور پاکستان۔افغانستان تعلقات میں کشیدگی

مئی کے تیسرے ہفتے میں پاکستان مسلم لیگ کا آرگنائزر چودھری خلیق الزماں بلوچستان کے دس روزہ دورے کے بعد واپس کراچی پہنچا تو اس نے بتایا کہ حکومت پاکستان کی متذکرہ کاروائیوں کے باوجود ''بلوچستان میں سب ٹھیک نہیں ہے۔وہاں کے مسلم لیگی موجودہ نظام حکومت سے ناخوش ہیں۔قبائلی سردار مسلم لیگ میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں ہیں اور وہ اپنے پرانے سرداری نظام کو ہی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔'' چودھری خلیق الزماں کے اس بیان کی تائید 23رمئی کو ہوئی جب کراچی میں یہ خبر پہنچی کہ ''خان آف قلات کا 30 سالہ چھوٹا بھائی شہزادہ عبدالکریم، جو چند دن قبل تک مکران کا گورنر تھا، 18رمئی سے لاپتہ ہے۔افواہ یہ ہے کہ وہ سرحد پار کر کے افغانستان چلا گیا ہے کیونکہ وہ قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے خلاف ہے۔''[1]

25رمئی کو گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کچھ آرام کرنے کی غرض سے کوئٹہ پہنچے تو ہوائی اڈے پر ایجنٹ گورنر جنرل کی انتظامیہ اور بلوچستان مسلم لیگ کے درمیان اس بنا پر کشیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ وہاں قائداعظم کے استقبال کے لئے نشستوں کی الاٹمنٹ میں شاہی جرگہ کے ارکان کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان پر ترجیح دی گئی تھی۔اس استقبالیہ کے فوراً بعد

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں ہوائی اڈے پر مسلم لیگ سے توہین آمیز سلوک کے خلاف احتجاج کیا اور بعد میں مسلم لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ نے ایک انٹرویو میں صوبہ کی غیر نمائندہ انتظامیہ اور شاہی جرگہ کی سخت مذمت کی۔ اس نے کہا کہ ''جرگہ سسٹم برطانوی راج کی یادگار ہے۔ تاہم میں قبائلی نظام کے خلاف نہیں ہوں۔ میرا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اس نظام کو جمہوری بنایا جائے اور قبائلی عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ جرگہ کے ارکان کا انتخاب کریں۔'' بلوچستان مسلم لیگ اور قاضی عیسیٰ کا یہ واویلا بلوچستان کے پانچ اضلاع کے شہروں کے ''عوامی نمائندوں'' اور قبائلی علاقوں کے سرداروں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کا آئینہ دار تھا۔ دونوں فریقوں کا خیال تھا کہ گورنر جنرل اپنے اس دورۂ بلوچستان کے دوران اس مشاورتی کونسل کی تشکیل کرے گا جس کا اس نے 14 رفروری کو سبی دربار میں وعدہ کیا تھا اور دونوں فریق ہی اس مجوزہ کونسل میں غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاہم گورنر جنرل نے ہوائی اڈے سے اپنی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد مسلم لیگ کے لیڈروں اور شاہی جرگہ کے ارکان سے ملاقات کرنے کے بعد مشاورتی کونسل کے بارے میں کوئی اعلان نہ کیا البتہ ایجنٹ گورنر جنرل سی۔ اے۔ جی سیوتج نے ایک بیان میں صوبائی مسلم لیگ کا اس بنا پر شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہوائی اڈے پر قائداعظم کے استقبال کے موقع پر انتظامیہ سے تعاون کیا تھا۔

25 رمئی کو گورنر جنرل کے ملاقاتیوں میں خان قلات کا وزیر خارجہ ڈگلس فل بھی شامل تھا اور سیاسی حلقوں کا خیال تھا کہ اس ملاقات میں خان قلات کے چھوٹے بھائی شہزادہ عبدالکریم کے لاپتہ ہونے کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حال پر تبادلۂ خیالات ہوگا۔ 26 رمئی کو خان قلات کوئٹہ پہنچا اور 28 رمئی کو اس نے گورنر جنرل سے تقریباً ایک گھنٹہ تک ملاقات کی۔ اسی دن روزنامہ ''ڈان'' کی رپورٹ یہ تھی کہ جب شہزادہ عبدالکریم 18 رمئی کو مستونگ سے غائب ہوا تھا تو شکار کے بہانے اپنے ساتھ اپنے بعض ساتھیوں کے علاوہ خاصی مقدار میں اشیائے خوردنی بھی لے گیا تھا اور اب وہ سرحد کے اس پار افغانستان میں مقیم ہے۔ اور یکم جون کو ڈان کی خبر میں بتایا گیا کہ ''شہزادہ عبدالکریم اپنے ساتھ بہت سا اسلحہ بھی لے گیا ہے اور اس کے ساتھ جو لوگ گئے ہیں وہ پاکستان کے مخالف ہیں۔ یہ سب کچھ سرکاری علم کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا قلات کی صورت حال کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ مقامی انتظامیہ کی تطہیر کی جائے۔ قلات نیشنل پارٹی نے وہاں مکرانیوں، پٹھانوں اور دوسرے ''غیر ملکیوں'' کے خلاف جو ایجی ٹیشن شروع کر رکھی ہے اس سے

معاملات اور بھی خراب ہو گئے ہیں۔ ان ''غیر ملکیوں'' میں سے کچھ کوئٹہ پہنچ گئے ہیں اور باقی مکران جا رہے ہیں۔ لہٰذا امید کی جاتی ہے کہ حکومت پاکستان اس صورت حال سے سختی سے نبٹے گی۔''

2 /جون کو ڈان نے اپنی اس خبر پر ادارتی تبصرہ میں یہ تجویز پیش کی کہ ریاست میں پاکستان کے دشمنوں کے تخریبی عزائم کو ناکام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں رفتہ رفتہ نمائندہ حکومت قائم کی جائے۔ ''اگر عوام الناس کو ریاستی انتظام سے وابستہ کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے تو اس طرح نہ صرف وہاں غیر وفادار عناصر کا قلع قمع ہو جائے گا بلکہ عوامی بیداری کے ایک ایسے دور کا آغاز ہو گا جو استحکام و ترقی کے لئے درکار ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں ڈگلس فل جیسے لوگوں کی ریاستی انتظامیہ میں کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔''

ڈان کی طرف سے قلات کے شہزادہ عبدالکریم کے فرار اور قلات کی انتظامیہ میں پاکستان دشمن عناصر کی موجودگی کے بارے میں ان خبروں اور ادارتی تبصروں کا ایک پس منظر یہ تھا کہ انہی دنوں کابل کے سرکاری اخبار ''انیس'' کے پہلے صفحے پر ایک مضمون میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ڈیورنڈ لائن سے لے کر دریائے سندھ تک چھ سو میل علاقے کو افغانستان میں شامل کیا جائے کیونکہ اس علاقے میں جو لوگ رہتے ہیں وہ نسلی لحاظ سے افغانستان کے باشندے ہیں۔ اس مضمون میں 1883ء کی سرحد بندی پر نظر ثانی کا بھی مطالبہ کرتے ہوئے اشارۃً متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر پاکستان اس بات پر آمادہ نہ ہوا تو اسے داخلی گڑ بڑ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جب ڈان کے نمائندے نے 7 /جون کو کوئٹہ میں مقیم ایک جلا وطن شہزادے سردار محمد اکرم خان کی توجہ ''انیس'' کے اس مضمون کی طرف مبذول کرائی تو اس شہزادے کا جواب یہ تھا کہ ''اگر میرے ملک کے اسلام دشمن لوگ تمہارے ملک کے اندرونی معاملات میں اس قدر جارحیت کے ساتھ مداخلت کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تو پھر تم افغانستان کے اندرونی معاملات میں کچھ دلچسپی لینے کی ابتدا کیوں نہیں کرتے۔''[2] تاہم قلات کے حالات روز بروز ابتر ہوتے چلے گئے جبکہ ''زیارت'' میں قائداعظم کی صحت خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔

10 /جون کی ایک اور خبر یہ تھی کہ ''قلات میں پاکستان کے دشمن عناصر کی افغانستان کی جانب فراریت کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ تازہ ترین مفروروں میں مستونگ کا نائب تحصیل دار محمد خان اور قلات کے ایکسائز ڈیپارٹمنٹ کا ایک آفیسر محمد وفا شامل ہیں۔ وہ 30 بوری غلہ، کچھ

اسلحہ اور دس بارہ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ مقامی سیاسی حلقے اس امر پر حیران ہیں کہ گزشتہ ماہ شہزادہ عبدالکریم کے ساتھ متعدد سرکاری اہلکاروں کے فرار کے بعد حکومت قلات نے جو نام نہاد احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں ان کے باوجود ابھی تک یہاں سے پاکستان کے غداروں کو افرادی قوت، غلہ اور اسلحہ مہیا ہو رہا ہے۔ یہ سیاسی حلقے امید کرتے ہیں کہ جب حکومت پاکستان کا پولیٹیکل ایجنٹ خان بہادر شیر زمان خان اپنے عہدہ کا چارج سنبھال لے گا تو صورت حال تسلی بخش ہو جائے گی۔ یہاں کی انتظامیہ میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ قلات نیشنل پارٹی کے وجود کو ختم کیا جائے۔'' ڈان نے 14 رجون کو اس خبر پر اداراتی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''قلات سے غداروں کی فراریت کے معاملے میں کئی ذمہ دار سرکاری اہلکار ملوث ہیں لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو مقامی پولیس بہت نااہل ہے یا سرکار نے غداروں کے اس ٹولے سے ساز باز کر رکھی ہے...... پاکستان کی مخالف قوتوں نے قلات کو اپنی سرگرمیوں کا اڈہ بنا رکھا ہے اور غداروں کی فراریت کا یہ سلسلہ ان کی سرگرمیوں سے بے تعلق نہیں ہو سکتا ہے۔ ضرورت فوری کاروائی کی ہے کیونکہ ایسے واقعات میں اضافہ ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ حکومت پاکستان نے قلات کے ارباب اختیار سے اس بارے میں سلسلہ جنبانی کی ہے۔ امید ہے کہ جب نیا پولیٹیکل ایجنٹ قلات میں اپنا عہدہ سنبھالے گا تو وہ اس معاملے کی طرف فوراً توجہ دے گا۔'' ڈان کی ان خبروں اور اداریے کا مطلب دراصل یہ تھا کہ خان احمد یار خان والئی قلات پاکستان کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ اس لئے اسے لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مگر ڈان اور دوسرے اخبارات کے علاوہ کسی سیاسی لیڈر کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ کھل کر اس شخص کا نام لیں۔ ان سب کی اس بارے میں خاموشی کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ چونکہ خان آف قلات پاکستان کے گورنر جنرل کا ''ذاتی دوست'' ہے اس لئے اس کا نام لے کر اس کی غدارانہ سرگرمیوں کو بے نقاب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

تاہم اسی دن یعنی 14 رجون کو ہی کراچی میں افغانستان کے سفیر سردار شاہ ولی خان کے ایک بیان سے شہزادہ عبدالکریم کی سرگرمیوں کے باعث پاکستان اور افغانستان کے درمیان پیدا شدہ نئی کشیدگی میں خاصی کمی آ گئی۔ شاہ ولی خان کا بیان یہ تھا کہ ''اخبارات میں افغانستان

کے خلاف جو کچھ چھپ رہا ہے وہ سب غلط ہے۔ہم کسی علاقے پر قبضہ کرنے کا عزم نہیں رکھتے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ افغانوں کا قومی وجود قائم رہے اور ان کی عزت کی جائے۔"[3] جس دن یہ بیان شائع ہوا اسی دن قلات سے موصول شدہ یہ "افواہ" بھی شائع ہوئی کہ "خان قلات نے ریاستی انتظامیہ میں اہم تبدیلیاں کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ڈوگلس فل کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے فارغ کر دیا جائے گا اور آئندہ وہ محض وزیر خارجہ کے فرائض سرانجام دے گا۔" اور اس سے اگلے دن یہ خبر چھپی کہ حکومت سرحد نے خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر کے اسے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت تین سال قید بامشقت کی سزا دی ہے۔اس کے اگلے دن 17 رجون کو کابل ریڈیو نے ایک نشریے میں یہ اعلان کیا کہ چند دن قبل کراچی میں افغانستان کے سفیر نے جو یہ بیان دیا تھا کہ افغانستان کسی علاقے کا دعویدار نہیں ہے۔اس سے حکومت افغانستان کی پالیسی کی عکاسی نہیں ہوتی۔نشریے میں مزید کہا گیا تھا کہ "حکومت افغانستان ایسا دعویٰ کرتی رہی ہے اور اب بھی کرتی ہے اور اس نے کئی مرتبہ حکومت پاکستان کو اس سلسلے میں مطلع کیا ہے۔آل انڈیا ریڈیو نے بھی اسی دن اپنی خبروں میں کابل ریڈیو کے اس نشریے کا ذکر کیا۔"[4] تاہم اس دن قلات میں پاکستان کے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ خان بہادر شیر زمان خان نے اپنا عہدہ سنبھال کر وہاں پاکستان کا پرچم لہرانے کی رسم ادا کی۔اس تقریب میں خان آف قلات نے شرکت نہ کی۔ البتہ حاضرین میں اس کا وزیر خارجہ ڈوگلس فل اور اس کے دارالامراء کا قائد نواب سر حاجی اسداللہ خان رئیسانی موجود تھے۔

صوبائی مسلم لیگ اور قبائلی جرگہ کے مابین تضاد کی وجہ سے مشاورتی کونسل کی تشکیل کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا

جس دن قلات میں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کے نفاذ کی یہ رسم ادا ہوئی اسی دن گورنر جنرل پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کوئٹہ سے بغرض آرام زیارت چلے گئے۔کوئٹہ میں تقریباً تین ہفتے قیام کے دوران ان کی صحت بہت ہی خراب ہوگئی تھی۔کیونکہ اس عرصے میں وہ نہ صرف ریاست قلات کے پیچیدہ مسئلے کو سلجھانے میں ہمہ وقت مصروف رہے تھے بلکہ بلوچستان کے لئے مجوزہ مشاورتی کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں مختلف گروہوں کی باہمی رسہ کشی نے انکی طبیعت کو خاصا

مکدر کیا تھا۔ مسلم لیگی لیڈروں کی خواہش یہ تھی کہ اس کونسل میں ان کا غلبہ ہو۔ چنانچہ ان کی تحریک پر 7 رجون کو ڈان میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ''قائداعظم مجوزہ مشاورتی کونسل کی ہیئت اور اس کے ارکان کی نامزدگی کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ باوثوق ذرائع کی اطلاع کے مطابق بلوچستان مسلم لیگ کے صدر سے کہا گیا ہے کہ وہ اس کونسل کے لئے سات نام پیش کرے۔ کونسل کی تشکیل کے بارے میں قطعی اعلان ماہ رواں کے اواخر میں ہو جائے گا۔'' جب یہ خبر کوئٹہ پہنچی تو پٹھان قبائلی سرداروں کے سرغنہ نواب محمد خان جوگیزئی نے فوراً اپنے شاہی جرگہ کا اجلاس منعقد کر کے اس سے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ وہ اپنی حسب منشا سات نام پیش کرے گا۔

13 رجون کو قائداعظم نے کوئٹہ کی پارسی انجمن کے استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ بہت جلد مجوزہ مشاورتی کونسل کے آئین اور قواعد وضوابط کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے موقعہ پر بلوچستان مسلم لیگ کا صدر قاضی محمد عیسیٰ کوئٹہ میں نہیں تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان مسلم لیگ کے آرگنائزر چودھری خلیق الزماں سے مشورہ کرنے کے لئے کراچی میں تھا۔ اسے جب شاہی جرگہ کے اس فیصلہ کا علم ہوا تو اس نے ایک بیان میں غیر جمہوری اور دقیانوسی جرگہ سسٹم کی سخت مذمت کی۔ اس نے کہا کہ ''اس جرگہ کے ارکان قبائلی عوام کے نمائندے نہیں ہیں۔ انہیں پولیٹیکل ایجنٹوں نے نامزد کیا ہوا ہے۔ یہ ان پڑھ ہیں اور انہیں قبائلی معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ یہ ارکان دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصلے کسی قاعدہ وقانون کے تحت نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک قتل قابل ضمانت جرم ہے لیکن گدھے کی چوری کا جرم نا قابل ضمانت ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو اس قدر وسیع اختیارات دیئے ہوئے ہیں۔ شاہی جرگہ کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہے بلکہ یہ انتظامی مشینری کا ایک جزو ہے۔ لہٰذا اسے سیاسی نوعیت کی قراردادیں منظور کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔''[5]

نواب محمد خان جوگیزئی نے 15 رجون کو قاضی عیسیٰ کے ان الزامات کی تردید کی۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ ''شاہی جرگہ انگریزوں کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کے ارکان قبائلی عوام کے حقوق کے نمائندہ ہیں۔ اگر مسلم لیگ انتخاب چاہتی ہے تو ہم اس کے لئے تیار ہیں کیونکہ اس طرح یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ کن لوگوں کو صوبہ کے عوام کا اعتماد حاصل ہے اور کون پاکستان کے خیر خواہ ہیں۔'' چونکہ فریقین کی اس بیان بازی سے بالکل واضح ہو گیا تھا کہ بلوچستان کے شہری

عناصر اور قبائلی سرداروں کے درمیان تضاد خاصہ پیچیدہ ہے اور اسے بآسانی حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے گورنر جنرل مشاورتی کونسل کے بارے میں کوئی اعلان کئے بغیر ہی 17 رجون کو زیارت چلے گئے اور پھر 19 رجون کو ''سیاسی حلقوں'' کی جانب سے ایک خبر رساں ایجنسی کی ان خبروں کی تردید کی گئی کہ مشاورتی کونسل میں شاہی جرگہ کے سات نمائندے اور صوبہ لیگ کے تین نمائندے ہوں گے اور یہ کہ قاضی عیسیٰ نے سات ناموں کی ایک فہرست پیش کی ہے۔ ان سیاسی حلقوں کا کہنا تھا کہ ''ابھی تک کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اس سلسلے میں قائداعظم کے ذہن میں کیا ہے۔ صوبہ میں مسلم لیگ کی کوئی مجلس عاملہ یا کونسل نہیں ہے، اس لئے قاضی عیسیٰ کی جانب سے مجوزہ کونسل کے ارکان کے ناموں کی کوئی فہرست پیش نہیں کی گئی ہے۔''

کوئٹہ کے ''سیاسی حلقوں'' کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ 14 رفروری کو بلوچستان میں مشاورتی کونسل کی تشکیل کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی تکمیل کا معاملہ کھٹائی میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہاں انیسویں صدی کا ایجنٹ راج، سرداری نظام اور جرگہ سسٹم بدستور نافذ رہا اور وہاں کے عوام کو یہ احساس نہ ہونے پایا کہ برصغیر سے برطانوی سامراج کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک قائداعظم جناح کی صحت بہت ہی خراب ہو چکی تھی اور ان میں مقامی مسلم لیگی لیڈروں اور قبائلی سرداروں کے درمیان تضاد کو مؤثر طریقے سے حل کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جون کے دوسرے ہفتے میں خان عبدالغفار خان کی غداری کے الزام کے تحت سزائے قید کی وجہ سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات پھر بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے سرحدی گاندھی کی پاکستان کے خلاف اس ''سازش'' کے ثبوت کے طور پر ایک سرکش قبائلی لیڈر فقیر اپی کے ''پنڈت جواہر لعل بادشاہ ہند دام اقبالہ'' کے نام ایک خط کا عکس اخبارات میں چھپوایا تھا جس میں ''فدوی'' نے مبینہ طور پر حکومت ہندوستان سے پاکستان کے خلاف مالی اور فوجی امداد طلب کی تھی۔ درآں حالیکہ کابل ریڈیو کھلم کھلا پاکستان کے سینکڑوں مربع میل علاقے پر ملکیت کا دعویٰ کرتا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ خان قلات کا چھوٹا بھائی پرنس عبدالکریم سرحد کے اس پار ایک قبائلی لشکر منظم کر رہا تھا اور اس کے عزائم باغیانہ تھے جبکہ افغانستان کی حکومت اس کی اس امید میں پشت پناہی کر رہی تھی کہ اس کی کامیابی کی صورت میں افغانستان کو گوادر اور پسنی کی بندرگاہوں کی سہولتیں مہیا ہو جائیں گی۔

قائداعظم کے حکم پر قلات کی بغاوت کچلنے کے لئے فوجی کاروائی

قائداعظم نے اس صورت حال کے پیش نظر 25 رجون کو بلوچستان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل اکبر خان کو زیارت طلب کیا اور اس کے ساتھ دو دن تک اہم فوجی معاملات کے بارے میں بات چیت کی۔ اس بات چیت کے بعد گورنر جنرل پاکستان اپنی شدید علالت کے باوجود کراچی گئے جہاں انہوں نے یکم جولائی کو پہلے سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کیا اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ ریاستی امور اور سرحدی علاقوں کے معاملات کو نبٹانے کے لئے ایک نئ وزارت کی تشکیل ہوگی جس کا قلمدان ان کے اپنے پاس رہے گا۔ لیفٹیننٹ کرنل اے۔ ایس۔ بی شاہ کو اس نئ وزارت کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

قائداعظم کراچی میں دو ایک دن قیام کر کے واپس زیارت پہنچے تو اس کے چار پانچ دن بعد 8 رجولائی کو جبکہ مشرق وسطیٰ کے قلب میں اسرائیل کی مملکت کے وجود میں آنے کے بعد وہاں صیہونیوں اور عربوں کے درمیان گھمسان کی جنگ جاری تھی اور کشمیر میں پاکستانی فوج ہندوستانی حملہ آور فوج کی پیش قدمی روکنے کی کوششوں میں مصروف تھی، شہزادہ عبدالکریم تقریباً 200 قبائلیوں کے لشکر کو ساتھ لے کر واپس ریاستی علاقہ میں آیا اور اس نے پاکستان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر قائداعظم کی 25 رجون کی ہدایت کے مطابق میجر جنرل اکبر خان کی بلوچ رجمنٹ کی دو کمپنیاں فوراً حرکت میں آئیں۔ یہ کمپنیاں 12 رجولائی کو جھلاواں کے علاقے میں پہنچیں اور انہوں نے فوراً ہی باغی قبائلی لشکر کو محاصرے میں لے لیا۔ جب ان کمپنیوں کے کمانڈر نے کوئی گولی چلانے سے پہلے باغیوں کو الٹی میٹم دیا تو شہزادہ عبدالکریم کی طرف سے ریاست قلات کے قائم مقام وزیراعظم ڈگلس فل اور اس کے ایک انگریز افسر اینڈرسن نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان دونوں کے قبضے سے جو دستاویزات برآمد ہوئیں ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ خان قلات پاکستان کے خلاف اس بغاوت میں براہ راست ملوث تھا اور اس نے اس مقصد کے لئے خاصی بڑی رقوم ادا کی تھیں۔

16 رجولائی کو شہزادہ عبدالکریم اور اس کے 12 ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تو اس سے اگلے دن قلات نیشنل پارٹی پر پابندی عائد ہوگئی۔ یہ پارٹی 1930ء میں قائم ہوئی تھی اور اس کا

آل انڈیا کانگرس کی ذیلی تنظیم آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے ساتھ الحاق تھا۔20 رجولائی کو کوئٹہ ڈسٹرکٹ جیل میں شہزادعبدالکریم اوراس کے ساتھیوں کے خلاف بغاوت کے الزام میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔23 رجولائی کوخان قلات نے اپنے انگریز وزیراعظم ڈوگلس فیل، وزیردفاع بریگیڈئیر پیویز اور دوسرے سارے وزیروں کوعلیحدہ کر دیااوراس طرح اس کی مطلق العنان حکومت رسمی طور پراختتام پزیر ہوئی۔قلات کے گورنرابراہیم خان گچکی اور''خان معظم'' کے پرائیوٹ سیکرٹری ایم عظیم کوبھی برطرف کر دیا گیااور پاکستان کے پولیٹیکل ایجنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ ایم عظیم کے خلاف پاکستان دشمن سرگرمیوں کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ جب جولائی کے آخری ہفتے میں پاکستانی فوج کی اس مؤثر کاروائی کی اطلاع زیارت میں قائداعظم کو پہنچائی گئی تو اس وقت وہ لاہور کے ایک ڈاکٹرالٰہی بخش کے زیرعلاج تھے اوراس ڈاکٹر کی تشخیص یہ تھی کہ بابائے قوم کوتپ دق کاایساموذی مرض لاحق ہے جوعلاج کی حدود سے باہر جاچکا ہے۔

ریاست قلات کی بغاوت فرو ہونے کے بعد پاک ۔افغان تعلقات کی کشیدگی میں کمی

پاکستانی فوج کی اس پُرامن کاروائی سے میجر ہزہائی نس میر حاجی سراحمد یارخان جی۔سی۔آئی۔ای بیگلر بیگی، امیرالامراء، غالب جنگ بہادر، خان معظم آف قلات کا شہنشاہی خواب قطعی طور پر پریشان ہوگیا تو اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات میں پھرخوشگواری کا کچھ عنصر شامل ہوگیا۔اس کا اظہار 2 راگست کو ہوا جبکہ افغانستان میں پاکستان کا سفیر آئی۔آئی۔چندریگر اپنی حکومت سے مشورہ کرنے کے لئے ایک ہفتہ کے لئے پاکستان آیا۔اس نے پشاور میں ایک انٹرویو میں امید ظاہر کی کہ''افغانستان اور پاکستان کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات استوار ہوں گے کیونکہ دونوں ملکوں کے مفاد کا تقاضا یہی ہے۔''
6 راگست کو چندریگر نے کراچی میں کہا کہ''افغانستان کے عوام پاکستان کے لئے دوستی اور مروت کے مخلصانہ جذبات کے حامل ہیں۔''

9 راگست کو پاکستان میں عراق کے ناظم الامور ایس سلجوقی نے کہا کہ''آج کل جبکہ

اقوام عالم ابھر رہی ہیں، افغانستان کی قوم اور حکومت اپنی ہمسائیگی میں ایک برادرانہ قوم کے معرض وجود میں آنے پر حقیقتاً بہت خوش ہیں کیونکہ افغانستان اور اس نوجوان قوم کا مذہب ونظریہ مشترک ہے۔ جولوگ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات غیر دوستانہ ہیں، وہ پاکستان اور سارے عالم اسلام کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔'' عراقی سفارتخانے کے ناظم الامور کا یہ بیان اس حقیقت کا مظہر تھا کہ عراق اور مشرق وسطیٰ کے بعض دوسرے ممالک پاکستان اور افغانستان کے درمیان تنازعہ کو رفع دفع کروانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ صیہونیت اشتراک کی مقتضی تھی۔ مزید براں برطانوی سامراج بھی وسطی ایشیا میں استحکام کا خواہاں تھا کیونکہ اسرائیل کی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد پورے مشرق وسطیٰ میں اینگلو۔امریکی بلاک کے خلاف ایک طوفان برپا ہو گیا تھا۔

کابل کے اخبار ''انیس'' نے اسی دن یعنی 9راگست کو لندن کے روزنامہ ٹائمز کے اس ادارتی الزام کی پرزور تردید کی تھی کہ افغانستان پاکستان میں پٹھانستان کی تحریک کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ انیس کا موقف یہ تھا کہ افغانستان کی جانب سے پاکستان کے خلاف کسی سازش کی کوئی ایک مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ افغانستان نے کبھی روس یا ہندوستان کی تحریک پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس نے پاکستان سے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ دوستانہ اور برادرانہ طور پر کہہ دیا گیا ہے۔ افغانستان اپنی سرحدوں میں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر توسیع کرنے کا خواہاں نہیں ہے۔ لندن ٹائمز نے اس سلسلے میں جو الزام عائد کیا ہے وہ سراسر اتہام ہے اور افغانستان کی خارجہ پالیسی کے منافی ہے۔''[6]

10 راگست کو پاکستانی سفیر چندریگر پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد واپس کابل کے لئے روانہ ہوا تو کراچی میں افغان سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری عبدالحمید مخمور نے اس کے نام ایک الوداعی پیغام میں امید ظاہر کی کہ چندریگر دونوں مسلم ممالک کے درمیان برادرانہ تعلقات کو مضبوط کر سکے گا۔ مخمور نے امریکہ میں پاکستانی سفیر ایم۔ایچ اصفہانی کے اس بیان کا خیر مقدم کیا کہ پاکستان میں امریکہ کی امداد سے صنعت کاری کی جائے گی۔ اس نے کہا ہم اس مقصد کے لئے افغانستان کے سارے معدنی ذخائر پاکستان کے حوالے کرنے پر تیار ہیں۔ ہمارے ملک میں تانبے، کوئلے اور لوہے کے بہت ذخائر ہیں۔ ہمارا کوئلہ جو پاکستان کی سرحد سے صرف ایک میل کے فاصلے پر

ہے، پاکستان کے لئے ایک بے انتہا قیمتی اثاثہ ہوگا۔ پاکستان کو آسٹریلیا سے کھالیں، چمڑا اور اون درآمد کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی کیونکہ وہ یہ اشیاء اپنے دروازے پر ہی افغانستان سے حاصل کر سکے گا۔''[7]

14 راگست کو یوم آزادی کے موقع پر قائداعظم نے اپنے بستر علالت سے قوم کے نام جو پیغام جاری کیا اس میں کہا گیا تھا کہ ''پاکستان دنیا میں سب سے بڑا مسلم ملک ہے اور اس حیثیت سے یہ لازمی طور پر سال بسال شاندار کردار ادا کرے گا۔ بشرطیکہ ہم دیانت داری، اخلاص اور بے لوثی کے ساتھ اس کی خدمت کریں۔'' اسی دن واشنگٹن سے یہ اعلان ہوا کہ ''مشرقی بحراوقیانوس اور بحیرہ روم میں امریکی بحریہ کے کمانڈر انچیف ایڈمرل رچرڈ کنولی (Richard Conoly) کی سرکردگی میں تین امریکی جنگی جہاز بارہ دن کے لئے خیر سگالی دورے پر پاکستان جائیں گے۔'' یہ تینوں جہاز 18 راگست کو کراچی پہنچے اور 20 راگست کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکی بحری فوج کے افسروں کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی جس میں تقریباً چار سو مہمانوں نے شرکت کی۔''[8]

اس تقریب سے دو ایک دن پہلے افغان نیشنل بینک اور روس کے محکمہ تجارت کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا تھا جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ افغانستان روس کو اون سپلائی کرے گا اور روس افغانستان کو کھانڈ، پٹرول، مٹی کا تیل اور بعض دوسری اشیاء دے گا اور 23 راگست کو تہران سے یہ خبر آئی تھی کہ ایران میں امریکہ کے درآمدی مال کی مالیت 1939ء میں چار لاکھ ڈالر سے بڑھ کر 1947ء میں 28 لاکھ ڈالر ہوگئی ہے جبکہ ایران اور برطانیہ کے درمیان بحرین جزیرہ کے بارے میں تنازعہ بدستور موجود ہے۔ حکومت ایران کی جانب سے اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی میں زیادہ حقوق کا مطالبہ جاری ہے اور ایران و افغانستان کے درمیان دریائے ہلمند کے پانی کی تقسیم کے جھگڑے کا بھی ابھی تک تصفیہ نہیں ہوا جبکہ اس بنا پر بلوچستان سے ملحقہ ایرانی صوبہ سیستان میں قحط کی حالت پیدا ہوگئی ہے۔

لیکن ان ساری باتوں کے باجود پاکستان اور افغانستان کے باہمی تعلقات میں پیدا شدہ خوشگواری کا عمل جاری رہا۔ اگست کے اواخر میں ایک سرکاری پاکستانی وفد وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر کی سربراہی میں افغانستان کے یوم آزادی کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لئے

کابل گیا تو وہ وہاں سے یہ تاثر لے کر آیا کہ افغانستان کے عوام حکومت پاکستان کے ساتھ سیاسی، معاشی اور معاشرتی روابط مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور 12 ستمبر کو ''ڈان'' نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ سردار عبدالرب نشتر کے دورۂ افغانستان کے بعد کابل ریڈیو نے پاکستان کے خلاف کوئی معاندانہ تبصرہ نہیں کیا۔

قائداعظم کے انتقال کے بعد لیاقت علی خان کا قبائلی سرداروں سے گٹھ جوڑ......اصلاحات کا عمل سست پڑ گیا

30 ستمبر 1948ء کو یعنی قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے دو اڑھائی ہفتے بعد پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنے اقتدار کے استحکام کی کاروائی کی ابتدا دورۂ بلوچستان سے کی۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا بلوچستان کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس نے کوئٹہ میں اپنے تین روزہ قیام کے دوران مقامی مسلم لیگ کے لیڈروں اور شاہی جرگہ کے وفود کے علاوہ سینیئر فوجی افسروں سے بھی ملاقات کی۔ 2 اکتوبر کو مسلم لیگی لیڈروں کے وفد نے اس سے ملاقات کر کے یہ مطالبہ کیا کہ مرکزی کابینہ میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے اور وہاں ضروری اصلاحات نافذ کر کے دقیانوسی جرگہ سسٹم کو ختم کیا جائے۔ وفد نے اس کو یاد دلایا کہ اس نے مارچ 1944ء میں متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے خود اس استبدادی نظام عدالت کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ مگر اس یاددہانی کے باوجود وزیراعظم لیاقت علی خان نے ملک کے اس پس ماندہ ترین علاقے میں قبائلی سرداروں کی ظالمانہ بالادستی ختم کرنے کا کوئی وعدہ نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لیاقت علی خان بابائے قوم کے انتقال کے بعد اپنے اقتدار کے ابتدائی دور میں بلوچستانی قبائلی سرداروں کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ ان دنوں (''ڈان'' کی اطلاع کے مطابق) ملحقہ مملکت ایران میں اشتراکی رجحانات رکھنے والی تودہ پارٹی زور پکڑ رہی تھی، اس لئے بلوچستان میں قبائلی بدامنی کا ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

غالباً یہی دو وجوہ تھیں جن کو پیش نظر رکھ کر ''ہز ہائی نس'' میر احمد یار خان والئ قلات نے 4 اکتوبر کو کوئٹہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ میرا اولین کام یہ ہے کہ میں بلوچستان کے عوام کو پہلے سے دگنے جوش و جذبہ کے ساتھ پاکستان کا دفاع کرنے

کے لئے تیار کروں۔قوم کو آج کل جو ہنگامی حالات درپیش ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب متحد ہو کر پاکستان کو نا قابل تسخیر اور دنیا کی طاقتور ترین ریاست بنائیں۔ یہ وقت بلوچستان میں مجوزہ مشاورتی کونسل میں نمائندگی کے سوال پر مقامی مسلم لیگ اور شاہی جرگہ کے درمیان تنازعہ کا نہیں ہے۔ میں دونوں فریقوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے اختلافات کو حل کر کے پاکستان کے عوام کی ترقی کے لئے شب و روز کام کریں۔اس نے صوبہ پرستی کی مذمت کی اور کہا کہ ''جو لوگ صوبہ پرستی کا پرچار کرتے ہیں ان کا بے رحمی سے قلع قمع کرنا چاہیے۔''[9] غالباً خان قلات کی اس پریس کانفرنس کی ایک تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت علی خان نے کوئٹہ میں اس سے ملاقات کے دوران اسے یقین دلایا تھا کہ جولائی میں اس کے بھائی شہزادہ عبدالکریم کی بغاوت کے باوجود اس کے نوابی حقوق و مراعات کو برقرار رکھا جائے گا اور ریاست قلات میں کوئی جمہوری اصلاحات نافذ نہیں کی جائیں گی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ خان قلات اس پریس کانفرنس کے بعد ولی عہد شہزادہ جہاں زیب کے ہمراہ کراچی پہنچا اور وہاں اس نے 10 ؍اکتوبر کو ریاستی امور کے مرکزی وزیر سردار عبدالرب نشتر سے طویل ملاقات کی۔لیکن اس ملاقات میں جو کچھ طے ہوا وہ صیغۂ راز میں ہی رہا۔

19 ؍اکتوبر کو بلوچستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخابات میں قاضی محمد عیسیٰ نویں مرتبہ صدر منتخب ہو گیا تو صوبہ میں اصلاحات کے مسئلہ پر بحث میں پھر تیزی آ گئی۔ مسلم لیگی لیڈروں کو شکایت تھی کہ صوبہ کی انتظامیہ میں غیر لیگی عناصر یعنی قبائلی سرداروں کا غلبہ ہے۔اس لئے مسلم لیگیوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی اور ان میں مایوسی پھیل رہی ہے۔

بلوچستان کے قبائلی معاشرہ میں عورتوں کی خرید و فروخت کا ظالمانہ نظام

جس دن قاضی عیسیٰ کا صوبہ لیگ کے صدر کے طور پر انتخاب ہوا، اس دن مسلم لیگیوں کی اس روز افزوں بددلی و مایوسی کا اظہار ہوا جبکہ بلوچستان گرلز سول لبرٹیز ڈیفنڈنگ سوسائٹی کی سیکرٹری عائشہ بیگم بزدر نے ایک بیان میں نہایت دردمندانہ اپیل کی کہ 1901ء کے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن 111 میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ بلوچستان کی عورتوں کو صدیوں کی غلامی سے نجات مل سکے۔ اس بیان میں کہا گیا کہ بلوچی عورتوں کی کھلی مارکیٹ میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ عورتوں کی جنس کے ذریعے قرضوں کی ادائیگی ہوتی ہے۔بعض اوقات ایک بلوچی لڑکی کا اس کی

پیدائش سے پہلے ہی کئی مرتبہ سودا ہو جاتا ہے اور سیاسی عدالتیں نہ صرف اس کاروبار کو جائز قرار دیتی ہیں بلکہ ان سودوں کی تکمیل کرواتی ہیں۔عورتوں کی نیلامی بھی ہوتی ہے اور کوئی بیوہ عورت اس وقت تک شادی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کا دوسرا شوہر اس کی قیمت ادا نہیں کرتا۔ یہ قیمت اس بیوہ کے مرحوم شوہر کے رشتہ داروں کو دی جاتی ہے۔اگر کوئی بلوچ لڑکی بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد اپنی صغیرسنی کے نکاح کو فسخ کردیتی ہے اور دوسری شادی کر لیتی ہے تو اس کے والدین اور اس کے دوسرے شوہر کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ اس کے پہلے شوہر کو اس کی پوری قیمت ادا کریں۔ انہیں دیرینہ بلوچی رواج کی خلاف ورزی کرنے کا بہت جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے اور پھر انہیں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کی دفعہ 36 کے تحت علاقہ بدر کردیا جاتا ہے۔اگر کوئی عورت طلاق حاصل کرلے تو اس کے سابقہ شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس کے پاس چاہے اس کو فروخت کردے اور اگر یہ مطلقہ عورت اپنے ناپسندیدہ خریدار سے شادی نہ کرے بلکہ اپنے پسندیدہ کسی تیسرے شخص سے شادی کرلے تو عدالت یہ حکم جاری کردیتی ہے کہ یہ تیسرا شخص اس دوسرے شخص کو پوری قیمت ادا کرے جو اس عورت کو خریدنے میں کامیاب نہیں ہوا۔عائشہ بیگم نے اپنے بیان میں کہا کہ ہم اس صورت حال کی اصلاح کے لئے 1930ء کے بعد مقامی حکام سے کئی مرتبہ رجوع کرتی رہی ہیں۔لیکن ہر مرتبہ ہمیں یہی جواب ملتا ہے کہ حکومت بلوچ قبائل کے دیرینہ رواج کی خلاف ورزی نہیں کرسکتی۔لیکن اب ہم حکومت سے پوچھتی ہیں کہ پاکستان کی اسلامی ریاست میں بلوچوں کو کب تک غیر مہذب رکھا جائے گا۔"[10]

نومبر کے اوائل میں کسی گمنام شخص نے روزنامہ ڈان میں ایک مضمون کے ذریعے عائشہ بیگم کے اس لرزہ خیز بیان کی صداقت سے تو انکار نہ کیا البتہ بلوچی عورتوں کی حالت زار کا یہ جواز پیش کیا کہ "یہ سب کچھ بلوچوں کے رسوم ورواج کے مطابق ہے اور مروجہ قانون کے کسی نقص کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلوچوں کے بزرگوں کی کونسل (جرگہ) سارے فیصلے کرتی ہے اور یہ فیصلے ان کی رسوم وروایات کے مطابق ہوتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوسکتی۔ بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں کوئی دیوانی یا فوجداری عدالتیں نہیں ہیں اور ان علاقوں میں امن وامان صرف جرگہ کے ذریعے برقرار رکھا جاتا ہے۔اس علاقے میں اس مقصد کے لئے پولیس یا کوئی اور انتظامی شعبہ نہیں ہے۔"

9 رنومبر کو بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ نے الزام عائد کیا کہ یہ مضمون کسی سرکاری افسر نے لکھا ہے اور اس کا مقصد ان ظالمانہ قوانین اور رسوم کو برقرار رکھنا ہے جو اسلام کے سراسر منافی ہیں۔ بلوچستان میں کوئی قبائلی علاقہ نہیں ہے۔ یہ نام نہاد قبائلی سردار کسی کی نمائندگی نہیں کرتے۔ انہیں موجودہ مقام محض برطانوی راج کی برکتوں کی وجہ سے حاصل ہے اور 1901ء کا فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز ان کے اس مقام کا تحفظ کرتا ہے۔'' مگر عائشہ بیگم اور قاضی عیسیٰ کا یہ واویلا نتیجہ خیز نہ ہوا۔ کراچی کے ارباب اقتدار کو ان کی سیاسی مصلحتوں نے بہرہ کر رکھا تھا۔ ان کے کان تھے لیکن انہیں بلوچ عورتوں کی مظلومیت کے بارے میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ اس دیرینہ مطالبے کی کسی نہ کسی طرح شنوائی ہو گئی کہ کوئٹہ کے انٹرمیڈیٹ کالج کو ڈگری کالج کا درجہ دیا جائے۔ 26 رنومبر کو پاکستان کے وزیر تعلیم فضل الرحمن نے بلوچستان میں اس پہلے ڈگری کالج کا افتتاح کیا۔ اس نے اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ''تعلیمی اور معاشی لحاظ سے بلوچستان پاکستان کا پسماندہ ترین علاقہ ہے۔''

وزیر تعلیم کی اس تقریر میں بلوچستان کی سیاسی پسماندگی کا کوئی ذکر نہیں تھا حالانکہ اس کی کوئٹہ میں آمد سے صرف دو دن پہلے بلوچستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اپنے صوبہ کی انتظامیہ میں سیاسی نمائندگی کی عدم موجودگی کا رونا رو چکی تھی اور اپنے اس فیصلے کا اعلان بھی کر چکی تھی کہ ''مسلم لیگیوں کا ایک نمائندہ وفد کراچی جا کر گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے یہ مطالبہ کرے گا کہ پاکستان کے پسماندہ ترین علاقہ بلوچستان کو سیاسی ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے اور بلوچستانی عوام کو ان کے بنیادی جمہوری حقوق دیئے جائیں۔''

صوبائی مسلم لیگ اور شاہی جرگہ کا صوبہ میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے مرکزی حکومت پر دباؤ

مذکورہ اعلان پر تقریباً ایک ماہ بعد عمل ہوا جبکہ بلوچستان مسلم لیگ کے ایک دس رکنی وفد نے قاضی محمد عیسیٰ کی زیر قیادت 21 ردسمبر کو کراچی میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس پرانی التجا کا اعادہ کیا کہ مرکزی کابینہ میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے اور اس صوبائی مشاورتی کونسل کی تشکیل کی جائے جس کا وعدہ قائداعظم مرحوم نے 14 رفروری 1948ء کو

سبی دربار میں کیا تھا۔ وفد کا مزید مطالبہ یہ تھا کہ ''چونکہ مسلم لیگ بلوچستان عوام کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس لئے مجوزہ مشاورتی کونسل کے سارے ارکان کا انتخاب اسی جماعت میں سے کیا جائے۔'' اس وفد نے 25 ردسمبر کو وزیر اعظم لیاقت علی خان سے بھی ملاقات کی اور اپنا یہی مطالبہ دہرایا۔ مگر وزیر اعظم نے اس مطالبہ پر غور کرنے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ عذر یہ تھا کہ صوبائی مسلم لیگ اور شاہی جرگہ کے درمیان مفاہمت کے بغیر مشاورتی کونسل کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔

اس عذر کا مسکت جواب 10 رجنوری 1949ء کو دیا گیا جبکہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بلوچستان کے نمائندہ نواب محمد خان جوگیزئی اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ نے ایک مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا کہ بلوچستان کے عوام کی سیاسی امنگوں کی تکمیل کے لئے وہاں دوایوانی قانون ساز ادارہ قائم کیا جائے۔ اس بیان میں کہا گیا کہ بلوچستان مسلم لیگ اور بعض قبائلی سرداروں کے درمیان موہوم اختلافات کو وہاں کے عوام کی ترقی کی راہ پر رکاوٹ کے طور استعمال کیا جارہا ہے۔ ہمیں سیاسی طور پر ابھی تک دبایا جارہا ہے۔ صوبہ کی انتظامیہ میں ہماری کوئی آواز نہیں ہے اور مرکزی کابینہ میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بلوچستان کے سرکاری ملازمین کو بھی مرکزی دفاتر میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ اب ہمارے عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہورہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انکی شکایات کے ازالہ میں مزید تاخیر نہیں ہوگی۔ ہم سب اپنے عوام کی تعلیمی، معاشی اور سیاسی ترقی کی خواہش میں متفق و متحد ہیں۔ ہم اپنے اس مطالبہ پر بھی متفق ہیں کہ ان سارے غیر اسلامی قوانین، رسوم اور روایات کو منسوخ کیا جائے جن کی ہمارے سابقہ حکمران حمایت اور حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ ہماری رائے میں مجوزہ مشاورتی کونسل سے ہمارے مطالبات پورے نہیں ہوں گے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمارے مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ صوبہ میں بلا تاخیر ایک دوایوانی مقننہ قائم کی جائے۔ سارے حقیقی قبائلی سرداروں کو ایوان بالا میں شامل کیا جائے اور ایوان زیریں کی تشکیل مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر موزوں اور قابل عمل طریقۂ انتخاب کے ذریعے کی جائے۔ اس طرح نہ صرف صوبہ کے عوام کی سیاسی امنگیں پوری ہو جائیں گی بلکہ بعض قبائلی سرداروں کی اس پوزیشن کا بھی تحفظ ہوجائے گا جسے وہ برقرار رکھنے کے اس قدر خواہاں ہیں۔''[11]

12 رجنوری 1949ء کو روزنامہ ''ڈان'' نے بلوچستانی لیڈروں کے اس مشترکہ بیان

پر ادارتی تبصرہ کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''حکومت پاکستان نے بلوچستان کی انتظامیہ میں ترقی پسندانہ تبدیلیاں لانے کے کام میں بہت تساہل کا مظاہرہ کیا ہے اور اس بنا پر یہ صوبہ سیاسی اور انتظامی لحاظ سے آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں یہ برطانوی راج میں تھا...... بلاشبہ وسیع پیمانے کی سیاسی اصلاحات مثلاً یک ایوانی یا دو ایوانی مقننہ کا قیام، دستور ساز اسمبلی کی جانب سے آئین سازی کے کام کی تکمیل سے پہلے نہیں ہوسکتا۔ تاہم اب جبکہ بلوچستان مسلم لیگ اور شاہی جرگہ میں مفاہمت ہوگئی ہے تو عبوری دور کے لئے قائداعظم نے جس مشاورتی کونسل کا وعدہ کیا تھا، اس کی تشکیل ہوسکتی ہے۔'' 15 رجنوری کو پاکستان مسلم لیگ کے آرگنائزر چودھری خلیق الزماں نے بھی ایک بیان میں ڈان کی اس رائے کی تائید کی کہ اب جبکہ صوبائی مسلم لیگ اور شاہی جرگہ میں اتفاق واتحاد ہوگیا ہے تو عبوری انتظام کے طور پر مشاورتی کونسل کے قیام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ 17 رجنوری کو بلوچستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں قاضی عیسیٰ اور نواب جوگیزئی کے مشترکہ بیان کی توثیق کی اور قاضی عیسیٰ کو یہ اختیار دیا کہ وہ صوبہ میں عبوری سیاسی انتظام کے طور پر ایک با اختیار مشاورتی کونسل کے قیام کے لئے حکومت بلوچستان اور مرکزی حکومت سے بات چیت کرے۔

صوبہ مسلم لیگ کے مجلس عاملہ کی اس قرارداد کی منظوری کے چار پانچ دن بعد 22 رجنوری کو، پانچ چھ دن پہلے 16 رجنوری کے اخبارات میں شائع شدہ اس خبر کی سرکاری طور پر تصدیق کر دی گئی کہ بلوچستان کا انگریز ایجنٹ گورنر جنرل سی۔اے۔جی۔سیوتج ریٹائر ہو رہا ہے اور اس کی جگہ انڈین پولیٹیکل سروس کے ایک پٹھان افسر لیفٹیننٹ کرنل ایس۔ایم خورشید کا تقرر کیا گیا ہے اور اسی دن یہ خبر شائع ہوئی کہ پاکستان کا گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین 26 رفروری کو روایتی سبی دربار میں بلوچستان کے لئے اہم سیاسی اصلاحات کا اعلان کرے گا اور یہ کہ حکومت پاکستان نے ریاست کے وزیر اعظم خان محمد ظریف خان کا استعفیٰ منظور نہیں کیا ہے۔[12] اس نے چند دن قبل خان قلات سے اختلافات کی بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا۔

31 رجنوری کو صاحبزادہ خورشید نے سبی میں سیوتج سے اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ انڈین پولیٹیکل سروس کا یہ افسر برطانوی راج میں پہلے ژوب اور چاغی کے اضلاع میں بطور پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا تھا اور اب بلوچستان میں اس کے بطور ایجنٹ گورنر جنرل تقرر سے اس بدنصیب

صوبہ میں کچھ نہ کچھ اصلاحات کے لئے زمین ہموار ہوگئی تھی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ اب نواب جوگیزئی اور قاضی عیسیٰ کے 10 رجنوری کے مشترکہ بیان کے بعد بلوچستان کو سیاسی اور انتظامی لحاظ سے جوں کا توں رکھنے کا کوئی داخلی جواز باقی نہیں رہا تھا۔

خلیج کے تیل پیدا کرنے والے ممالک پر اینگلو۔امریکی غلبہ اور بلوچستان کی اصلاحات

خارجی عوامل بھی بلوچستان کی انتظامیہ میں کچھ نہ کچھ ترقی پسندانہ ردوبدل کے لئے موافق تھے۔ ایران اور عراق پر اینگلو۔امریکی بلاک کی بالادستی پوری طرح قائم ہوچکی تھی۔ روسی اخبار ''پراودا کے بیان کے مطابق اس وقت تک ''ایران اور امریکہ میں ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا جس کے تحت امریکی افواج کو ایران کے ہوائی، بحری اور فوجی اڈوں کی سہولتیں دی گئی تھیں تا کہ مشرق وسطیٰ میں امریکی آئل کمپنیوں کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔ عراق میں زبیر کے نزدیک ایک اینگلو۔امریکی کمپنی کی زیرنگرانی تیل نکالنے کا کام شروع ہو گیا تھا اور انٹرنیشنل بینک نے ایک آئل ریفائنری کی تعمیر اور دو دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے لئے حکومت عراق کو 25 ملین ڈالر کا قرضہ دیا تھا اور یو۔ایس۔ نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کے انکشاف کے مطابق افغانستان نے بھی امریکہ سے قرضہ کے لئے خفیہ بات چیت شروع کر رکھی تھی۔ 26 رجنوری کو برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون (Ernest Beven) کا دارالعوام میں بیان یہ تھا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ کی مستقبل کی سیاست اور ترقی میں جو مقام حاصل کرنے والا ہے اسے نظرانداز کرنا نہایت حماقت کی بات ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ ''مشرق وسطیٰ کے علاقے میں افغانستان کے علاوہ اب پاکستان بھی شامل ہے جس نے ایک عظیم مسلم طاقت کی حیثیت سے مکمل آزادی حاصل کی ہے۔ پاکستان مشرق وسطیٰ کے واقعات میں بہت دلچسپی لیتا ہے۔''[13] اور اس کے چار پانچ دن بعد برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمیشن کے پریس اتاشی سلمان علی نے لندن سکول آف اکنامکس میں طلبا کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہہ کر بیون کے اس بیان کی تائید کی کہ ''اگر مشرق وسطیٰ کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو اس سے ناگزیر طور پر پاکستان کی سلامتی متاثر ہوگی۔'' تاہم سلمان علی نے یہ نہیں کہا تھا کہ مشرق وسطیٰ کی سلامتی کا مطلب دراصل اس علاقے میں اینگلو۔امریکی آئل

کمپنیوں کے مفادات کی سلامتی تھا۔

ان دنوں بلوچستان کے قریبی ممالک ایران، عراق، کویت اور سعودی عرب میں تیل کی پیداوار روز بروز بڑھ رہی تھی۔ کنزرویٹو اخبار ٹیلیگراف کا خیال یہ تھا کہ ''مشرق وسطیٰ کے تیل نے مغربی یورپ کی معیشت کے لئے آب حیات کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ دس سال قبل اس علاقے میں یورپ کے لئے 25 فیصد تیل مہیا ہوتا تھا۔ گزشتہ سال اس کا تناسب 40 فیصد تھا اور آئندہ دو سالوں میں تقریباً 80 فیصد ہو جائے گا...... لہٰذا یہ علاقہ معاشی اور فوجی لحاظ سے بے انتہا اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ اس علاقے میں تیل کے بے پناہ ذخائر سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں امن و امان، استحکام اور سلامتی ہو۔ روس کی نظریں اس علاقے پر جمی ہوئی ہیں کیونکہ دوسری جنگ عظیم میں اس کے اپنے تیل کے چشموں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔[14]

صوبہ مسلم لیگ اور قبائلی جرگہ کے مابین اختلاف کی وجہ سے ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل تشکیل نہ پاسکی

اس داخلی اور خارجی پس منظر میں 12 رفروری 1949ء کو ریڈیو پاکستان سے یہ اعلان ہوا کہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین 26 رفروری کو سبی دربار میں بلوچستان کے لئے مشاورتی کونسل کا اعلان کرے گا۔ 15 رفروری کو کوئٹہ میں روزنامہ ''ڈان'' کے نامہ نگار نے یہ خبر بھیجی کہ ریڈیو پاکستان کے اس اعلان سے بلوچستان میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ صوبائی مسلم لیگ اور قبائلی سرداروں کے درمیان اس سلسلے میں گزشتہ ایک سال سے جو تنازعہ چلا آرہا تھا اب اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حسب اعلان 26 رفروری کو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین سبی پہنچا تو اس نے روایتی دربار میں مجوزہ مشاورتی کونسل کے ارکان کے ناموں کا تو اعلان نہ کیا البتہ ریاستی اور سرحدی علاقوں کی مرکزی وزارت کی جانب سے اس اجتماع میں ایک سرکاری اعلان پیش کیا گیا جس میں مجوزہ کونسل کی ہیئت اور اس کے قواعد وضوابط کا ذکر تھا۔ اس اعلان کے اہم نکات یہ تھے کہ یہ کونسل قائداعظم کے 14 رفروری 1948ء کے اعلان کے برعکس گورنر جنرل کی نہیں ہوگی بلکہ یہ گورنر جنرل کے ایجنٹ کی ہوگی۔ کونسل کے ارکان کی تعداد 15 ہوگی اور ایجنٹ گورنر جنرل اس کا صدر ہو گا۔ کونسل میں صوبہ کے تمام مفادات کو نمائندگی دی جائے گی اور اس کی معیاد ایک سال کی ہوگی۔

دربار میں صوبائی مسلم لیگ کے سارے کونسلرز موجود تھے تاہم شاہی جرگہ کی طرف سے گورنر جنرل کی خدمت میں جو خطبۂ استقبالیہ پیش کیا گیا اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ صوبہ میں سرداری نظام اور جرگہ سسٹم کو اس وقت تک برقرار رکھا جائے جب تک کہ حکومت قبائلی سرداروں کی رضامندی کے ساتھ کوئی نیا نظام قائم نہیں کرتی۔ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''قائداعظم کی مجوزہ مشاورتی کونسل کے علاوہ ایجنٹ گورنر جنرل کے روزمرہ کے کام میں امداد کے لئے تنخواہ دار غیر سرکاری مشیروں کا بھی تقرر ہوگا جو اہم محکموں کے انچارج ہوں گے۔ مزید براں فورٹ سنڈیمن، لورالائی، سبی، پشین اور چمن وغیرہ میں کوئٹہ میونسپلٹی کی طرح کے منتخب نمائندہ ادارے قائم کئے جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد بلوچستانی ریاستوں کے عوام کے منتخب نمائندے بھی ان اداروں میں شامل ہوں گے۔ یہ ساری ریاستیں پاکستان سے ملحق ہو چکی ہیں۔ ان کا یہ الحاق نہ صرف ریاستی عوام کی خواہش سے مطابقت رکھتا ہے بلکہ اس میں ان ریاستوں کا بھی بہترین مفاد مضمر ہے۔ آج کل کی دنیا میں چھوٹی ریاستیں الگ تھلگ رہ کر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتیں۔ ان کا پاکستان کے ساتھ نہ صرف مذہبی و ثقافتی رشتہ ہے بلکہ ان کے جغرافیائی اور معاشی تقاضوں کے پیش نظر ان کے لئے کسی اور راستے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا......
ان ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے اس علاقے میں وسیع وعریض سرحدوں کی سلامتی کے بارے میں مرکزی حکومت کی ذمہ داری میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمارا پختہ فیصلہ ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو بہترین طریقے سے نبھائیں گے۔ اسی لئے نہ صرف پاکستان کی مسلح افواج کی تعداد میں اضافہ کے لئے اقدامات کئے جا رہے ہیں بلکہ ہم سرحدوں پر سول آرمڈ فورسز کے کردار سے بھی غافل نہیں ہیں۔ حال ہی میں ان فورسز کی توسیع اور تنظیم نو کی منظوری دی گئی ہے۔ حکومت یہاں کی ریاستی افواج کی کارکردگی کے معیار کو بھی بہتر بنانے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ ان افواج کی ملک کی سلامتی اور دفاع کے جامع منصوبے کے ساتھ مطابقت پیدا ہو سکے۔''[15] خیال یہ تھا کہ گورنر جنرل کے اس اعلان سے بلوچستان کے مختلف مفادات کے درمیان اتفاق، اتحاد اور یکجہتی کی فضا پیدا ہوگی۔ اس خوش فہمی کی بنیاد شاہی جرگہ کے سربراہ نواب محمد خان جوگیزئی اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ کے 10 رجنوری کے مشترکہ بیان پر تھی۔ مگر جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ گورنر جنرل کے اس اعلان سے صوبہ کے مختلف الخیال گروہوں کے درمیان تضاد

کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوگئی۔

اس طرح کی غیر متوقع اور افسوس ناک صورت حال پیدا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ صوبائی مسلم لیگ بلوچستانی عوام کی واحد نمائندہ تنظیم ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اور اس بنا پر اس کا مطالبہ یہ تھا کہ صوبائی کونسل کے سارے ارکان کی نامزدگی اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہونی چاہیے۔ چونکہ قبائلی سردار مسلم لیگ کے اس دعوے و مطالبے کو تسلیم کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے، اس لئے انہوں نے اس کا جواب سبی دربار کے اگلے ہی دن 27 رفروری کو اس صورت میں دیا کہ انہوں نے سبی میں ایک جلسہ کر کے بلوچستان قبائل فیڈریشن کے نام سے اپنی ایک الگ جماعت قائم کر لی۔ اس فیڈریشن کا صدر وہی نواب محمد خان جوگیزئی تھا جس نے 10 رجنوری کو قاضی محمد عیسیٰ کے ساتھ اس مشترکہ بیان پر دستخط کئے تھے جس میں مسلم لیگ کو بلوچستان کی واحد نمائندہ جماعت قرار دیا گیا تھا۔ فیڈریشن کی رکنیت کے دروازے صرف قبائلیوں کے لئے مخصوص تھے اور نصب العین صرف قبائلیوں کی معاشرتی، معاشی اور تعلیمی ترقی بتایا گیا تھا۔ فیڈریشن بلوچستان کے 90 فیصد عوام کی نمائندگی کی دعویدار تھی اور اس بنا پر اس کا مطالبہ تھا کہ ''صوبائی مشاورتی کونسل میں اسے اسی تناسب سے نمائندگی ملنی چاہیے۔''

5 رمارچ کو بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ نے ایک بیان میں بیک وقت افسوس اور مسرت دونوں کا ہی اظہار کیا۔ اسے افسوس اس لئے تھا کہ ''نواب محمد خان جوگیزئی نے، جو کچھ عرصہ قبل مسلم لیگ کو بلوچستانی عوام کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرتا تھا، اب اپنی ایک نئی سیاسی جماعت کھڑی کر لی ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی یہ جماعت بلوچستان کے 90 فیصد عوام کی نمائندہ ہے۔'' اسے خوشی اس لئے تھی کہ ''شاہی جرگہ کے ارکان نے بالآخر ایک سیاسی پارٹی کا کردار اپنا لیا ہے۔ امید ہے کہ اب وہ کبھی بلوچستان کی انتظامیہ کا جزو ہونے کا دعویٰ نہیں کریں گے۔'' قاضی عیسیٰ کا مؤقف یہ تھا کہ بلوچستان میں کوئی قبائلی علاقہ اور قبائلی عوام نہیں ہیں اور حکومت پاکستان اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔ قاضی عیسیٰ کا یہ پہلے رونا اور پھر ہنسنا بالکل بے سود تھا کیونکہ شاہی جرگہ اور بلوچستان مسلم لیگ کے درمیان تنازعہ کی یہ تازہ نمود صوبہ کے نئے ایجنٹ گورنر جنرل صاحبزادہ ایس۔ ایم۔ خورشید کے دماغ سے ہوئی تھی۔ یہ افسر انڈین پولیٹیکل سروس کا رکن تھا اور اس حیثیت سے اس نے اپنے انگریز آقاؤں سے ''پھوٹ ڈالو اور

حکومت کرو'' کی تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔اسے اس بات کا عملی تجربہ بھی تھا کہ کس طرح سرحدی علاقے کے عوام کو مختلف قبیلوں اور گروہوں میں منقسم رکھ کر انہیں سیاسی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے پسماندہ رکھا جا سکتا ہے۔لہٰذا اس افسر کی خواہش و کوشش یہ تھی کہ اس کی مجوزہ مشاورتی کونسل میں صوبے کے شہری علاقوں کے نمائندوں کو غلبہ حاصل نہ ہو کیونکہ یہ لوگ سیاسی اور انتظامی اختیارات کا مطالبہ کریں گے۔وہ چاہتا تھا کہ اگر مشاورتی کونسل ضروری ہی ہے تو ایسے قبائلی سرداروں پر مشتمل ہو جو سرداری نظام، جرگہ سسٹم اور ایجنٹ گورنر جنرل کی فرمانبرداری کی دیرینہ روایت کے علمبردار ہیں۔غالباً اس کی اس خواہش اور کوشش کی تکمیل کے لئے اس کا انگریز پیش رو سی۔اے۔جی۔سیوتیج اس وقت مطلوبہ زمین ہموار کر گیا تھا جبکہ اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کے سرکاری اعلان سے دو دن قبل 19 رجنوری کو سبی میں قبائلی سرداروں سے الوداعی ملاقات کی تھی۔ سیوتیج کو قاضی عیسیٰ اور دوسرے مسلم لیگی لیڈر بہت برے لگتے تھے کیونکہ وہ مسلسل صوبائی انتظامیہ کی مطلق العنانیت پر نکتہ چینی کر کے جمہوری اصلاحات کا مطالبہ کرتے تھے۔وہ قبائلی سرداروں کو بہت اچھا سمجھتا تھا جو اس سے الاؤنس لیتے تھے اور اس کے ہر قول و فعل سے بصد احترام اتفاق کرتے تھے۔صاحبزادہ خورشید نے بھی قبائلی سرداروں کے اس رویے سے فائدہ اٹھایا اور اس کی خواہش کے مطابق فوری طور پر مشاورتی کونسل کی تشکیل نہ ہوئی کیونکہ روزنامہ ''ڈان'' میں 10 رمارچ کو شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق مسلم لیگیوں اور سرداروں کے درمیان کونسل کی نشستوں کی الاٹمنٹ کے سوال پر زبردست رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔

11 رمارچ کو بلوچستان قبائل فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری سردار انور کھیتر ان نے ایک بیان میں قاضی عیسیٰ کے اس مؤقف کو غلط قرار دیا کہ بلوچستان میں کوئی قبائلی علاقہ نہیں ہے۔اس نے کہا کہ اگر بلوچستان میں کوئی قبائلی علاقہ نہیں ہے تو پھر یہ صوبہ اے اور بی علاقوں میں منقسم کیوں ہے اور بی علاقے کے باشندے سول اور فوجی انتظامیہ کی بجائے جرگہ کے ذریعے اپنے رسم اور رواج کے مطابق انصاف کیوں حاصل کرتے ہیں؟ اس نے مزید کہا کہ ''قبائلی عوام پاکستان کے وفادار ہیں اور بلوچستان شاہی جرگہ کے متفقہ فیصلے کی بنا پر ہی پاکستان میں شامل ہوا تھا۔اس میں قاضی عیسیٰ اور اس کے لیگی حامیوں کی کوئی کوشش شامل نہیں تھی۔'' سردار انور کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ بلوچستان میں مشاورتی کونسل کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے اور خاصی دیر تک یہیں

پڑا رہے۔ گویا پاکستان کے قیام کے ڈیڑھ پونے دوسال بعد بھی صوبہ بلوچستان سیاسی اور انتظامی لحاظ سے وہیں کھڑا رہا تھا جہاں کہ وہ برطانوی راج میں تھا۔

شہزادہ کریم کی بغاوت کے الزام میں قید، خان قلات کی موقع پرستی اور ریاستی مسلم لیگ کے جمہوری مطالبات کی حوصلہ شکنی

اگرچہ بلوچستان کی ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق کو ایک سال گزر چکا تھا لیکن وہاں بھی عملاً کوئی سیاسی انتظامی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ خان قلات کا بھائی شہزادہ عبدالکریم اور اس کے 160 ساتھی بغاوت کے الزام کے تحت مچھ جیل میں مقید تھے۔ لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق جب جولائی 1948ء میں پاکستانی فوج نے شہزاد عبدالکریم کو جھلاوان کے علاقے میں گرفتار کیا تھا تو اس کے قبضے سے ایسی دستاویزات برآمد ہوئی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے پاکستان کے خلاف جنگ کی سازش کی تھی۔ اس کی ایک نوٹ بک اس کی ''بلوچ ورکر پارٹی'' کے منشور اور قواعد و ضوابط پر مشتمل تھی۔ اس پارٹی کا نصب العین یہ تھا کہ ''(1) بلوچستان کی ایک عظیم ریاست قائم کی جائے گی جس میں قلات، لس بیلہ، خاران، مکران، برطانوی بلوچستان، صوبہ سندھ اور مغربی پنجاب و ایران کے بعض علاقے شامل ہوں گے۔ (2) صرف بلوچیوں کو اس ریاست کا شہری تسلیم کیا جائے گا اور باقی نسلوں کے لوگوں سے بین الاقوامی قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔'' شہزادہ کے پاس افغانستان کے ''باب علی'' سے جاری کردہ ایک فتویٰ بھی تھا جس میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پرنس غازی عبدالکریم کی زیر قیادت پاکستان کی کافر حکومت کے خلاف جہاد کریں۔ اس میں مزید کہا گیا تھا کہ ''جو سرکاری ملازمین اور فوجی افغانستان میں عبدالکریم کے ہیڈ کوارٹر میں نہیں پہنچ سکتے انہیں اپنے کام میں تساہل برتنا چاہیے اور اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جبکہ پرنس انہیں نجات دلانے کے لئے ہر چیز کو روندتا ہوا ان کے پاس پہنچ جائے گا۔''[16] اس الزام میں کس حد تک سچائی تھی اور کس حد تک جھوٹ کی ملاوٹ تھی، اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ البتہ یہ حقیقت پاکستان کے سارے سیاسی حلقوں کو معلوم تھی کہ شہزادہ عبدالکریم نے جو کچھ بھی کیا تھا اس میں اسے اپنے بڑے بھائی خان آف قلات کی حمایت و اعانت حاصل تھی۔ لیکن یہ خان قلات اس حقیقت

کے باوجود مارچ 1949ء میں بھی اپنی استبدادی گدی پر براجمان تھااور وہ ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اصلاحات کے خلاف تھااور اپنی اس عوام دشمنی پر بڑے زور شور سے اسلام کا خوشنما پردہ ڈالتا تھا۔ مارچ 1949ء کے اوائل میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کی تو خان قلات نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ اس نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ دنیا کے اس خطۂ زمین پر اللہ کی حکومت قائم کی جائے اور یہاں سب کو رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر اپنے حقوق مل سکیں اور غیر مسلموں سے بھی فیاضانہ سلوک ہو سکے۔ میں اپنے بھائیوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور یہ باور کرتا ہوں کہ وزیر اعظم کے اس اقدام سے اس کی بے مثال حسن کارکردگی، دور اندیشی اور مذہب سے محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ ہمیں وزیر اعظم کا شکر گزار ہونا چاہیے اور دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کی خدمت کے لئے اس کی عمر دراز کرے۔ میں مولانا شبیر احمد عثمانی کو بھی مبارک باد دیتا ہوں جس نے جرأت اور اخلاص کے ساتھ اس سمت میں کوشش کی اور امید کرتا ہوں کہ دستور ساز اسمبلی یہ قرارداد منظور کر دے گی۔"[17] خان قلات کا یہ بیان اس کی ریاکاری، مکاری، عیاری اور منافقت کی کلاسیکل مثال تھی۔ اسے یہ بیان جاری کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی اور اسے خوشامدانہ بیان اور اپنے 15 راگست 1947ء کے اعلان آزادی میں کوئی تضاد بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اسے اپنی ''اسلام پسندی'' اور بلوچ شاونزم میں بھی کوئی تضاد دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے اس بیان میں اسلام کو رنگ و نسل سے بالاتر قرار دیا تھا جبکہ ماضی میں اس نے محض نسلی بنیاد پر اپنی ایک عظیم بلوچ سلطنت قائم کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔

خان قلات کے اس منافقانہ بیان کے اندر پوشیدہ ایک وجہ تو یہ تھی کہ مارچ 1949ء میں ساری دنیا کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستان سیاسی، انتظامی اور معاشی لحاظ سے استحکام کی راہ پر گامزن ہے اور اب چونکہ اس نے اپنی بے پناہ ابتدائی مشکلات پر بہت حد تک عبور حاصل کر لیا ہے، اس لئے اب اس کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج نے پاکستان کے روبہ استحکام ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس ملک کو مشرق وسطیٰ میں اپنی سامراجی بالادستی قائم کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا یہ شیطانی مقصد مسلم ممالک کے بادشاہوں اور دوسرے سامراج نواز حکمرانوں کی اسلام فروشی اور عالم اسلام کے

اتحاد کی تجویز کی تائید وحمایت سے پورا ہوسکتا ہے۔اس کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے نام پر ان ممالک میں قرون وسطیٰ کے استبدادی جاگیرداری نظام کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور اس طرح سوویت یونین کے اشتراکی نظریے کا سد باب بھی ہوسکتا ہے۔وزیراعظم لیاقت علی خان نے برطانوی سامراج کے اسی نقطۂ نظر کے پیش نظر بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی 11 راگست 1947ء کی تقریر کے برعکس مذہب کو اپنی جاگیردارانہ سیاست میں ملوث کیا تھا اور مُلاؤں سے گٹھ جوڑ کر کے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کی تھی۔اس کی اس قرارداد میں اس کی یہ غلط فہمی بھی چھپی ہوئی تھی کہ اس طرح وہ ملک کے مختلف صوبوں میں سیاسی،معاشرتی اور معاشی خود مختاری کی تحریکوں کو کچل کر اپنے آمرانہ اقتدار کو مستحکم سے مستحکم تر کر سکے گا جبکہ خان قلات اسلام کے نام پر ریاست قلات کے تقریباً چار لاکھ غریب ومظلوم عوام کو اپنے جاگیردارانہ شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا۔اس نے ماضی میں تو اپنے اس ناپاک مقصد کے لئے برطانوی سامراج کے بعض عناصر کی حمایت سے بلوچ شاونزم کا سہارا لیا تھا لیکن اب وہ یہی مقصد مذہب کا دلکش پرچم بلند کر کے اور وزیراعظم پاکستان کی خوشامد و چاپلوسی کے ذریعے پورا کرنا چاہتا تھا۔اس کا ایک آزاد وخودمختار عظیم بلوچ سلطنت کا شہنشاہی خواب تو جولائی 1948ء میں قطعی طور پریشان ہو چکا تھا۔تاہم اب وہ پاکستان کے اسلام فروش وزیراعظم کی حمایت سے محض اپنے علاقے کے غریب عوام کے جاگیردارانہ استحصال کے لئے مکمل آزادی وخودمختاری کا متمنی تھا۔

تاہم 15 رمارچ کو کراچی میں منظر عالم کی زیرصدارت ریاستی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو اس میں دوسرے امور کے علاوہ اس تجویز پر بھی غور کیا گیا کہ ریاست قلات میں بلاتاخیر جمہوری اصلاحات نافذ ہونی چاہئیں۔قبل ازیں قلات مسلم لیگ کا ایک سات رکنی وفد نوابزادہ عبدالقادر کی زیرقیادت اس سلسلے میں ریاستی مسلم لیگ کے صدر منظر عالم اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے ملاقات کر چکا تھا۔اس وفد کی رائے یہ تھی کہ قلات کے عوام کی امنگیں صرف وہاں ایک نمائندہ حکومت کے قیام سے ہی پوری ہوسکتی ہیں۔لیکن نوبزادہ لیاقت علی خان کے سیاسی نقارخانے میں ان طوطیوں کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔وہاں تو خان قلات کو اس کی خوشامد کا صلہ دینے کا پروگرام بنایا جارہا تھا۔اس پروگرام کے مطابق 20 رمارچ کو ''خان معظم'' نے کوئٹہ میں ایجنٹ گورنر جنرل صاحبزادہ خورشید سے ملاقات کی جس کے بعد یہ خبر جاری ہوئی کہ ''خان

قلات پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے ساتھ لیک سکسیس (Lake Success) جائے گا جہاں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرے گا۔اس کی کراچی سے روانگی 26 رمارچ کو ہوگی اور واپسی پر وہ مسلم ممالک کا دورہ کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔'' بظاہر یہ بات محض اتفاقی نہیں تھی کہ صاحبزادہ خورشید سے اس کی ملاقات کے فوراً بعد قبائل فیڈریشن کے پروپیگنڈا اسیکرٹری سردار غلام محمد نے ایک بیان میں حکومت پاکستان کو متنبہ کیا تھا کہ ''اگر بلوچستان کے مجوزہ نظام حکومت میں مسلم لیگ کو ترجیح دی گئی تو پاکستان کا مفاد خطرے میں پڑ جائے گا...... اگر حکومت کو اس بات پر شبہ ہے کہ قبائل فیڈریشن 95 فیصد باشندوں کی نمائندہ جماعت ہے تو حکومت اس کے ثبوت کے لئے استصواب کروالے...... بے شک بلوچستان قبائل فیدریشن مسلم لیگ کی نااہلی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔''[18] صاحبزادہ خورشید اور خان قلات دونوں ہی ''پھوٹ ڈالواور حکومت کرو'' کے فن کے ماہر تھے۔لہٰذا ان کی ملاقات کے نتیجے میں مسلم لیگیوں اور قبائلی سرداروں کے درمیان تضاد کی شدت میں اضافہ ہونا ناگزیر تھا اور قبائل فیڈریشن کے پروپیگنڈا اسیکرٹری کا یہ بیان اسی شدت کا آئینہ دار تھا۔

اصلاحات کی خاطر صوبہ لیگ اور قبائلی جرگہ کی طرف سے مرکزی حکومت کی خوشامد جبکہ پاکستان علاقائی سامراجی مفادات میں کلیدی اہمیت اختیار کر گیا تھا

23 رمارچ کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ تقریباً دو ہفتے بعد جب مشاورتی کونسل قائم ہوگی تو مسلم لیگ ''یوم بلوچستان'' منائے گی۔اس فیصلے سے قاضی عیسیٰ وغیرہ کو یہ عندیہ مل گیا تھا کہ مشاورتی کونسل میں مسلم لیگ کو غلبہ حاصل ہوگا۔بظاہر اسے اس سلسلے میں پنجابی شونسٹوں اور ''تلیر اسلام پسندوں'' کی حمایت کی قوی امید تھی اور غالباً اس لئے اس نے صوبائی کونسل کے اس اجلاس میں بیگم شاہنواز کی تجویز کردہ ون یونٹ سکیم کی تائید میں ایک قرارداد منظور کروائی تھی۔اس وقت تک پنجابی عناصر نے بلوچستان کی تجارت پر بہت حد تک غلبہ حاصل کر لیا تھا اور صوبائی سرکاری محکموں پر بھی پنجابی اور تلیر بیوروکریسی کا تسلط تھا۔قاضی عیسیٰ نے کونسل کے اس اجلاس کے بعد ایک بیان میں اپنے اس مؤقف کو دہرایا کہ ''بلوچستان میں کوئی قبائلی علاقہ نہیں ہے۔انگریزوں نے اپنے زیر تحویل علاقوں کو محض انتظامی مصلحت کی بنا پر دو

حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔قبائلی فیڈریشن کسی کی نمائندگی نہیں کرتی۔ جہاں تک استصواب کی تجویز کا تعلق ہے، اس پر عمل درآمد کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ آئندہ لوکل باڈیز کے انتخابات میں فیصلہ ہوجائے گا کہ کون کس کی نمائندگی کرتا ہے۔''[19]

قاضی عیسیٰ نے یکم اپریل کراچی میں ایک اور بیان میں پاکستان کے خلاف افغانستان کے معاندانہ پراپیگنڈے کی مذمت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اسلام کے دشمن ان دونوں مملکتوں کے درمیان تعلقات کی کشیدگی میں اضافہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں تاکہ ایک بحران پیدا کیا جائے جواسلام کی تاریخ میں نہایت افسوس ناک واقعہ ہوگا۔ 2/اپریل کولورالائی سے جاری کردہ ایک بیان میں قبائل فیڈریشن کے صدرنواب محمد خان جوگیزئی اور جنرل سیکرٹری سردار انور جان کھیتران نے بھی کابل ریڈیواوروہاں کے اخبارات کے پاکستان کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈے کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی پٹھان بذریعہ ریفرنڈم اس مملکت کے ساتھ اپنی تقدیر وابستہ کرچکے ہیں۔اس لئے افغانستان کوان کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

ان بیانات کا پس منظر یہ تھا کہ مارچ کے اوائل میں پاکستان کی ہوائی فوج نے وزیرستان میں فقیرایپی کی زیر قیادت پانچ سوقبائلیوں کی باغیانہ سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے بمباری کی تھی اوراس کے بعد افغانستان اور پاکستان کے درمیان ریڈیو اور اخبارات کی زبردست جنگ شروع ہوگئی تھی۔اس واقعہ کے بعد برطانیہ کے محکمہ خارجہ کا انڈرسیکرٹری گارڈن واکر(Gordon Walker) اورسابق وزیرخارجہ سرانتھونی ایڈن(Anthony Eden) پاکستان آئے تھے۔اول الذکرنے کراچی کے ارباب اقتدار کے ساتھ علاقائی صورت حال پرتبادلۂ خیالات کیا تھااورمؤخرالذکر پاکستان میں اپنے چندروزہ قیام کے دوران درہ خیبر بھی گیا تھا۔اس پر ماسکو کے ہفت روزہ ''نیوٹائمز'' کا انکشاف یہ تھا کہ برطانیہ نے پاکستان میں افغانستان کی سرحد کے نزدیک ایک فوجی اڈہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا ہےاوراس پرکراچی کے''ذمہ دارحلقوں'' کا بیان یہ تھا کہ''نیوٹائمز'' کا یہ بیان''سراسر بے ہودہ ہے۔'' پاکستان نے اس سلسلے میں حکومت برطانیہ کوکوئی سہولت دینے کی پیش کش نہیں کی ہے۔لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ نیوٹائمز کا انکشاف صحیح تھااور کراچی کے''ذمہ دارحلقوں'' کا بیان سراسر بے ہودہ تھا۔

ان دنوں اگرچہ بظاہر برطانوی سامراج نے ایران اورعراق پراپنی بالادستی قائم کرلی

تھی لیکن ان دونوں ممالک کے عوام میں سامراج دشمنی کی تحریک روز بروز زور پکڑ رہی تھی۔ فروری 1949ء میں ایران کے بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور اس کے بعد بائیں بازو کی تودہ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ آذربائیجان میں پھر مسلح جدوجہد شروع ہوگئی تھی اور سوویت یونین کی سرزمین سے ایک خفیہ ریڈیو اس ''جدوجہد آزادی'' کی پرزور حمایت کر رہا تھا۔ قدرتی طور پر اس صورت حال سے اینگلو۔ امریکی بلاک کو پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے 1949ء کے اوائل میں اس علاقے کی سلامتی کے لئے مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) کا منصوبہ بنایا تھا۔ 23 ر مارچ کو واشنگٹن میں امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچی سن (Dean Atchison) کا اعلان یہ تھا کہ امریکہ کو یونان، ترکی اور ایران کی سلامتی اور آزادی میں ''گہری دلچسپی'' ہے اور اس کی اس ''گہری دلچسپی'' نے صدر ٹرومین اور ونسٹن چرچل کی شروع کردہ عالمی سرد جنگ کو پاکستان کی سرحدوں تک پہنچا دیا تھا جہاں ایسے سامراجی پٹھوؤں کی کمی نہیں تھیں جنہیں جنوب کے بجائے شمال سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کی بنیاد اسی خطرے پر تھی۔ بلوچستان میں سیاسی و انتظامی حالات کو جوں کا توں رکھنے کی وجہ بھی اسی ''خطرے'' میں مضمر تھی اور 21 ر مارچ کو حکومت پاکستان نے مکران اور لس بیلہ کی بندرگاہوں کو براہ راست اپنی تحویل میں لینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا ایک محرک یہی ''خطرہ'' تھا۔ کہا جاتا تھا کہ روس کی نگاہیں انیسویں صدی سے گرم پانی کی بندرگاہوں پر لگی ہوئی ہیں اور افغانستان بھی ان بندرگاہوں تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کا متمنی ہے۔

باب: 9

بلوچستان میں لیاقت علی خان کی غیر جمہوری پالیسی۔ 1

ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کی تشکیل......قبائلی جرگہ کا کم نمائندگی ملنے پر عدم اطمینان

6 /اپریل 1949ء کو بلوچستان کا ایجنٹ گورنر جنرل لیفٹیننٹ کرنل صاحبزادہ ایس۔ایم۔خورشید کراچی گیا اور وہاں اس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے صوبائی مشاورتی کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں طویل تبادلہ خیالات کیا۔ 18/اپریل کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن گیا تو اس کے تین چار دن بعد 22/اپریل کو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے بلوچستان کی مشاورتی کونسل کے پندرہ ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ نام یہ تھے۔ قاضی محمد عیسیٰ، نور محمد خان، فدا علی، نواب محمد خان جوگیزئی، سردار محمد اکبر خان سنجرانی، ملک داد خان منڈوخیل، ملک شاہ جہاں، سیٹھ محمد اعظم، جناب گلستان خان شیرانی، سردار باز محمد خان جوگیزئی، اسماعیل خان کھوسہ، میر قادر بخش، ملک جان محمد خان کانسی اور ایف۔بی پٹیل۔ بلوچستان مسلم لیگ نے اس اعلان پر مسرت کا اظہار کیا کیونکہ ان پندرہ ارکان میں سے 9 مسلم لیگی تھے۔ قبائل فیڈریشن نے اس پر مایوسی کا اظہار کیا کیونکہ اس میں شاہی جرگہ کے صرف پانچ ارکان شامل تھے۔ 24/اپریل کو نواب محمد خان جوگیزئی کا بیان یہ تھا کہ ''قبائلی سردار مشاورتی کونسل کی ہیئت ترکیبی سے بہت غیر مطمئن ہیں۔ میں عنقریب قبائل فیڈریشن کی ایک میٹنگ بلاؤں گا جس میں مناسب غور وخوض کے بعد آئندہ پالیسی کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

بلوچستان مسلم لیگ کا صدر گورنر جنرل کے اس اعلان کے بعد کراچی سے لاہور آیا۔ یہاں اس نے یکم مئی کو گورنر موڈی (Mudie) کے خلاف پنجابی شونسٹوں کی جاری کردہ پروپیگنڈا

مہم ☆ کی تائید کی اور جب وہ لاہور سے کوئٹہ پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا حالانکہ اس کے کوئٹہ پہنچنے سے دو تین دن پہلے 6 رمئی کو مشاورتی کونسل کے ناموں کا اعلان مسلم لیگیوں اور قبائلی سرداروں کے درمیان تضاد کے گہرے گڑھے میں کیا گیا تھا۔ اس دن کی اخباری رپورٹ یہ تھی کہ ''کوئٹہ میں قبائلی فیڈریشن کا جلسہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ بلوچستان کے لئے پاکستان کے مقرر کردہ مشاورتی بورڈ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ قرآن مجید پر حلف اٹھائے گئے کہ بلوچستان کے لئے کوئی ایسا قانون ساز ادارہ یا کونسل منظور نہ کیا جائے جس کی بنیاد بالغوں کے حق رائے دہندگی پر نہ ہو۔ اس جلسہ میں شاہی جرگہ کے ارکان بھاری تعداد میں شریک ہوئے۔ مشاورتی کونسل میں نامزد تینوں سردار جن میں نواب جوگیزئی بھی شامل ہیں، جلسہ میں موجود تھے۔ ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی کہ ''پاکستان ایک آزاد اسلامی جمہوریہ ہے اور اس میں کوئی غیر جمہوری فیصلہ کسی شخص یا ادارہ پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ بلوچستان قبائل فیڈریشن مشاورتی بورڈ کی ہیئت تشکیل کو جمہوری اصولوں کے مطابق نہیں سمجھتی اس لئے وہ اسے افسوس کے ساتھ مسترد کر دیتی ہے۔ اگر حکومت، بلوچستان کی قبائل فیڈریشن کو بلوچستان کی 95 فیصد آبادی کا نمائندہ نہیں سمجھتی تو صوبے کے لوگوں سے بالغوں کے حق رائے دہندگی کے اصول پر انتخاب کرالیا جائے۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ صوبہ اور حکومت کے درمیان اختلافات زیادہ ہو گئے ہیں۔ فیڈریشن ملک سے وفاداری کا عہد کرتی ہے اور حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ کوئی فیصلہ کرتے وقت جمہوریت کے اصول کا خیال رکھا جائے۔''[1] 6 رمئی کو کوئٹہ میں مرکزی وزیر زراعت پیرزادہ عبدالستار کے اعزاز میں چائے کی دعوت ہوئی تو قبائلی سرداروں نے بطور احتجاج اس میں شرکت نہ کی اور اس سے اگلے دن انہوں نے وزیر زراعت سے ملاقات کر کے اسے بتایا کہ جب تک ان کی شکایات کا ازالہ نہیں ہوتا وہ اس قسم کی سرکاری تقریبات میں شرکت نہیں کریں گے۔

قبائلی سرداروں اور مسلم لیگیوں کے درمیان اقتدار کی اس رسہ کشی کے باعث مشاورتی کونسل کے قیام کا معاملہ تقریباً ایک ماہ تک معرض التوا میں پڑا رہا۔ سرداروں کے لیڈر نواب محمد خان جوگیزئی کو شکایت یہ تھی کہ کونسل میں صرف پانچ سرداروں کو شامل کیا گیا ہے اور ان پانچ میں سے بھی صرف تین اس کی قبائل فیڈریشن سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ یہ فیڈریشن غیر ریاستی

☆ اس مہم کی تفصیل کے لیے دیکھئے پاکستان کی سیاسی تاریخ' جلد چہارم' جناح۔ لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد

بلوچستان کے 95 فیصد لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر اس کے اور اس کے حامیوں کے پے در پے شکایتی بیانات کا کوئی اثر نہ ہوا اور 11 رجون کو قاضی محمد عیسیٰ اور سردار نور محمد گولا نے کوئٹہ میں ایجنٹ گورنر جنرل کے مشیروں کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھالیا۔ اس تقریب میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے شرکت کی مگر قبائل فیڈریشن کا کوئی نمائندہ اس موقع پر موجود نہیں تھا۔ سردار نور محمد گولا قبائل فیڈریشن سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ اس عہدے کی خاطر اس جماعت سے قطع تعلق کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تھا۔ 15 رجون کو کونسل ے مزید دس نامزد ارکان نے حلف وفاداری اٹھایا۔ 16 رجون کو ایک اور نامزد رکن ملک جان محمد نے حلف اٹھالیا۔ 18 رجون کو نواب جوگیزئی کے آخری ساتھی سردار محمد اکبر خان سنجرانی نے بھی مشیر اعلیٰ قاضی عیسیٰ سے ملاقات کرنے کے بعد مشاورتی کونسل اور مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کی طرف ایک نہایت معمولی سی پیش قدمی ہوئی۔

اس کونسل کے ارکان کی حیثیت محض مشیروں کی تھی اور ایجنٹ گورنر جنرل ان کے مشوروں پر عمل کرنے کا پابند نہیں تھا۔ لیکن نواب جوگیزئی اس صورت حال سے پریشان تھا کیونکہ یہ مشیر اپنی کاروں پر جھنڈے لگائے پھرتے تھے اور قاضی عیسیٰ نے 14 رجون کو پریس کانفرنس میں یہ تاثر دیا تھا کہ اب بلوچستان کا نظم ونسق کونسل کے حکم کے مطابق چلے گا۔ اس کا اعلان یہ تھا کہ ''صوبہ کے بعض علاقوں میں جو غیر اسلامی اور وحشیانہ رسوم رائج ہیں انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ اب عورتوں کی خرید وفروخت اور نیلامی ممنوع ہو جائے گی۔'' قبائل فیڈریشن اس قسم کے اعلانات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان کا اصرار تھا کہ ''قائداعظم کے 14 راگست 1947ء اور 14 رفروری 1948ء کے وعدوں کے مطابق سرداری نظام اور جرگہ سسٹم بہر قیمت برقرار رہنے چاہئیں اور قبائلیوں کے رسوم ورواج میں کوئی دخل اندازی نہیں ہونی چاہیے۔'' چنانچہ 20 رجون کو فیڈریشن نے مشاورتی کونسل کے قیام کے خلاف کوئٹہ میں احتجاجی مظاہرہ کیا اور 21 رجون کو نواب محمد خان جوگیزئی نے ایک جلسۂ عام میں مطالبہ کیا کہ ''اس غیر جمہوری مشاورتی کونسل کو برطرف کر کے بالغوں کے حق رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر نئی جمہوری کونسل کی تشکیل کی جائے۔''

نواب محمد خان کا یہ احتجاج اس حد تک مؤثر ثابت ہوا کہ 24 رجون کو اس کی فیڈریشن کو یہ خط موصول ہوا کہ مشاورتی کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں پیدا شدہ تنازعہ کے بارے میں

بات چیت کے لئے نمائندے کراچی بھیجے جائیں اوراس کے ساتھ ہی ایجنٹ گورنر جنرل صاحبزادہ خورشید کو بھی کراچی بلایا گیا۔ صاحبزادہ یکم جولائی کو کراچی پہنچا۔ اس نے 2 رجولائی کو وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے مسلم لیگ اور قبائل فیڈریشن کے درمیان مشاورتی کونسل کی تشکیل کے بارے میں پیدا شدہ تنازعے کے بارے میں گفتگو کی۔ 3 رجولائی کو کوئٹہ میں قبائل فیڈریشن کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ نواب محمد خان جوگیزئی کی سربراہی میں ایک آٹھ رکنی وفد کراچی بھیجا جائے گا۔ مجلس عاملہ کے اس اجلاس کے بعد فیڈریشن کے نائب صدر نواب محمد اکبر خان بگٹی نے اخبار نویسوں سے انٹرویو میں کہا کہ ''بلوچستان کونسل میں غلط آدمیوں کو بہت سے اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ اس کونسل کو برطرف کر کے انتخابات کے ذریعے نئی کونسل کی تشکیل ہونی چاہیے۔'' 5 رجولائی کو قاضی عیسیٰ نے کراچی میں ایک بیان کے ذریعے قبائل فیڈریشن کے اس پروپیگنڈے کو بے بنیاد قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ بیشتر قبائلی سردار مسلم لیگ میں شامل ہو چکے ہیں۔

تاہم 7 رجولائی کو یہ بیان بازی چند دنوں کے لئے ختم ہوگئی جبکہ حکومت پاکستان کی جانب سے غیر متوقع طور یہ اعلان جاری ہوا کہ انڈین پولیٹیکل سروس کے افسر لیفٹینینٹ کرنل صاحبزادہ ایس۔ ایم۔ خورشید کو صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کیا گیا ہے اوراس کی جگہ انڈین سول سروس کے ایک پنجابی افسر میاں امین الدین کا بطور ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان تقرر کیا گیا ہے۔ گزشتہ دو سال میں بلوچستان کی انتظامیہ کا یہ چوتھا سربراہ تھا۔ تاہم قاضی عیسیٰ کو اس افسرانہ تبدیلی پر خوشی ہوئی اوراس نے اسی دن ایک بیان میں میاں امین الدین کے تقرر کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اس کے اس بیان کا محرک اس کا یہ تاثر تھا کہ چونکہ قبائل فیڈریشن بلوچستان میں ملکی اور غیر ملکی کا سوال اٹھاتی ہے اس لئے یہ پنجابی افسر فیڈریشن کے مقابلے میں مسلم لیگ کی حمایت کرے گا۔ اس وقت تک بلوچستان کے شہروں میں تقریباً 20 ہزار پنجابی مہاجر آباد ہو چکے تھے اور انکے مفادات کو ملکی اور غیر ملکی کے سوال سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ روزنامہ ڈان کی 29 رجون کی ایک رپورٹ کے مطابق ''بلوچستان مسلم لیگ نے قبائل فیڈریشن کے برعکس کبھی بھی ایسی قرارداد منظور نہیں کی تھی کہ صوبہ میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مقامی لوگوں کا تقرر کیا جائے۔ مسلم لیگ کو ابھی بھی ایک ایسی جماعت تصور کیا جاتا ہے جو ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں اٹھاتی۔'' میاں امین الدین

13 رجولائی کو اپنے نئے عہدے کا چارج لینے کے لئے بڑی شان و شوکت کے ساتھ کوئٹہ پہنچا۔ ہوائی اڈے پر مشاورتی کونسل کے ارکان، شاہی جرگہ کے ارکان، ایرانی قونصل اور اعلیٰ سول وفوجی حکام نے اس کا خیر مقدم کیا۔ پنجاب رجمنٹ کے ایک دستے نے اسے گارڈ آف آنر پیش کیا اور اسے 13 توپوں کی سلامی دی گئی۔

خان قلات کا لیاقت علی خان کے ساتھ جاگیردارانہ گٹھ جوڑ

امین الدین کے کوئٹہ میں بطور ایجنٹ گورنر جنرل براجمان ہونے سے ایک دن پہلے 12 رجولائی کو خان میر احمد یار خان آف قلات حکومت پاکستان کے خرچ پر تقریباً ساڑھے چار ماہ تک امریکہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ کا دورہ کرنے کے بعد واپس پہنچ گیا تھا اور کراچی کے ہوائی اڈے پر پاکستان کے محکمہ خارجہ اور محکمہ ریاستی امور کے بعض افسروں کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگوں نے اس کا شاندار خیر مقدم کرتے ہوئے زندہ باد کے نعرے لگائے تھے اور اسے ہار پہنائے تھے۔ اس موقع پر جب اخبار نویسوں نے اس سے پوچھا کہ آیا اس نے ریاست قلات کی ترقی کے بارے میں کوئی سکیم سوچی ہے تو اس کا جواب یہ تھا کہ 'میں نے کبھی بھی قلات کی حد تک نہیں سوچا۔ میری سوچ پورے پاکستان کا احاطہ کرتی ہے۔ ریاست قلات محض ایک بچہ ہے اور ہماری عظیم مملکت پاکستان کا ایک جزو ہے۔'' اس نے بلوچوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہیں۔[2] اس کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ چار ساڑھے چار ماہ تک غیر ممالک کے دورے سے اس کی منافقت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ جو شخص ماضی میں صرف قلات اور بلوچوں کی ہی باتیں کرتا تھا اور جو اعلانیہ پورے بلوچستان اور ایران، صوبہ سندھ اور صوبہ مغربی پنجاب کے بعض علاقوں پر مشتمل ایک عظیم بلوچی سلطنت کا خواب دیکھتا تھا وہ اب قلات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا تھا اور مملکت پاکستان کا فدائی بن گیا تھا۔

بظاہر خان قلات کی اس قلابازی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے تفریحی سفر کے دوران مئی کے اوائل میں نیویارک ٹائمز میں یہ خبر پڑھ لی تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جانب سے ریاست قلات میں نمائندہ اداروں کے قیام پر زور نہ دینے کے فیصلے کی بنیاد اس پالیسی پر تھی کہ

''ہندوستان کے برعکس پاکستان میں بعض ریاستی مطلق العنان حکمرانوں کو طاقتور ہی رہنے دیا جائے۔ بالخصوص سرحدوں کے نزدیک حکومت کی روش بڑی نرم ہے کیونکہ اگران علاقوں کے ریاستی حکمرانوں کی آہنی گرفت کو ڈھیلا کر دیا گیا تو چھوٹے بڑے قبیلے سالہا سال تک پرامن رہنے کے بعد اب ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگیں گے۔ پاکستان کی پالیسی کا لاثانی پہلو یہ ہے کہ ریاستوں کا پاکستان کے دوسرے علاقوں کے ساتھ ادغام ان کی ترقی کے مختلف مراحل کو پیش نظر رکھ کرآہستہ آہستہ ہورہاہے۔انہیں ہڑپ نہیں کیا جارہاہے۔''[3] قدرتی طور پر وہ لیاقت علی خان کی اس پالیسی سے بہت خوش تھا کیونکہ اس میں ریاست قلات کے تقریباً چارلاکھ غریب عوام پراس کی جاگیردارانہ آہنی گرفت برقرار رکھے جانے کی ضمانت موجود تھی۔ وہ اپنے اس تفریحی سفر کے دوران واشنگٹن، بوسٹن، لاس اینجلز، گرینڈ کینین، سان فرانسسکو، سالٹ لیک سٹی، شکاگو، لندن، پیرس، زیورچ، روم، ایتھنز، استنبول اور بغداد گیا تھا۔لندن میں قیام کے دوران اس نے ایرانی سفارت خانے سے ویزا حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ایرانی سفیر نے جواب دے دیا۔اس کا کہنا تھا کہ ''اگرآپ صرف تہران جاتے ہیں تو بسر وچشم وہاں آپ شہنشاہ کے مہمان ہوں گے۔مگر مشہد سے زاہدان تک ایرانی گورنمنٹ آپ کوسفر کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ یہ بلوچوں کا علاقہ ہے۔'' وہ ایرانی سفیر کے اس جواب سے مایوس ہوااوراس نے ایران جانے کاارادہ ترک کردیا۔وہ اس عہد کے جدید افغانستان کو دیکھنے کا بھی خواہش مند تھا۔افغانستان کا وزیراعظم شاہ محمود خان اس کا گہرا دوست تھا اور اس بنا پر محمود خان نے اسے بار ہاافغانستان کے دورے کی دعوت دی تھی مگر حکومت پاکستان نے اس کا افغانستان جانا پسند نہ کیا۔ یہاں تک کہ اسے پشاورتک جانے کی بھی اجازت نہ دی کیونکہ ان دنوں پاکستان اورافغانستان کے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔[4]

خان قلات کی اپنی ریاست سے غیر حاضری میں ریاستی مسلم لیگ کی جانب سے کئی بار یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ریاست قلات اور پاکستان کی دوسری ریاستوں میں مطلق العنانیت ختم کر کے وہاں جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔اس سلسلے میں ریاستی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد 3/اپریل کو منظور کی تھی جس میں اس امر پر حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ایک ذمہ دار ترجمان نے پاکستانی ریاستوں میں آئینی اصلاحات کے بارے میں رجعت پسندانہ نظریات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک دستور ساز اسمبلی پورے پاکستان کے لئے نیا آئین مرتب

نہیں کر لیتی اس وقت تک ریاستوں میں مکمل طور پر ذمہ دار حکومتیں قائم نہیں ہوسکتیں۔ مجلس عاملہ کی رائے یہ تھی کہ "قلات اور دیگر بلوچستانی ریاستوں کے عوام اپنے دوسرے بلوچستانی بھائیوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی پسماندگی کا عذر بے بنیاد ہے اور اس کا مقصد مفاد پرست عناصر کی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔"[5] لیکن اس قرارداد کا جواب یہ ملا کہ اسی دن پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے چودھری خلیق الزماں کی زیر قیادت ریاستی مسلم لیگ کے وجود کو ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فیصلہ کیا کہ جن ریاستوں کا پاکستان سے الحاق ہو چکا ہے ان میں ریاستی مسلم لیگ کی کوئی شاخیں شامل نہیں ہوں گی بلکہ ان میں اسی پاکستان مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں گی جس کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس تھا۔ 7/اپریل کو ریاستی مسلم لیگ کے صدر منظر عالم نے پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسے غیر آئینی قرار دیا مگر اس کے اس بیان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ 9/اپریل کو بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ نے ایک بیان میں کہا کہ "پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا فیصلہ بالکل درست ہے کیونکہ قیام پاکستان کے بعد کسی الگ ریاستی مسلم لیگ کی ضرورت نہیں ہے۔"

دونوں مسلم لیگوں کے لیڈروں کے درمیان یہ بیاناتی جنگ ایک ڈیڑھ ماہ تک جاری رہی جس کے دوران 18/مئی کو یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت پاکستان نے یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ بلوچستان کی چار ریاستوں سے ایک نمائندہ کو پاکستان دستور ساز اسمبلی میں شامل کیا جائے گا۔ بلوچستان کے ایجنٹ گورنر جنرل نے اس سلسلے میں خاران، مکران اور لس بیلہ کے حکمرانوں اور قلات کے وزیر اعظم سے ملاقات کی ہے اور ان چاروں نے اے۔ جی۔ جی کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ جسے چاہے چاروں ریاستوں کا نمائندہ منتخب کر لے۔ 19/مئی کو ریاستی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری محمد محمود نے کوئٹہ میں منظور کردہ اس تجویز کی خبر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور وزیر اعظم لیاقت علی خان سے اپیل کی کہ وہ ریاستی عوام کو بھی ویسے ہی جمہوری حقوق دیں جیسے کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کے عوام کو حاصل ہیں۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ "دستور ساز اسمبلی کے لئے بلوچستان سے نمائندہ کے انتخاب کا حق صرف ریاستی مسلم لیگ کو ملنا چاہیے۔"

چونکہ منظر عالم اور محمد محمود وغیرہ مظلوم ریاستی عوام کے حقوق کے بارے میں مخلص نہیں تھے اور وہ ریاستی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے محض اپنی لیڈری کی دکان چمکانا چاہتے تھے اس

لئے مزید ڈیڑھ دو ماہ تک پاکستان کے ایوان اقتدار میں انہیں اپنا کوئی سیاسی گاہک نہ ملا تو 2رجولائی کو انہوں نے اپنی ریاستی مسلم لیگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا اور ریاستی عوام کو یہ مشورہ دیا کہ ''وہ جس سیاسی جماعت کو اپنے لئے صحیح سمجھیں اس میں شامل ہو جائیں۔'' گویا اس طرح خان قلات کی 12رجولائی کو عالمی سیر وتفریح سے ہفتہ عشرہ پہلے ہی اس کے اپنے علاقے میں مطلق العنانیت برقرار رکھنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ چنانچہ 13رجولائی کو چھ ممتاز بلوچ لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا کہ ''قائداعظم مرحوم کے بیان کے مطابق چھوٹی ریاستوں کو بڑی ریاستوں میں مدغم کرایا جائے۔ اس سلسلے میں ابتدا خاران، مکران اور لس بیلہ کے قلات کے ساتھ ادغام سے ہونی چاہیے۔ جن بلوچ لیڈروں نے اس بیان پر دستخط کئے تھے ان میں بلوچستان مسلم لیگ کا نائب صدر میر قادر بخش خان بھی شامل تھا۔ جس دن کراچی میں یہ بیان جاری ہوا تھا، اسی دن بلوچستان کے نئے ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین نے کوئٹہ میں اپنے عہدے کا چارج سنبھالا تھا۔

خان قلات کی امریکی آئل کمپنی کے ساتھ تیل کی تلاش پر براہ راست بات چیت اور حکومت پاکستان کی برہمی

19رجولائی کو خان قلات نے اپنے دارالحکومت میں پہنچ کر یہ اعلان کیا کہ وہ اپنی ریاست کے شہروں اور قصبوں میں نمائندہ بلدیاتی ادارے قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور 20رجولائی کو اس کا اعلان یہ تھا اس کی دوایوانی مقننہ کا اجلاس اگست میں ہوگا۔ 27رجولائی کو یہ خبر چھپی کہ قلات کے وزیراعظم خان محمد ظریف خان نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا ہے جسے ''خان معظم'' نے فوراً منظور کر لیا ہے۔ تاہم اس نے استعفیٰ کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے۔'' جب سات آٹھ دن تک خان قلات کی طرف سے اس خبر کی تردید نہ ہوئی تو حکومت پاکستان کی وزارت ریاستی امور کے ایک ترجمان نے انٹرویو میں بتایا کہ اسے اس امر کے متعلق شک ہے کہ خان قلات نے قلات کے وزیراعظم خان بہادر ظریف خان کا استعفیٰ منظور کر لیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ریاست کے وزیراعظم کا تقرر خان قلات نے ریاست کے پاکستان میں شمول کے بعد حکومت پاکستان کے صلاح مشورے سے کیا تھا۔ تقرر کے وقت طے ہوا تھا کہ وزیراعظم موصوف حکومت پاکستان کے براہ راست کنٹرول میں...... ریاست کے دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کی نگرانی

کرے گا اور اس کے لئے وہ اے۔جی۔جی بلوچستان کے ذریعے جواب دہ ہوگا۔ چونکہ اس کا تقرر حکومت پاکستان کی منشا اور ذمہ داری سے ہوا ہے، اس کے استعفیٰ کا علم لازماً حکومت پاکستان کو ہونا چاہیے۔ چونکہ اس کا استعفیٰ وزارت ریاستی امور کو نہیں پہنچا اس لئے اس کے متعلق شک ہے۔ ترجمان مذکور سے پوچھا گیا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ خان قلات ریاست میں تیل دریافت کرنے کے لئے بعض امریکی فرموں سے بات چیت کر رہا ہے تو ترجمان نے کہا کہ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ اس نے بتایا کہ ریاست کے ساتھ جو معاہدہ قائم ہے اس کی رو سے ریاست میں معدنیات وغیرہ کی دریافت اور دوسرے امور کے متعلق کسی غیر ملکی کمپنی سے گفتگو اور مفاہمت کی منظوری حکومت پاکستان ہی دے سکتی ہے۔''[6]

ریاستی امور کی وزارت کے ترجمان کے اس انٹرویو کی تعبیر یہ تھی کہ خان قلات نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران حکومت پاکستان سے بالا بالا کسی امریکی آئل کمپنی سے اپنی ریاست میں تیل تلاش کرنے کی اسی طرح کی بات چیت کی تھی جس طرح کی کہ اس کے انگریز وزیر خارجہ ڈوگلس فل نے 1947-48ء میں کی تھی۔ جب خان کی واپسی پر قلات کے وزیر اعظم محمد ظریف خان کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے خارجی امور کے بارے میں ''ہز ہائی نس'' کی ''آزادی وخود مختاری'' سے اختلاف کیا تو اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ قدرتی طور پر ریاستی امور کی وزارت نے ''ہز ہائی نس'' کی اس یک طرفہ کاروائی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو 15 راگست کو خان قلات نے مقامی شاہی مسجد میں یہ اعلان کر دیا کہ میرے اور وزیر اعظم ظریف خان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ظریف خان نے ریاست قلات کے مفاد کے لئے جو خدمات سرانجام دی ہیں میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ اس سے قبل 11 راگست کو اس نے اپنے ''ایوان زیریں'' کے چھ ارکان کو ایوان کی رکنیت کا نااہل قرار دیا تھا۔ ان چھ ارکان میں قلات نیشنل پارٹی کا جنرل سیکرٹری میر غوث بخش بزنجو بھی شامل تھا اور پھر 12 راگست کو اس نے کوئٹہ کے ایک ہفت روزہ ''استقلال'' کا ریاست میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ یہ جریدہ سابق کانگرسی لیڈر عبدالصمد اچکزئی کی ملکیت تھا اور اس پر الزام یہ تھا کہ وہ ''ریاست قلات میں قلات اور پاکستان کے مفادات کے خلاف فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' اسی دن اس کی دو ایوانی مقننہ کا ''بجٹ سیشن'' ہونے والا تھا مگر اس نے یہ سیشن بعض ''تکنیکی دشواریوں'' کے پیش نظر غیر معین عرصے کے

لئے ملتوی کر دیا تھا۔اس طرح اس نے امریکہ اور برطانیہ کے دورے کے بعد اپنی آزادی وخود مختاری کے اظہار کی پھر جو کوشش کی تھی وہ بھی ناکام بنادی گئی۔ان دنوں اس کا ایک چھوٹا بھائی شہزادہ عبدالکریم پاکستان کے خلاف بغاوت کے الزام میں دس سال کی قید کی سزا کاٹ رہا تھا اور اس کے دوسرے چھوٹے بھائی شہزادہ عبدالرحیم کے خلاف کوئٹہ کے سیشن جج کی عدالت میں قتل کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے یکم اپریل 1949ء کو اپنی بیوی رضیہ بیگم کو قتل کر دیا تھا۔

دستور ساز اسمبلی اور مشاورتی کونسل میں نمائندگی پر بلوچستان کی مختلف سیاسی قوتوں کے مابین کشمکش

تاہم خان قلات نے 18رمئی 1949ء کا یہ فیصلہ منظور نہ کیا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لئے بلوچستان کی ریاستوں کے نمائندہ کا انتخاب ایجنٹ گورنر جنرل کرے گا۔اس کے اس انکار پر 22راگست کو اس مقصد کے لئے کوئٹہ میں بلوچستان کی چاروں ریاستوں (قلات، خاران، مکران اور لس بیلہ) کے حکمرانوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔اس اجلاس میں خاران، مکران اور لس بیلہ کے حکمرانوں نے ایک نمائندہ منتخب کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا لیکن انتخاب کی تجویز خان قلات کو منظور نہیں تھی۔اس کا اصرار یہ تھا کہ چونکہ ریاست قلات کی آبادی باقیماندہ تینوں ریاستوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے اس لئے نمائندہ صرف قلات کی طرف سے ہی مقرر ہونا چاہیے خواہ باقی ماندہ تینوں ریاستیں اسے منظور نہ کریں۔چنانچہ اس معاملہ کو پھر معرض التواء میں ڈال دیا گیا۔حالانکہ حکومت پاکستان چاروں حکمرانوں کو انتخاب کا حق دینے پر آمادہ تھی۔

پاکستان کی ریاستی امور کی وزارت، بلوچستان میں ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کے لئے بھی بالغوں کے حق رائے دہندگی کے اصول پر انتخاب کرانے کے حق میں تھی۔ قبائل فیڈریشن کی طرف سے یہ مطالبہ 27رفروری 1949ء کو کیا گیا تھا مگر اس وقت اس مطالبہ پر سنجیدگی سے غور نہیں ہوا تھا۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان دنوں صوبائی مسلم لیگ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی منظور نظر تھی اور وہ نامزدگیوں کے ذریعے مشاورتی کونسل میں مسلم لیگ کے غلبہ کے حق میں تھا۔دوسری وجہ یہ تھی کہ اس مطالبہ کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ 18راپریل کو کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن چلا گیا تھا۔جب اس کی واپسی پر اس مسئلہ پر دوبارہ غور ہوا تو یہ

فیصلہ ہوا کہ آئندہ بلوچستان کی مشاورتی کونسل کی تشکیل بذریعہ عام انتخابات ہوگی اور پاکستان مسلم لیگ کے بلوچستانی جوائنٹ سیکرٹری میر نبی بخش کے 7راگست کے بیان کے مطابق ریاستی امور کی وزارت نے اس سلسلے میں صوبائی حکومت کے نام مناسب احکامات بھی جاری کر دیئے تھے اور ایجنٹ گورنر جنرل نے بھی اپنے ماتحت حکام کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔اس نے اپنے اس بیان میں فیڈریشن کے ارکان سے اپیل کی تھی کہ اب وہ مسلم لیگ میں شامل ہوکر بلوچستان کی خوشحالی کی کوششوں میں شریک ہوں۔8راگست کو ریاستی وزارت کے ترجمان نے بھی اس اطلاع کی تصدیق کی اور بتایا کہ بلوچستان کی انتظامیہ کو عام انتخابات کی سکیم تیار کرنے کی ہدایت کر دی گئی ہے۔اس نے کہا کہ ''اگرچہ کوئی میعاد تو مقرر نہیں کی گئی لیکن یہ طے ہوگیا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکا انتخابات کرا دیئے جائیں گے۔انتخابی حلقوں کا تعین ایجنٹ گورنر جنرل حکومت پاکستان کے مشورے سے کرے گا۔

دریں اثناء خان قلات نے مشاورتی کونسل کی نشستوں کی تقسیم پر صوبائی مسلم لیگ اور قبائل فیڈریشن کے درمیان پیدا شدہ اختلاف کا اس تجویز کی بنیاد پر تصفیہ کرانے کی کوشش کی کہ کونسل میں فیڈریشن کے قبائلی سرداروں کو زیادہ نشستیں دے دی جائیں مگر بلوچستان مسلم لیگ کا صدر قاضی عیسیٰ اس تجویز پر راضی نہ ہوا۔مفاہمت کی اس بات چیت کی ناکامی کا اعلان 13راگست کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں ہوا۔لیگ کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا کہ مشاورتی کونسل میں نواب محمد خان جوگیزئی کی نشست کو خالی قرار دے دیا جائے کیونکہ نواب اس کونسل کے وجود کے ہی خلاف ہے اور اس نے کبھی اس کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ایک اور قرارداد میں سردار نور محمد گولا کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کر کے اسے ہدایت کی گئی کہ وہ صوبہ میں ''غیر اسلامی اور غیر انسانی'' رسوم و روایات کے انسداد کے لئے تجاویز پیش کرے۔لیگ کونسل کے اجلاس کے بعد قاضی عیسیٰ نے ایک انٹرویو میں مسلم لیگ اور قبائل فیڈریشن کے درمیان مصالحت کے لئے خان قلات کی مساعی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم ہر مسلمان کا مسلم لیگ میں خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ہم مصالحت کی خاطر اصول کو قربان نہیں کر سکتے۔'' قاضی عیسیٰ نے اپنے اس انٹرویو میں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا وہ کونسا اصول ہے جسے وہ قبائلی سرداروں سے مصالحت کی خاطر قربان نہیں کرسکتا اور اخبار نویسوں نے اس سے اس سلسلے

میں غالباً اس لئے استفسار نہیں کیا تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ اس اصول کا مقصد مجوزہ عام انتخابات سے پہلے مشاورتی کونسل پر اور مشاورتی کونسل کے ذریعے صوبائی انتظامیہ پر اپنا غلبہ برقرار رکھنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر انتظامیہ اس کے زیر اثر رہی تو انتخابات میں اس کی جیت یقینی ہو گی۔ بصورت دیگر انتخابی نتیجہ قبائلی سرداروں کے حق میں چلا جائے گا کیونکہ ان کے پاس شاہی جرگہ تھا جو صوبائی انتظامیہ کا ایک نہایت مؤثر جزو تھا۔

پنجابی ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین اور صدر بلوچستان مسلم لیگ قاضی عیسیٰ کے مابین تضاد

لیکن ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین کو قاضی عیسیٰ کا یہ ''اصول'' پسند نہیں تھا اس لئے ان دونوں کے درمیان شدید ''اصولی اختلاف'' پیدا ہو گیا۔ ایک طرف لاہور کے ایک ''رئیس'' خاندان کا چشم و چراغ میاں امین الدین تھا جو پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کے سرغنہ سر فضل حسین کی نظر عنایت سے انڈین سول سروس میں شامل ہوا تھا اور جس نے اپنے برطانوی آقاؤں سے افسرانہ رعونت اور فرعونیت کی ''اعلیٰ تربیت'' پائی ہوئی تھی۔ وہ کوئٹہ شہر کے ایک ''تیسرے درجے'' کے وکیل اور سیاسی طالع آزما قاضی عیسیٰ کے مقابلے میں ان جغادری سرداروں کو ترجیح دیتا تھا جو تین نسلوں سے نہایت ثابت قدمی سے ایجنٹ گورنر جنرل کے فرمانبردار چلے آ رہے تھے۔ امین الدین، اسکندر مرزا، عزیز احمد اور دوسرے بڑے افسروں کی طرح بہت ہی ''پکا صاحب'' تھا۔ وہ افسر شاہی کا دبدبہ بہر قیمت برقرار رکھنے کا قائل تھا۔ اسے بلوچستان کے غریب عوام کی فلاح و بہبود میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اسے جمہوریت کے لفظ سے نفرت تھی۔ اس نے انڈین سول سروس کے اپنے تربیتی دور میں صرف یہ فن سیکھا ہوا تھا کہ اپنے زیر انتظام علاقے میں نظم و نسق کیسے قائم رکھنا چاہیے۔ چونکہ بلوچستان کے سٹریٹیجک (Strategic) علاقے میں گزشتہ ایک سو سال میں برطانوی سامراج کا یہ مقصد قبائلی سرداروں کے ذریعے پورا ہوتا رہا تھا اس لئے وہ اپنے سامراجی پیشروؤں کے اس طریقۂ کار سے انحراف کو گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔ دوسری طرف کوئٹہ کے ایک خوشحال پٹھان خاندان کا نور نظر قاضی محمد عیسیٰ تھا جس نے لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لینے کے بعد وکالت کی بجائے سیاست کے پیشے کی طرف زیادہ توجہ کی تھی۔ جب 1938ء

میں برصغیر کے ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ کاروائیوں کی وجہ سے ہندو مسلم تضاد نے شدید سے شدید تر ہو کر کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تضاد کی صورت اختیار کر لی تو قاضی عیسیٰ بھی سندھ کے جی۔ ایم ۔ سید کی طرح مسلم لیگ میں شامل ہو گیا اور اس نے میر احمد یار خان آف قلات، شہزادہ عبدالکریم، شہزادہ عبدالرحیم اور نواب محمد خان جوگیزئی وغیرہ کی امداد سے صوبائی مسلم لیگ کی تنظیم کی اور خود اس کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس کے بعد جس رفتار سے برصغیر میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی رفتار سے بلوچستان میں قاضی عیسیٰ کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا قبائلی سرداروں کے ساتھ 1946ء میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا جبکہ وزارتی مشن کے پلان کے تحت ہندوستانی دستور ساز اسمبلی کے لئے بلوچستان کے واحد نمائندہ کے طور پر نواب محمد خان جوگیزئی کا انتخاب ہوا تھا۔ وہ اس پوزیشن کے لئے خود منتخب ہونا چاہتا تھا مگر بلوچستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس کی دال نہ گلی۔

اگست 1947ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو قاضی عیسیٰ کو امید تھی کہ اسے بھی اس نوزائیدہ مملکت کے ایوان اقتدار میں کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی ۔ مگر اس کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اسے نہ تو مرکزی کابینہ میں کوئی وزارت ملی اور نہ ہی صوبہ میں اسے کوئی مسند اقتدار نصیب ہوئی۔ بالآخر ڈیڑھ پونے سال کی جدوجہد کے بعد اپریل 1949ء میں ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل قائم ہوئی تو اس نے اس کونسل کے سینئر رکن کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ مگر اس کی بدقسمتی سے اس بنا پر اس کے اور قبائلی سرداروں کے ایک طاقتور گروہ کے درمیان تضاد کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور اس صورت حال نے ستمبر 1949ء میں اس کے اور ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کے درمیان ''اصولی اختلاف'' پیدا کر دیئے۔

لیاقت علی خان نے قاضی عیسیٰ کے خلاف بیوروکریسی اور قبائلی سرداروں کا ساتھ دیا

جب وزیر اعظم لیاقت علی خان تک یہ بات پہنچی تو اس نے ان دونوں کو کراچی طلب کر کے 15 ستمبر کو کوشش کی کہ ان دونوں کے ''اصولی اختلاف'' رفع ہو جائیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ قاضی عیسیٰ مشاورتی کونسل کے مجوزہ عام انتخابات سے پہلے انتظامی اختیارات کا طالب تھا لیکن

امین الدین اپنے آمرانہ اختیارات سے ذرا سا بھی دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ لیاقت علی خان اپنی حکومت زیادہ تر بیوروکریسی کے سہارے چلاتا تھا اور امین الدین اس بیوروکریسی کا بہت اہم رکن تھا اس لئے وزیراعظم پاکستان اس کے سامنے بے بس تھا اور وہ اپنی دو تین دن کی کوشش کے باوجود قاضی عیسیٰ کا کوئی مطالبہ بھی پورا نہ کر سکا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نیویارک ٹائمز کی 2رمئی 1949ء کی رپورٹ کے مطابق بلوچستان کے سرحدی علاقے میں قبائلی سرداروں اور ریاستی حکمرانوں کو بہرصورت مطمئن رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ وہ بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کے مطالبہ کو یہ کہ کر ٹال دیتا تھا کہ یہ مسئلہ پاکستان کی دستورساز اسمبلی کی طرف سے نئے آئین کی منظوری کے بعد خود بخود حل ہو جائے گا۔

وزیراعظم کی اسی پالیسی کے تحت گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے، جو 13رستمبر کو بغرض آرام زیارت گیا تھا، 3راکتوبر کو کوئٹہ میں قبائلیوں کے شاہی جرگہ کو خطاب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ قبائل فیڈریشن کے مطالبہ کے مطابق، ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کے انتخابات جتنی جلدی ممکن ہو سکا، ہوں گے اور یہ انتخابات آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے۔'' اس کی اس یقین دہانی کا مطلب یہ تھا کہ مقامی انتظامیہ مجوزہ عام انتخابات میں صوبہ لیگ کی جانبداری نہیں کرے گی۔ 6راکتوبر کو گورنر جنرل نے کوئٹہ میونسپلٹی کے خطبۂ استقبالیہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے ایک مرتبہ اور یقین دلایا کہ عام انتخابات کے لئے انتظامات کئے جا رہے ہیں تاکہ یہاں کے عوام الناس مشاورتی کونسل کے لئے مرضی کے نمائندوں کا انتخاب کر سکیں۔ اس نے بلوچستان کے سارے دیانت دار اور مخلص عناصر سے اپیل کی کہ ''وہ اپنے صوبہ کی ترقی اور پاکستان کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے اپنی ذاتی مصلحتوں اور خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر عوام کی بھلائی کے لئے کام کریں۔''[7] اکتوبر کو اس نے مشاورتی کونسل کے ارکان کو خطاب کیا اور ان سے اپیل کی کہ ''وہ اپنی قراردادوں میں انتہا پسندی کا مظاہرہ نہ کریں۔'' اس اپیل کا مطلب یہ تھا کہ قبائلیوں کے ''غیر انسانی اور غیر اسلامی'' رسوم و روایات کے خاتمہ پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ 11راکتوبر کو اس نے یہی بات بلوچستان مسلم لیگ کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے ذرا کھل کر کہی۔ اس نے کہا کہ ''مسلم لیگ کے مطالبات کی بنیاد حقیقت پسندی پر ہونی چاہیے۔ انہیں اس بات کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مجوزہ انتخابات موجودہ حالات اور اداروں کی

موجودگی میں ہی ہوں گے۔'' گورنر جنرل کی اس تقریر سے پہلے قاضی عیسیٰ کی سربراہی میں مسلم لیگ کے ایک وفد نے اس سے ملاقات کر کے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ ''بلوچستان کے قبائلی سرداروں کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت جو اختیارات حاصل ہیں، آئندہ عام انتخابات میں ان کا ناجائز استعمال کیا جائے گا۔''

خواجہ ناظم الدین اس تقریر کے بعد قلات چلا گیا جہاں کے ''خان معظم'' نے دو دن اس کی میز بانی کی اور پھر 13 اکتوبر کو جب وہ واپس کراچی چلا گیا تو اس سے اگلے دن قبائل فیڈریشن کے صدر نواب محمد خان جوگیزئی نے ایک اخباری انٹرویو میں مشاورتی کونسل کے انتخابات کرانے کے فیصلے کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ہم ابتدا ہی سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ موجودہ نامزد مشاورتی کونسل کو توڑ دیا جائے کیونکہ یہ بلوچستان کی رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کرتی۔ لیکن اس نے اپنے اس انٹرویو میں یہ نہ بتایا کہ اس کے نامزد شاہی جرگہ اور سرداری نظام کی بنیاد کون سے جمہوری اصول پر تھی اور یہ شاہی جرگہ کون سے قاعدہ و قانون کے تحت فیصلے کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی نہ بتایا کہ بلوچستان میں عورتوں کی خرید و فروخت اور نیلامی کون سے انسانی، اسلامی یا جمہوری اصول کے مطابق ہوتی تھی اور قبائلی سردار حکومت سے کون سی خدمات کے عوض الاؤنس لیتے تھے اور غریب و مظلوم قبائلی عوام سے متعدد ٹیکس وصول کرتے تھے۔

بلوچستان مسلم لیگ میں دھڑے بندی...... لیگ ہائی کمان نے دباؤ ڈال کر قاضی عیسیٰ کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا

قاضی عیسیٰ کی ہوس اقتدار اور ابن الوقتی کے باعث اسے ایک اور سیاسی مشکل بھی درپیش تھی جس سے ایجنٹ گورنر جنرل اور اس کے مخالف قبائلی سرداروں نے خوب فائدہ اٹھایا اور جو بالآخر اسکی سیاسی زندگی کے خاتمہ کا باعث بنی۔ وہ مشکل یہ تھی کہ جب 22 اپریل 1949ء کو بلوچستان مشاورتی کونسل کے ناموں کا اعلان ہوا تھا، اس کے فوراً ہی بعد صوبائی لیگ میں اس سوال پر دھڑے بندی ہو گئی تھی کہ اب جبکہ قاضی عیسیٰ ایجنٹ گورنر جنرل کا سینیئر مشیر ہو گیا تو وہ پاکستان مسلم لیگ کے فروری 1948ء میں منظور کردہ آئین کے تحت صوبہ لیگ کے عہدہ پر فائز رہ سکتا ہے یا نہیں؟ صوبہ سندھ کے بلوچ لیڈر میر جعفر خان جمالی کی زیر قیادت ایک دھڑے کا

مؤقف یہ تھا کہ اس سلسلے میں پاکستان مسلم لیگ کا آئین بالکل واضح ہے۔ قاضی عیسیٰ اس آئین کی رو سے بیک وقت سرکاری عہدے اور صوبہ لیگ کی صدارت پر فائز نہیں رہ سکے گا۔ مگر قاضی کا اصرار یہ تھا کہ وہ ان دونوں عہدوں پر مسلط رہ سکتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں دھڑوں کے درمیان تضاد روز بروز بڑھتا چلا گیا تھا۔ چنانچہ قاضی عیسیٰ نے اس صورت حال کے پیش نظر 11 رمئی 1949ء کو صوبہ لیگ کونسل سے ایک قرارداد منظور کروائی جس میں میر جعفر خان جمالی کی ''لیگ دشمن'' سرگرمیوں کی مذمت کی گئی اور الزام عائد کیا گیا کہ یہ شخص بلوچستان مسلم لیگ میں انتشار پھیلا رہا ہے۔ 13 رجون 1949ء کو قاضی عیسیٰ نے پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کی موجودگی میں اپنے سرکاری عہدے کا حلف اٹھایا تو صوبہ لیگ کے اندر دھڑے بندی اور بھی شدید ہوگئی جبکہ نواب جوگیزئی کی قبائل فیڈریشن نے مشاورتی کونسل کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

صوبہ لیگ کے داخلی تضاد کا یہ لاوا تقریباً ایک ماہ میں اچھا خاصا پک گیا تو 13 رجولائی کو یہ خبر شائع ہوئی کہ اگست کے مہینے میں سندھ مسلم لیگ کا جو اجلاس ہوگا اس میں اس مسئلہ پر بھی غور ہوگا کہ ''قاضی محمد عیسیٰ ایجنٹ گورنر جنرل کا تنخواہ دار مشیر ہونے کی وجہ سے صوبہ لیگ کی صدارت کے عہدہ پر قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ بات پاکستان مسلم لیگ کے آئین کے سراسر منافی ہے۔'' پھر 22 رجولائی کو بلوچستان مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری میر نبی بخش نے ایک بیان میں سندھ لیگ کے اس مؤقف کی تائید کی تھی اور اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ قاضی عیسیٰ پاکستان مسلم لیگ کے آئین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہا ہے۔ قاضی عیسیٰ نے اس بیان کا جواب اس طرح دیا کہ اس نے 13 راگست کو صوبہ لیگ کونسل سے ''مکمل اعتماد'' کی قرارداد منظور کروائی اور بعد میں ایک اخباری انٹرویو میں اس خبر کی تردید کی ''بلوچستان مشاورتی'' کونسل نے اجتماعی یا انفرادی طور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ صوبہ لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو جائے۔'' لیکن یہ قرارداد قاضی عیسیٰ کے کام نہ آئی اور صوبہ لیگ کے اندر تقریباً دو ماہ کی کھینچا تانی کے بعد 11 رنومبر کو پاکستان مسلم لیگ کی مقرر کردہ سپر وائزری کمیٹی نے مجلس عاملہ سے یہ سفارش کی کہ مشیروں پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ وہ لیگ میں کسی عہدہ پر قائم نہ رہیں کیونکہ یہ بات لیگ کے آئین کی روح کے منافی ہے۔ چنانچہ 28 ردسمبر کو پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ کوئی مشیر مسلم لیگ کے کسی بھی عہدے پر فائز نہیں رہ سکتا اور اسی دن بلوچستان مسلم لیگ کے جائنٹ

سیکرٹری میر نبی بخش نے مرکزی مجلس عاملہ کے اس فیصلے کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس فیصلے کے بعد بلوچستان مسلم لیگ کے اندر اس دھڑے کا پلہ بھاری ہو گیا جو صوبہ میں قاضی عیسیٰ کی سیاسی بالادستی کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ چنانچہ اس دھڑے نے پہلے تو قاضی عیسیٰ اور اس کے حواریوں کے خلاف بعض الزامات کی تحقیقات کے لئے ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی اور پھر اپنے اس مطالبہ پر مسلسل زور دینا شروع کر دیا کہ قاضی عیسیٰ کو صوبہ مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ جب اس سلسلے میں تقریروں اور بیانات کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی تو 4رفروری 1950ء کو قاضی عیسیٰ نے کوئٹہ میں اعلان کیا کہ وہ صوبہ لیگ کی صدارت یا ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورت میں سے کسی بھی عہدہ سے مستعفی نہیں ہو گا۔ اس نے کہا کہ ''میں یہ معاملہ صوبہ لیگ کونسل کے روبرو پیش کروں گا اور کونسل جو بھی فیصلہ کرے گی میں اس پر عمل کروں گا۔'' اسی دن شام کو اس نے سبی کی جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے مسلم لیگ کے اندر انتشار پسند عناصر کی مذمت کی اور اشارۃً بتایا کہ مستقبل قریب میں ان عناصر کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔

9رفروری 1950ء کو سبی میں ہی قاضی عیسیٰ کی زیر صدارت صوبہ لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں بلوچستان مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری میر نبی بخش اور بلوچستان مشاورتی کونسل کے ایک رکن میر قادر بخش کو پانچ سال کے لئے لیگ سے خارج کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان دونوں کے خلاف الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ مسلم لیگ کے خلاف سرگرم عمل رہے ہیں۔ اس فیصلے سے پہلے ''بخش گروپ'' جلسہ سے واک آؤٹ کر گیا تھا اور جب اس سلسلے میں قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی تھی، اس وقت کونسل کے 75 ارکان میں سے 40 ارکان جلسہ میں موجود تھے۔ اسی دن بخش گروپ نے بھی ملک حاجی جان کی زیر صدارت اپنی کونسل کی میٹنگ کی جس میں قاضی محمد عیسیٰ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کی گئی۔ ایک ہی دن دونوں فیصلوں کی اہمیت یہ تھی کہ 10 رفروری کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے روایتی سالانہ شاہی دربار کو خطاب کرنے کے لئے سبی پہنچنا تھا اور اس موقع پر دونوں ہی دھڑے اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کر کے وزیر اعظم کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔ یہ دربار 11 رفروری کو منعقد ہوا اور لیاقت علی خان نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''ہم بلوچستان اور چاروں بلوچستانی ریاستوں کو انتظامی

لحاظ سے اس سطح پر لانا چاہتے ہیں جس سطح پر پاکستان کے دوسرے علاقے ہیں۔" بعد میں اس نے صوبہ لیگ کے دونوں دھڑوں کی شکایات سنیں اور ان سے اپیل کی کہ وہ دھڑے بندی کی سیاست کو ترک کر کے باہمی اتفاق واتحاد کے ساتھ مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط بنائیں۔

صوبہ لیگ میں دھڑے بندی کے بارے میں لیاقت علی خان کا یہ دورہ بظاہر غیر جانبدارانہ تھا لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ لیاقت علی خان کی نظر میں ایجنٹ گورنر جنرل اور قبائلی سرداروں کی وقعت زیادہ تھی۔ چنانچہ اس کی کراچی میں واپسی کے ہفتہ عشرہ بعد پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے بلوچستان مسلم لیگ کے "بخش گروپ کے 13 رکنی وفد کو بتایا کہ آئندہ قاضی محمد عیسیٰ کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلانے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اب یہ اجلاس براہ راست مرکزی لیگ کی نگرانی میں ہوگا۔ قاضی عیسیٰ کے خلاف بعض شکایات کا فیصلہ مرکزی لیگ کی نگران کمیٹی کرے گی اور بعض دوسری شکایات پر مرکزی انتخابی بورڈ کرے گا۔" چودھری خلیق الزماں کا یہ بیان "بخش گروپ" کے لئے بہت اطمینان بخش تھا کیونکہ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنے دورۂ سبی کے موقع پر قاضی عیسیٰ کی سیاست کا چراغ گل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میر نبی بخش کے 23 رفروری کے بیان کے مطابق قاضی عیسیٰ نے 9 رفروری کو سبی میں لیگ کونسل کا جو اجلاس منعقد کیا تھا اس میں 72 کونسلروں میں سے صرف 20 نے شرکت کی تھی اور یہ کہ لیگ کی نئی رکن سازی کے سلسلے میں بہت جعل سازی کی گئی تھی۔ اسکا مزید الزام یہ تھا کہ "قاضی عیسیٰ ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین کے خلاف بھی بہت غیر آئینی اور غیر قانونی کاروائیاں کرتا رہا ہے۔" لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے نبی بخش کا یہ بیان اپنی 24 رفروری کی اشاعت میں چھاپا تھا اور اس کے آخر میں کراچی کے سیاسی حلقوں میں پھیلی ہوئی اس گرما گرم خبر کا بھی ذکر تھا کہ "قاضی عیسیٰ عنقریب مشاورتی کونسل کی رکنیت اور صوبہ لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو جائے گا اور اس نے ان دونوں عہدوں کے بدلے میں ایک معمولی سا سفارتی عہدہ قبول کر لیا ہے۔" اسی دن پاکستان ٹائمز کا بلوچستان کی سیاسیات پر ادارتی تبصرہ تھا کہ "اگر قاضی عیسیٰ واقعی آئینی بدعنوانیوں کا مرتکب ہوا ہے تو مرکزی لیگ کی طرف سے اس کے خلاف انضباطی کاروائی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مقامی حکومت میں ملزم اعلیٰ حیثیت کا حامل ہے یا مرکزی لیگ کو خدشہ ہے کہ اگر قاضی

عیسیٰ کے خلاف کوئی کاروائی کی گئی تو صوبہ لیگ کے اندر مزید رسہ کشی سے آئندہ انتخابات میں لیگ کو نقصان پہنچے گا۔'' لیکن پاکستان ٹائمز نے اپنے اس تبصرے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ بلوچستان مسلم لیگ کے اس سارے جھگڑے میں پنجابی ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین کا کیا کردار تھا اور یہ کہ چونکہ قاضی عیسیٰ نے اپنی ہوس اقتدار کے باعث اس نہایت بااثر اعلیٰ افسر کی مخالفت مول لی ہے اس لئے اب بلوچستان میں اس کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہے۔ بیوروکریسی لیاقت علی خان کی حکومت کا سب سے بڑا ستون تھی اور وہ محض قاضی عیسیٰ کی خاطر بیوروکریسی کو ناراض نہیں کرسکتا تھا بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ کشمیر میں جنگ بندی کے باعث پنجابی فوج میں اس کی حکومت کے خلاف خفگی کے آثار پائے جاتے تھے اور صوبہ پنجاب میں درمیانہ طبقہ کے شونسٹوں نے اس کے خلاف نہایت معاندانہ سیاسی محاذ قائم رکھا تھا۔

قاضی محمد عیسیٰ نے چودھری خلیق الزماں کے اس بیان کے باوجود صوبہ لیگ کی صدارت کے عہدہ سے چمٹے رہنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے 12 ؍مارچ کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر کو صوبائی لیگ کونسل کی ایک قرارداد بھیجی جس میں کہا گیا تھا کہ ''بلوچستان کے موجودہ غیر معمولی حالات کے پیش نظر آئندہ انتخابات تک قاضی عیسیٰ کو صوبہ لیگ کی صدارت کے عہدہ پر فائز رہنے دینا چاہیے۔'' مگر اس کی یہ آخری تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ 14 ؍اپریل کو مرکزی وزارت ریاستی امور کا سیکرٹری کرنل اے۔ ایس۔ بی۔ شاہ کوئٹہ پہنچا اور اسی دن اس نے خان قلات کے علاوہ ایجنٹ گورنر جنرل سے بھی ملاقات کی۔ 15 ؍اپریل کو پاکستان کی بری فوج کا ایڈ جوٹنٹ جنرل، میجر جنرل محمد ایوب خان تین روزہ دورے پر کوئٹہ پہنچا اور 19 ؍اپریل کو یہ خبر شائع ہوگئی کہ قاضی عیسیٰ نے صوبہ لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس نے اپنے اس استعفیٰ کی دو وجوہ بتائیں۔ اول یہ کہ ''میری صحت خراب'' ہے۔ اور دوئم یہ کہ ''میں دو عہدے نہیں سنبھال سکتا ہوں۔'' اس خبر سے تقریباً دو ہفتے قبل 5 ؍اپریل کے ''ڈان'' میں یہ خبر بھی شائع ہو چکی تھی کہ بلوچستان مشاورتی کونسل کا چھٹا اجلاس 25 ؍مئی کو شروع ہوگا اور اس کی صدارت ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کریں گے۔'' اس خبر میں کوئٹہ کے سیاسی حلقوں کی اس رائے کا تذکرہ تھا کہ ''موجودہ کونسل کا یہ اجلاس آخری ہوگا کیونکہ جون میں اس کی ایک سالہ مدت ختم ہو جائے گی اور پھر نئی کونسل کی نامزدگی ہوگی۔'' لیکن خبر میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ 10 ؍مئی کو صوبائی لیگ کونسل کے

اجلاس میں قاضی عیسیٰ کو صوبائی لیگ کی صدارت سے فارغ کر دیا جائے گا اور جون کے بعد جونئ مشاورتی کونسل نامزد ہوگی اس میں قاضی عیسیٰ کو شامل نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ نئ مشاورتی کونسل کی تشکیل کے لئے کئی ماہ قبل عام انتخابات کرانے کے بارے میں سرکاری طور پر جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی تکمیل نہیں ہوگی۔ صوبہ کے سارے انتظامی اختیارات بدستور ایجنٹ گورنر جنرل کے پاس ہی رہیں گے۔ سرداری نظام قائم رہے گا اور شاہی جرگہ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔ مزید براں یہ خبر اس حقیقت کے ذکر سے بھی خالی تھی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے 11 رفروری 1950ء کو سبی دربار میں بلوچستانی عوام کو جمہوریت کی نوید دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ ''ہم بلوچستان اور بلوچستانی ریاستوں کو انتظامی لحاظ سے اس سطح پر لائیں گے جس سطح پر کہ پاکستان کے دوسرے علاقے ہیں۔''

لیاقت علی نے ریاستوں کی جانب سے عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دینے کے بجائے نوابوں اور سرداروں کی نامزدگی کا راستہ اختیار کیا

جب لیاقت علی خان نے مذکورہ اعلان کیا تھا، اس وقت بلوچستانی ریاستوں میں بھی عوامی نقطۂ نگاہ سے کسی سیاسی یا انتظامی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ 14 راپریل کو وزارت ریاستی امور کے سیکرٹری کرنل اے۔ ایس۔ بی شاہ کی کوئٹہ میں خان قلات سے ملاقات کی وجہ یہ تھی کہ ''خان معظم'' بلوچستان کی دوسری ریاستوں خاران، مکران اور لس بیلہ پر اپنی بالادستی بحال کرنے پر مصر تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بلوچستانی ریاستوں کے نمائندے کی نامزدگی کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ حکومت پاکستان اس کے داخلی معاملات میں دخل دینے کی مجاز نہیں اور وہ کسی بھی غیر ملکی کمپنی کو اپنے علاقے میں تیل کی تلاش کرنے کا ٹھیکہ دینے کا قانونی حق رکھتا ہے۔ وہ اپنی اس مطلق العنانیت کی وجہ سے اپنی ریاست میں مسلم لیگ کے عمل دخل کے بھی خلاف تھا۔ اگرچہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے 18 رمئ 1949ء کو اعلان کیا تھا کہ ریاست قلات اور پاکستان کی دوسری ملحقہ ریاستوں میں آل پاکستان مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں گی اور مرکزی لیگ کی مجلس عاملہ نے یہ طے کیا تھا کہ بلوچستان کی ریاستوں میں مسلم لیگ کی برانچیں بلوچستان مسلم لیگ سے منسلک ہوں گی۔ 25 رجون

1949ء کو قلات سٹیٹ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نے صدر پاکستان مسلم لیگ کے نام ایک تار میں اپنی تنظیم کو ''براہ راست'' آل پاکستان مسلم لیگ کے ساتھ ملحق کرنے کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ 3 رجولائی 1949ء کو پاکستان سٹیٹس مسلم لیگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا تھا اور پھر ستمبر 1949ء کے دوسرے اور تیسرے ہفتوں میں پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک نے مسلم لیگ کی برانچیں منظم کرنے کے لئے قلات، لس بیلہ، مکران اور خاران کا دورہ کیا تھا لیکن ''خان معظم'' نے مسلم لیگ کی تنظیم کی اجازت نہیں دی تھی۔

بالآخر جب پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اس صورت حال کے پیش نظر فروری 1950ء میں یہ فیصلہ کیا کہ بلوچستانی ریاستوں کی مسلم لیگوں کا ''براہ راست'' آل پاکستان مسلم لیگ کے ساتھ الحاق نہیں ہوگا بلکہ قاضی عیسیٰ کی سربراہی میں بلوچستان مسلم لیگ کو ان ریاستوں میں اپنی برانچیں منظم کرنے کا اختیار ہوگا تو خان معظم بہت برہم ہوا اور غالباً یہ اس کی برہمی ہی کا نتیجہ تھا کہ 14 رفروری 1950ء کو ریاست قلات کے سرداروں نے قلات ٹرائبز فیڈریشن (Baluchistan Tribes Federation) کے نام سے اپنی ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس موقعہ پر نواب محمد خان شاہوانی اس جماعت کا صدر اور نواب محبوب علی مگسی اس کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا تھا اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ''اس جماعت کا الحاق نواب محمد خان جوگیزئی کی ٹرائبز فیڈریشن کے ساتھ ہوگا۔'' اس جماعت کا پہلا اجلاس 26 رمارچ کو کوئٹہ کے مگسی ہاؤس میں ہوا تھا جبکہ یہ خبر چھپی تھی کہ مرکزی وزارت ریاستی امور کا سیکرٹری کرنل شاہ عنقریب کوئٹہ اور قلات کا دورہ کرے گا۔ 14 راپریل کو کرنل شاہ کوئٹہ آیا۔ اس کی خان قلات سے ملاقات ہوئی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ خان بدستور اپنی طاقت کے نشے میں تھا جبکہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات ابھی تک کشیدہ تھے۔ افغانستان کو شکایت تھی کہ پاکستان اس کی بیرونی تجارت میں مشکلات پیدا کر رہا ہے اور پاکستان کو شکوہ تھا کہ افغانستان نام نہاد ''پختونستان'' کے حق میں پروپیگنڈا کر کے پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔

قاضی عیسیٰ کی مسلم لیگ کونسل نے 12 رمئی کو ایک قرارداد میں پاکستان کے خلاف افغانستان کے ''غیر اسلامی'' گمراہ کن اور جھوٹے پراپیگنڈے کی مذمت کی اور اسے متنبہ کیا کہ وہ اپنی اس قسم کی ''ناپاک سرگرمیوں'' سے اجتناب کرے۔ کونسل نے ایک اور قرارداد میں قاضی عیسیٰ

کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا جس کے پیش نظر قاضی نے وہیں اپنا 17 / اپریل کا استعفیٰ واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ قاضی عیسیٰ کی پہلے استعفیٰ دینے اور پھر اسے واپس لینے کی یہ کاروائی پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کے 22 / فروری 1950ء کے بیان کے سراسر منافی تھی اس لئے صوبہ میں اس کے مخالف لیگی دھڑے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ صوبہ لیگ کھلم کھلا دو معاندانہ دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

یہ جماعتی پھوٹ بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ پنجاب میں نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کے دھڑوں کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ جس طرح پنجاب میں گورنر موڈی نواب ممدوٹ کے خلاف ممتاز دولتانہ کی پشت پناہی کرتا تھا اسی طرح بلوچستان میں ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین قاضی عیسیٰ کے خلاف ملک جان محمد کی زیر قیادت قائم شدہ ''آئینی دھڑے'' کی پس پردہ حمایت کرتا تھا۔ جس طرح پنجاب میں ممدوٹ گروپ کو شکایت تھی کہ دولتانہ گروپ نے صوبہ لیگ کی رکن سازی میں بہت دھاندلی اور جعل سازی کی ہے اسی طرح بلوچستان میں ملک جان محمد کے ''آئینی گروپ'' کو شکوہ تھا کہ قاضی عیسیٰ کے گروپ نے لیگ کی رکن سازی میں بہت بدعنوانیاں کی ہیں تاکہ آئندہ انتخابات میں اس کی پارٹی برسر اقتدار آئے۔

25 / مئی کو بلوچستان کی مشاورتی کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں ایک قرارداد کے ذریعے اشارۃً ایجنٹ گورنر جنرل کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''کونسل نے ماضی میں جو قراردادیں منظور کی تھیں حکومت نے ان پر عمل درآمد کے سلسلے میں کبھی کوئی اطلاع نہیں دی۔ اگر کونسل کی سفارشات پر عمل نہیں ہونا تو پھر اس کے اجلاس منعقد کئے جانا بے سود ہو گا۔''[8] اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح پنجاب میں ممدوٹ دھڑے نے اپنی صوبائی سیاست کی بنیاد پنجابی شاونزم، وزیر اعظم لیاقت علی خان کی پنجاب دشمنی اور گورنر موڈی کی مخالفت پر رکھی تھی، اسی طرح قاضی عیسیٰ کا دھڑا ابھی بلوچستان میں ملکی اور غیر ملکی کے سوال اور پنجابی ایجنٹ گورنر جنرل کی مخالفت کے زور پر اپنا کاروبار جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اگرچہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنی امریکہ کے لئے روانگی سے قبل یہ عندیہ دے دیا تھا کہ وہ بیوروکریسی اور قبائلی سرداروں کو قاضی عیسیٰ کے گروپ پر ترجیح دے گا تاہم قاضی عیسیٰ کو پنجابی شونسٹوں کے برعکس اس پر براہ راست سیاسی حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بلوچستان میں پٹھانوں اور

بلوچیوں کا درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا اور صوبہ کی انتظامیہ وتجارت پر پنجابیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں یعنی ''تلیئروں'' کا قبضہ تھا۔مزید براں خان قلات کی قبائلی فیڈریشن کے نواب محمد خان جوگیزئی کی قبائل فیڈریشن سے الحاق کے بعد قبائلی سرداروں کی سیاسی قوت میں بہت اضافہ ہوگیا تھا اور وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان محض قاضی عیسیٰ کی خاطر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی ایک خاندانی جاگیردار کی حیثیت سے پورے ملک میں اس کی پالیسی سامراج نواز جاگیرداروں، ریاستی نوابوں، قبائلی سرداروں اور دقیانوسی ملاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی تھی۔

اپنی اس پالیسی کے تحت لیاقت علی خان نے 6 رجنوری 1950ء کو پاکستان دستور ساز اسمبلی سے ریاستی مذاکراتی کمیٹی کی رپورٹ منظور کروائی جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ ریاست بہاولپور اور بلوچستانی ریاستیں اپنا ایک ایک نمائندہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بھیج سکتی ہیں اور ان نمائندوں کا انتخاب ریاستی نواب کریں گے۔لیاقت علی خان کی اس تحریک پر بحث کے دوران میاں افتخار الدین نے اپنی تقریر میں ریاستی نوابوں کو ''عوام دشمن، استبدادی، غدار اور بدمعاش'' قرار دے کر مطالبہ کیا تھا کہ ''مجوزہ دو نمائندوں کے انتخاب کا حق ان نوابوں کی بجائے ریاستی عوام کو ملنا چاہیے۔'' لیکن نوابزادہ لیاقت علی خان نہیں مانا تھا۔اس کا قانونی مؤقف یہ تھا کہ چونکہ یہ ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے صرف دفاعی، خارجی اور مواصلاتی امور سے دستبردار ہوئی ہیں اس لئے حکومت پاکستان باقی سارے امور کے بارے میں ان ریاستوں کی حکومتوں سے ہی بات چیت کرسکتی ہے۔اس کی مزید رائے یہ تھی کہ ریاستوں میں جمہوریت کی جانب بڑی احتیاط سے قدم اٹھانا چاہیے کیونکہ وہاں مسلم لیگ کا کوئی وجود نہیں ہے۔کراچی کے روز نامہ ڈان نے دستور ساز اسمبلی کی اس بحث پر ادارتی تبصرہ کرتے ہوئے میاں افتخار الدین پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا کہ ''جو لوگ ریاستوں کو فوری طور ختم کرنے کی وکالت کرتے ہیں وہ دراصل اہم سٹریٹیجک (Strategic) علاقوں میں گڑ بڑ پیدا کر کے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ 2رمئی 1949ء کی نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق حکومت پاکستان بلوچستانی ریاستوں کے مظلوم عوام پر نوابوں کی آہنی گرفت برقرار رکھے گی کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان سٹریٹیجک علاقوں میں بدامنی پھیلے گی۔

ریاستی نوابوں اور قبائلی سرداروں کی اس آہنی گرفت میں قاضی عیسیٰ کی سیاسی تدبیر یہ تھی کہ اگر صوبہ میں جمہوری اصلاحات اور ملکی وغیر ملکی کے سوالات اٹھائے جاتے رہیں تو بلوچستان میں اسے بھی اسی طرح بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی جیسے کہ صوبہ سندھ میں محمد ایوب کھوڑو کو 1948ء کے اوائل میں اپنی برطرفی کے بعد حاصل ہو گئی تھی۔ تاہم جب 7رجون کو گورنر جنرل پاکستان کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ بلوچستان مشاورتی کونسل کی معیاد، جو 11رجون 1950ء کو ختم ہونے والی ہے، 31ء جولائی 1950ء تک بڑھادی گئی ہے تو قاضی عیسیٰ اپنی اس تدبیر کو زور شور سے بروئے کار نہ لا سکا۔ اسے بلاوجہ یہ امید لگی رہی کہ جب وزیر اعظم لیاقت علی خان جولائی کے وسط میں امریکہ و کینیڈا کے دورے سے واپس آئے گا تو وہ بلوچستان میں سیاسی بالادستی کے مسئلہ کا فیصلہ اس کے حق میں کرے گا۔ غالباً اس کی اس موہوم امید کی بنیاد پاکستان دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین کی 8رجون کو فورٹ سنڈیمن کے ایک جلسہ عام میں کی گئی اس تقریر پر تھی کہ ''مسلم لیگ ہی واحد جماعت ہے جس کے پرچم تلے پاکستان کے عوام متحد رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنے ملک اور خود اپنے مفاد میں مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے۔'' قاضی عیسیٰ نے اس جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ بلوچستان کو گورنری صوبہ بنایا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ ''ہمارے اس مطالبہ کو صوبہ پرستی سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اولین طور پر پاکستانی ہیں۔ ہم حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ بالکل اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کہ ایک بچہ اپنے والد سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے دوسرے بھائیوں کے برابر حصہ دیا جائے۔ اب ہمارے صوبہ میں تعلیم حاصل کرنے کے رجحان میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور اس طرح بلوچستانیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ سیاسی اصلاحات کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔''[9]

چونکہ قاضی عیسیٰ کا یہ مطالبہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت اور اس کی بیوروکریسی کی متذکرہ پالیسی کے منافی تھا اس لئے اس کے اور ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین کے درمیان ''اصولی اختلافات'' میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جولائی کے اوائل میں اے۔ جی۔ جی کے مشیر دوئم (Second Advisor) سردار نور محمد گولا نے ایک بیان میں قاضی عیسیٰ کے مطالبہ اصلاحات کی اس بنا پر مخالفت کی کہ بلوچستان آئینی اصلاحات میں انقلابی

پیش قدمی کے لئے ابھی پوری طرح تیار نہیں ہے اور اسے سیلف گورنمنٹ سے پہلے درمیانی مراحل طے کرنے چاہئیں۔'' قاضی عیسیٰ نے پہلے تو فوراً سردار گولا کے اس غیر جمہوری مؤقف کی مذمت کی اور پھر 11 رجولائی کو ایک بیان میں اس نے مقامی انتظامیہ پر اس الزام کے تحت نکتہ چینی کی کہ اس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی امریکہ سے براستہ ایران کوئٹہ میں 12 رجولائی کو متوقع آمد پر استقبال کے انتظامات کرتے ہوئے مسلم لیگ سے تعاون نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم کی آمد کے بارے میں بھی سرکاری طور پر مسلم لیگ کو مطلع نہیں کیا گیا اور مسلم لیگ سے یہ بھی نہیں کہا گیا کہ وہ خیر مقدمی انتظامات میں امداد کرے۔''[10] اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ قاضی محمد عیسیٰ ایجنٹ گورنر جنرل کی نظر میں اب ایک ناپسندیدہ شخصیت بن گیا تھا اور اب بلوچستان سے اس کی بے دخلی ناگزیر تھی۔ قاضی عیسیٰ کی پشت پر کوئی طاقتور درمیانہ طبقہ نہیں تھا اور سارے پنجابی وتلیئر اپنے سرپرست ایجنٹ گورنر جنرل کے ساتھ تھے۔

لیاقت علی خاں نے نوابوں، سرداروں اور بیوروکریسی کے مدمقابل بلوچستان مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا

لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے اگست کے اوائل میں اس سارے جھگڑے کے بارے میں اپنے نامہ نگار کی ایک طویل رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح ''گزشتہ ایک سال میں قاضی محمد عیسیٰ کے ایک وقت صوبہ لیگ کی صدارت اور ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورت کے عہدوں پر بالاصرار قائم رہنے سے بلوچستان میں نہ صرف مسلم لیگ کے وقار کو نقصان پہنچا ہے بلکہ قاضی عیسیٰ اور ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کے درمیان کتے بلی کی لڑائی ہوئی ہے۔ قاضی عیسیٰ صوبہ کی انتظامیہ پر مکمل کنٹرول حاصل کر کے ایجنٹ گورنر جنرل کو محض آئینی سربراہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور اے۔ جی۔ جی جو پاکستان کے ضدی اعلیٰ افسروں میں شمار ہوتا ہے، ایسی ساری کوششوں کی بڑی سختی کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے۔ لیگ کے ایک سرکردہ رکن کے بیان کے مطابق ان دونوں کے درمیان اس رسہ کشی سے انتظامیہ کی کارگردگی پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ یہ دونوں نوجوان ہیں اور کتوں بلیوں کی طرح لڑ رہے ہیں...... جن لوگوں کو بلوچستان کے معاملات میں دلچسپی ہے وہ ان دونوں کی تلخ لڑائی سے بہت فکرمند ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ

کسی طرح اس تنازعہ کا تصفیہ ہو جائے۔ بعض حلقے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ قاضی عیسیٰ کو کوئی سفارتی عہدہ مل جائے لیکن ابھی تک ان کی اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دریں اثناء قاضی عیسیٰ اپنا بیشتر وقت کراچی میں گزارتا ہے حالانکہ اس کے کام کی جگہ بلوچستان میں ہے......اس سارے جھگڑے میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کا رویہ بھی عجیب وغریب ہی رہا ہے۔ جب جون 1949ء میں بلوچستان مشاورتی کونسل کی تشکیل ہوئی تھی اور قاضی عیسیٰ اس کا سینیئر رکن بن گیا تھا تو یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اب چونکہ قاضی سرکاری عہدہ پر فائز ہو گیا ہے اس لئے اسے مرکزی لیگ کے فروری 1948ء میں منظور کردہ آئین کے مطابق صوبہ لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ مگر جب قاضی عیسیٰ بیک وقت دونوں ہی عہدوں پر فائز رہنے پر مصر رہا تو مرکزی لیگ کی مغربی پاکستان کمیٹی نے اس مسئلہ پر غور کر کے نومبر 1949ء میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ چونکہ مشیر کو وزیر کی طرح کے انتظامی اختیارات حاصل ہیں۔ اس لئے اس کا صوبہ لیگ کی صدارت پر فائز رہنا مرکزی لیگ کے آئین کی روح کے منافی ہے۔ جب قاضی عیسیٰ اس فیصلے کے بعد بھی صدارت سے مستعفی نہ ہوا تو صوبہ لیگ میں قاضی کے مخالفین کے ایک پانچ رکنی وفد نے جنوری 1950ء میں چودھری خلیق الزماں سے ملاقات کی جس کے دوران اس وفد کو بتایا گیا کہ قاضی عیسیٰ نے دونوں ہی عہدوں سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ یہ وفد چودھری خلیق الزماں کے اس بیان سے مطمئن ہو کر واپس بلوچستان پہنچا تو قاضی نے فروری میں اپنی لیگ کونسل کا اجلاس بلا کر صوبہ لیگ کے نائب صدر میر قادر بخش اور جائنٹ سیکرٹری میر نبی بخش کو لیگ سے خارج کروا دیا۔ اس واقعہ کے تقریباً دو ہفتے بعد بلوچستان کے 40 مسلم لیگیوں کے ایک وفد نے کراچی جا کر چودھری خلیق الزماں سے احتجاج کیا تو اس نے اس وفد کو تحریری طور پر یقین دلایا کہ ''آئندہ قاضی عیسیٰ کو صوبہ لیگ کونسل کا اجلاس بلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا اور اب صوبائی کونسل کا اجلاس براہ راست مرکزی لیگ کی نگرانی میں ہوگا۔'' قاضی عیسیٰ پر اس تحریر کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اپریل میں مرکزی لیگ کی مجلس عاملہ نے اسے ایک مرتبہ اور ہدایت کی کہ وہ صوبہ لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو جائے۔ لیکن قاضی نے اس ہدایت کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا اور اس نے جون میں اپنی کونسل سے یہ قرارداد منظور کروالی کہ ''وہ بلوچستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر صدر قائم رہ سکتا ہے۔'' اس پر قاضی کے مخالفین کے ایک تیسرے وفد نے کراچی جا کر چودھری خلیق الزماں سے ملاقات

کی تو اس نے بتایا کہ میں نے قاضی عیسیٰ کے بارے میں پہلے غلط فیصلہ دیا تھا اور لیگ کے آئین کی غلط تعبیر کی تھی۔ آئین کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ کوئی سرکاری عہدیدار لیگ کا عہدیدار نہیں بن سکتا لیکن لیگ کا عہدیدار سرکاری عہدے پر فائز ہوسکتا ہے۔ چنانچہ یہ وفد چودھری خلیق الزماں کی نئی تعبیر سے حیرت زدہ ہوکر واپس بلوچستان آ گیا اور نتیجتاً ایک طرف تو صوبہ لیگ کے اندر زبردست دھڑے بندی جاری ہے اور دوسری طرف قاضی عیسیٰ اور ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین کے درمیان بڑی تلخ لڑائی ہو رہی ہے۔"[11]

31 رجولائی کو گورنر جنرل پاکستان نے بلوچستان کی مشاورتی کونسل کی میعاد میں مزید ایک ماہ کا اضافہ کر دیا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان امریکہ سے واپسی کے بعد اس وقت تک نئی مشاورتی کونسل کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اس نے بیوروکریسی اور قبائلی سرداروں کے زیر اثر یہ فیصلہ تو کر لیا تھا کہ نئی مشاورتی کونسل میں قاضی عیسیٰ اور اس کے حواریوں کا غلبہ نہیں ہوگا لیکن یہ سوال ابھی حل طلب تھا کہ نئی کونسل میں نئے ارکان کون ہوں گے۔ 7 راگست کو کراچی میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی زیر صدارت صوبائی گورنروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں بلوچستان کے اے۔ جی۔ جی میاں امین الدین نے بھی شرکت کی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی اطلاع کے مطابق اس کانفرنس میں عمومی پالیسی، انتظامیہ کی صورت حال اور گورنروں کے ان کے وزرائے اعلیٰ کے ساتھ تعلقات کے مسائل زیر بحث آئے۔ اسی دن قاضی عیسیٰ نے کراچی میں ایک بیان کے ذریعے بلوچستان کی انتظامیہ پر الزام عائد کیا کہ وہ صوبہ میں جمہوریت کو کچل رہی ہے۔ اس نے کہا کہ "میرے اور اے۔ جی۔ جی کے درمیان کوئی ذاتی اختلافات نہیں ہیں۔ میں بلوچستان کے عوام کے لیڈر کی حیثیت سے اس بات کا متمنی ہوں کہ میرے صوبے کو بھی ملک کے دوسرے صوبوں کی سطح کے برابر لایا جائے۔ میں نے مشیر اول (First Advisor) کا عہدہ اپنے پاکستانی بھائیوں پر محض یہ ثابت کرنے کے لئے قبول کیا تھا کہ اب بلوچستان کے عوام آئینی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔ لیکن مقامی بیوروکریسی اس تجربے کی کامیابی کی خواہاں نہیں تھی کیونکہ ان کے لئے اپنے اختیارات سے دستبردار ہونا مشکل تھا۔ اس نے مزید کہا کہ "ایسے حالات میں ہر جگہ اس قسم کے اختلاف کا پیدا ہونا یقینی ہوتا ہے۔ مجھے آمرانہ اختیارات کے استعمال سے نفرت ہے۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا

ہوں کہ جو امور میرے حوالے ہوں میرا ان پر مؤثر کنٹرول ہو۔ میں بیورو کریسی کی خواہش کے مطابق برائے نام کنٹرول نہیں چاہتا۔''

جس دن اخبارات میں قاضی عیسیٰ کا یہ بیان شائع ہوا اسی دن پاکستان ٹائمز میں بلوچستان مسلم لیگ کی سپروائزنگ کمیٹی کے کنوینر ملک ایم۔ ایم عثمان کا ایک خط بھی چھپا جس میں بلوچستان کے ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کے توہین آمیز اور آمرانہ رویے پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔ خط میں تحریک پاکستان میں بلوچستان مسلم لیگ کی خدمات گنوانے کے بعد لکھا تھا کہ ''قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کے عوام کا خیال تھا کہ انہیں بہت جلد مٹھی بھر افسروں کے استبدادی راج سے نجات مل جائے گی۔ اسی لئے صوبہ کے سارے حلقوں کی جانب سے مشاورتی کونسل کی تشکیل کے اعلان کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ لیکن جلد ہی ہماری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور ہر ایک کو محسوس ہونے لگا کہ مشاورتی کونسل کی حیثیت بلوچستان کے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے محض ایک اشک شوئی کی ہے۔ کونسل کی سفارشات بالعموم بے سود ہوتی تھیں اور مشیروں کا تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس قسم کے رویے کو افراد کی توہین تصور کریں لیکن محض ایسا نہیں تھا بلکہ اس طرح مسلم لیگ کے وقار پر ضرب لگائی جا رہی تھی۔ آج کل اے۔ جی۔ جی زیارت کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن وہاں مشیروں کی موجودگی کو ضروری تصور نہیں کیا جاتا۔ کیا کسی دوسرے صوبے میں ایسی توہین برداشت کی جا سکتی ہے؟ مثال کے طور پر کیا صوبہ سرحد کا گورنر اپنے وزیر اعلیٰ سے کہہ سکتا ہے کہ نتھیا گلی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ یہ صرف اول الذکر، اس کے سیکرٹریوں اور دوستوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ جب وزیر اعظم امریکہ کے دورے سے واپسی پر کوئٹہ پہنچا تھا تو اس کے اعزاز میں پارٹی دی گئی تھی۔ اس پارٹی میں سارے سول اور فوجی حکام کو شرکت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن اس میں مسلم لیگی کارکنوں کا تو ذکر ہی کیا مشیر اعلیٰ (چیف ایڈوائزر) کو بھی دعوت نہیں دی گئی تھی حالانکہ اس کا انتظام حکومت نے کیا تھا۔ ان افسوس ناک حقائق کے پیش نظر ہم مرکزی حکومت سے پوچھتے ہیں کہ بلوچستان سے اس ملک کے ایک صوبہ کے طور پر منصفانہ سلوک کیا جائے گا یا نہیں؟ مرکز کی طرف سے یہ عذر پیش کیا سکتا ہے کہ جب تک نیا آئین نافذ نہیں ہوتا اس وقت تک بلوچستان دوسرے صوبوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ موجودہ استبدادی راج کب تک نافذ

رہے گا؟ کیا یہ بلا روک ٹوک جاری رہے گا اور غیر معین عرصے کے لئے ہماری تمناؤں کو کچلتا رہے گا؟ کیا اس صوبے نے پاکستان کے حصول میں دوسرے صوبوں سے کم قربانیاں دی ہیں؟ اگر نہیں؟ تو پھر یہ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیوں ہے؟ گزشتہ دو سال میں بہت سے وفود بیرون ملک گئے ہیں لیکن کبھی کسی وفد میں بھی بلوچستان کو نمائندگی نہیں دی گئی۔ غیر ممالک میں سفارتوں کے معاملے میں بھی ہماری عدم نمائندگی کا یہی حال ہے۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دوسرے صوبے خود مختاری سے مستفیض ہو رہے ہیں اور مرکزی کابینہ میں ان کے وزراء بھی شریک ہیں لیکن مرکز میں بلوچستان کے نصب العین پر زور دینے والا اور اس کی شکایات کا ازالہ کروانے والا کوئی نہیں ہے۔ کراچی مرکزی سیکرٹیریٹ ہو، پاکستان پولیس فورس یا فوج ہو یا ملیشیا ہو، ان سب کے دروازے بلوچستان کے لئے تقریباً بند ہیں۔"[12]

قاضی عیسیٰ کے اس بیان اور اس کے ساتھی ملک عثمان کے اس خط میں تلخ نوائی کی فوری وجہ یہ تھی کہ 6/ اگست کو مرکزی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے، چودھری خلیق الزماں کے اواخر جولائی کے بیان کے برعکس، یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوئی مشیر یا وزیر 22/ اگست کے بعد مسلم لیگ کے کسی عہدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ چونکہ مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی موجودگی میں چودھری خلیق الزماں کی منشا کے خلاف کیا تھا اس لئے قاضی عیسیٰ نے صحیح طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ اب بلوچستان کی سیاست اور انتظامیہ میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہ صوبہ لیگ کی صدارت اور ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورت دونوں ہی سے مستعفی ہو گیا اور اس نے اپنا استعفیٰ صوبہ لیگ کے سیکرٹری کے نام بھیج کر اخبارات میں اس مضمون کی خبر چھپوا دی۔ اس کی جانب سے اس اقدام کی غالباً ایک اور وجہ یہ تھی کہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ 7/ اگست کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کی موجودگی میں گورنروں کی کانفرنس میں اس کے خلاف ایجنٹ گورنر جنرل کے مؤقف کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور رسمی طور پر یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ 31/ اگست کے بعد نئی مشاورتی کونسل میں قاضی عیسیٰ کو شامل نہیں کیا جائے گا اور کونسل میں مسلم لیگ کی بجائے قبائل فیڈریشن کا غلبہ ہوگا۔ اور غالباً تیسری وجہ یہ تھی کہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کا، جو قاضی عیسیٰ کی پشت پناہی کرتا تھا، اس کی سازشی سیاست کی وجہ سے پورے ملک میں وقار ختم ہو چکا تھا اور اس بنا پر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اسے لیگ کی صدارت سے الگ کر کے یہ عہدہ خود سنبھالنے کا فیصلہ

کرلیا تھا۔ چنانچہ 13 راگست کو چودھری خلیق الزماں مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہوگیا۔

22 راگست کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل نے قاضی عیسیٰ کا استعفیٰ منظور کرلیا اور 31 راگست کو بلوچستان کی نئی مشاورتی کونسل کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔ اس مرتبہ کونسل کے ارکان کی تعداد پندرہ کی بجائے بیس تھی۔ اس میں قاضی عیسیٰ شامل نہیں تھا اور اس میں مسلم لیگ کا غلبہ بھی نہیں تھا بلکہ اس میں غیر ملکی (بلوچی) قبائلی سرداروں کی اکثریت تھی۔ کونسل کے نئے ارکان کے نام یہ تھے۔ (1) فدا علی بھائی (2) عاصم ملک (3) ایف۔ بی۔ پٹیل (4) ارباب کرم خان کانسی (5) یحییٰ بختیار بار ایٹ لاء (6) حاجی قادر بخش وانی (7) ملک سید محمد خان کاکڑ (8) حاجی محمد نعیم خان حامد زئی اچکزئی (9) ملک شاہ جہاں خان (10) خان محمد خان ترین (11) خان بہادر باز محمد خان جوگیزئی (12) خان بہادر باز خان بلخیل (13) خان سردار رستم خان جمالی (14) سردار محمد اکبر خان بگٹی (15) خان صاحب حاجی سید جلال شاہ (16) خان بہادر سردار سمندر باروزئی (17) نواب محمد خان جوگیزئی (18) خان بہادر باز گل خان منڈو خیل (19) خان بہادر گلستان خان شیرانی (20) خان بہادر سردار اکبر خان سنجرانی۔

جب یکم ستمبر کے اخبارات میں ان ناموں کی فہرست شائع ہوئی تو صوبائی مسلم لیگ کے حلقوں میں بد دلی اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی مسلم لیگی حکومت بلوچستان مسلم لیگ کو اس طرح پائے حقارت سے ٹھکرا کر عوام دشمن قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں سے کھلم کھلا گٹھ جوڑ کر لے گی اور سامراج نواز بیوروکریسی کو اس قدر سر پر چڑھا لے گی۔ مسلم لیگی حلقوں میں اس مایوسی و بد دلی کا فوری طور پر اظہار اس طرح ہوا کہ صوبہ لیگ نے نئی مشاورتی کونسل سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔ 4 رستمبر کو کراچی کی بلوچستان ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر چودھری محمد امین نے ایک بیان میں اس فیصلے کو غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ ''بلوچستان مسلم لیگ اس صوبہ کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ مسلم لیگ کو مشاورتی کونسل میں جو تھوڑی سی نمائندگی دی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت صوبہ میں اس تنظیم کا مکمل خاتمہ کرنے کے درپے ہے۔ جن خوش قسمت سرداروں کو مشاورتی کونسل میں کافی سے زیادہ نمائندگی دی گئی ہے وہ سب برصغیر کی تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کے بدترین دشمن تھے۔ لیکن اب جبکہ مشاورتی کونسل میں عہدوں کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا ہے تو وہ پاکستان کے

وفادار بن گئے ہیں۔"[13] لیکن 8 ستمبر کو بلوچستان قبائل فیڈریشن کے صدر نواب محمد خان جوگیزئی نے ایک انٹرویو میں مشاورتی کونسل کی تشکیل نو کا خیر مقدم کرتے ہوئے حکومت کو مکمل تعاون کا یقین دلایا۔نواب جوگیزئی نے امید ظاہر کی کہ "نئی کونسل، جس نے سیلف گورنمنٹ کے لئے راستہ ہموار کر دیا ہے، بلوچستان میں اپنی عوامی ذمہ داریاں پوری کرے گی اور اس کے سارے ارکان پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے لئے مسلسل کام کریں گے۔"[14] یہ وہی نواب محمد خان جوگیزئی تھا جسے پہلی مشاورتی کونسل میں بھی نامزد کیا گیا تھا لیکن اس نے اس بنا پر اس کونسل کا مسلسل بائیکاٹ کیا تھا کہ اس میں مسلم لیگی ارکان کی اکثریت تھی اور قاضی عیسیٰ کو چیف ایڈوائزر کا اعزاز دیا گیا تھا۔

نوائے وقت کو بلوچستان میں صرف پنجابی مفادات کی فکر تھی، اسے وہاں کے عوام کے جمہوری حقوق کی پامالی سے کوئی سروکار نہ تھا

لاہور کے اخبار نوائے وقت کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ بلوچستان میں مسلم لیگ کو ٹھکرا کر قبائلی سرداروں کو نوازا گیا ہے۔اسے سخت شکایت تھی کہ "بلوچستان میں ایجنٹ گورنر جنرل کی امداد کے لئے جو مشاورتی کمیٹی مقرر کی گئی ہے اس کے ارکان میں ایک بھی پنجابی کو نہیں لیا گیا۔یعنی اس صوبہ کی پانچ لاکھ آبادی میں سے 60 ہزار باشندے 5 فیصدی نیابت کے مستحق بھی نہیں سمجھے گئے۔" نوائے وقت نے اپنی اس شکایت کا اظہار "صوبائی تعصب کی لعنت" کے زیر عنوان ایک ایسے اداریے میں کیا جسے بذات خود صوبائی تعصب اور سیاسی کوتاہ اندیشی کی بدترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔اس نہایت بدبودار اداریے میں صوبائی تعصب کی مخالفت کی آڑ لے کر صوبائی تعصب پھیلایا گیا تھا اور اس طرح وطن عزیز کی سالمیت پر کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ اداریے میں لکھا تھا کہ "ہم صوبائی تعصب پر لعنت بھیجتے ہیں اور کسی کے لئے محض پنجابیت یا بنگالیت کی بناء پر کوئی حق نہیں مانگتے۔لیکن اگر کوئی شخص قابلیت اور سابقہ خدمات کے لحاظ سے کسی عہدہ یا منصب کے ہر طرح اہل ہے تو اسے محض اس لئے اس منصب سے محروم رکھنا کہ وہ کسی خاص صوبہ سے تعلق رکھتا ہے یا کسی خاص صوبہ سے تعلق نہیں رکھتا ہے، کس طرح جائز اور مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے؟ انتخاب کا معیار قابلیت وصلاحیت اور سابقہ خدمات کا ریکارڈ ہونا چاہیے نہ کہ پنجابی ہونا یا پنجابی نہ ہونا۔صوبائی تعصب کے مجرم وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو اس کی مذمت کرتے ہیں

نگران کے دلوں میں کدورت بھری ہے اور وہ اپنے صوبہ کے افراد کے سوا کسی دوسرے صوبہ کے لوگوں کو کسی اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتے حالانکہ پاکستان کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور برابر ہیں۔ ان میں سندھی، پنجابی اور بنگالی کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہمیں اعتراض اس پر ہے کہ ایڈوائزری کونسل میں اس قسم کی تخصیص سرے سے روا ہی کیوں رکھی گئی؟ بوہروں، پارسیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کے نام پر نامزدگیاں کیوں ہوئیں؟ چودھری خلیق الزماں کے ایک ہم زلف کی ممبری کے لئے یو۔ پی کے ایک ہزار افراد کی نمائندگی کا ڈھونگ کیوں رچایا گیا جبکہ ساٹھ ہزار پنجابیوں کو جو سالہا سال سے بلوچستان میں رہتے ہیں اور ''بلوچستانی'' بن چکے ہیں، اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ انہیں ایک نشست بھی دی جاتی۔ حالانکہ سب کو اقرار ہے کہ وہ بلوچستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمیں اعتراض اس پر نہیں کہ کسی بوہرے یا بلوچ یا پٹھان کو کیوں ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ وہ بھی ہمارے بھائی ہیں۔ اگر سبھی ممبر بلوچ یا پٹھان ہوتے تو بھی ہم کوئی اعتراض نہ کرتے بشرطیکہ معیار انتخاب قابلیت وصلاحیت ہوتا نہ کہ قابلیت اور صوبائیت۔''[15]

مدیر نوائے وقت نے جب یہ اداریہ لکھا تو اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کے دل میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خلاف کس قدر کدورت بھری ہوئی ہے۔ وہ قلم سے تو صوبائی تعصب کی مذمت کرتا تھا لیکن دراصل وہ پنجابیوں کے سوا کسی دوسرے صوبے کے لوگوں کو کسی اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتا تھا حالانکہ پاکستان کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور برابر ہیں۔ ان میں سندھی، پنجابی اور بنگالی کی کوئی تخصیص نہیں۔ چونکہ بظاہر اس کا معیار انتخاب قابلیت وصلاحیت تھا اس لئے اگر اس کے معیار پر عمل کیا جاتا تو بلوچستان کی مشاورتی کونسل میں پنجابیوں کے سوا کسی اور کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ کیونکہ اس کے اپنے دعوے کے مطابق پنجابی بلوچستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ مدیر نوائے وقت کو یہ زہریلا اداریہ لکھتے ہوئے اس حقیقت کا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ بلوچستان کی انتظامیہ کے سارے شعبوں میں پنجابیوں کی تقریباً اجارہ داری تھی۔ اس کی انتظامیہ کا سربراہ لاہور کا ایک نہایت فرعون مزاج بیوروکریٹ تھا جو بلوچوں اور پٹھانوں کو حقیر سمجھتا تھا اور ان کا تمسخر اڑاتا تھا۔ صوبہ کی پولیس فورس ساری کی ساری پنجابیوں پر مشتمل تھی اور دوسرے سارے محکموں میں بھی پنجابیوں کی بہت بھاری اکثریت تھی۔ اس پنجابی راج کے خلاف مقامی عوام الناس کے غم وغصہ کا

اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا لیکن کبھی ان کی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔

جون 1950ء میں جب صوبہ میں متعدد پنجابی نوجوانوں کا جونیئر اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹوں کے طور پر تقرر ہوا تھا تو مقامی سیاسی حلقوں کی طرف سے اس قدر احتجاج کیا گیا تھا کہ میاں امین الدین کی حکومت کو بذریعہ سرکاری اعلان اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا پڑی تھی۔ اس اعلان میں صوبائی حکومت کا مؤقف یہ تھا کہ ''اگر پنجاب کا کوئی افسر پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحانات پاس کرنے کے بعد بلوچستان میں مقرر ہو جاتا ہے تو اس سے کسی صورت میں صوبہ کو نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بلوچستان کا کوئی افسر بھی جس نے ان امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہو، پنجاب میں مقرر ہو جائے۔''[16] نوائے وقت کے مفاد پرست اور تنگ نظر ایڈیٹر کے متذکرہ اداریے اور بلوچستان میں پنجابی بیوروکریسی کی حکومت کے اس بیان میں منطق بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ تقسیم ہند سے قبل پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی ہوتی تھی۔ جب 1921ء کے بعد سر فضل حسین نے پہلے صوبہ کے تعلیمی اداروں و بلدیاتی اداروں میں اور صوبائی حکومت کے سارے محکموں میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کرائی تھیں تو لالہ لاجپت رائے، راجہ نریندر ناتھ اور ماسٹر تارا سنگھ کی زیر قیادت تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ ہندوؤں اور سکھوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ سارے ہندو اور سکھ سیاسی لیڈر اور اخبارات فرقہ وارانہ تعصب پر ''لعنت'' بھیجتے تھے اور یہ مطالبہ کرتے تھے کہ معیار انتخاب قابلیت وصلاحیت ہونا چاہیے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مفاد پرست عناصر کی مسلمانوں کے بارے میں، جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی لحاظ سے بہت پسماندہ تھے، یہ کوتاہ اندیشی و تنگ دلی بالآخر برصغیر کی تقسیم کا باعث بنی تھی اور اب قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد پنجاب اور کراچی کے مفاد پرست عناصر کی بلوچوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بنگالیوں کے بارے میں، جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی لحاظ سے بہت پسماندہ تھے، ویسی ہی کوتاہ اندیشی اور تنگ دلی نوزائیدہ مملکت پاکستان کی سالمیت و یکجہتی کی بیخ کنی کر رہی تھی۔ جس طرح متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے مفاد پرست عناصر برطانوی سامراج سے آزادی اور سیکولر انڈین نیشنلزم کے گمراہ کن نعرے لگا کر پسماندہ مسلمانوں کا ہر شعبۂ زندگی میں استحصال جاری رکھنا چاہتے تھے اسی طرح پاکستان میں پنجاب اور کراچی کے مفاد پرست عناصر

اسلام اور مسلم قومیت کے گمراہ کن نعرے لگا کر بلوچستان، سندھ، صوبہ سرحد اور مشرقی بنگال کے پسماندہ عوام کا ہر شعبۂ زندگی میں استحصال کرنے کے درپے تھے۔ یہ پاکستانی مفاد پرست عناصر اس احساس وشعور سے عاری تھے کہ ان کی کم ظرفی زود یا بدیر وطن کی تباہی و بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ عناصر ہر اس شخص کو اسلام دشمن اور غدار قرار دیتے تھے جو ان کے اس وطن دشمن رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تھا۔

باب: 10

بلوچستان میں لیاقت علی خان کی غیر جمہوری پالیسی۔2

پنجابی ایجنٹ گورنر جنرل نے نئی مشاورتی کونسل کو استعمال کر کے پنجابی آباد کاروں کے لئے مراعات کا بندوبست کیا

بلوچستان کی مشاورتی کونسل کے ارکان کو کوئی سیاسی یا انتظامی اختیارات حاصل نہیں تھے۔ان کی حیثیت محض پالیسی مشیروں کی تھی اور ایجنٹ گورنر جنرل کے لئے یہ لازم نہیں تھا کہ وہ ان کے مشورے پر عمل کرے۔اس برخود غلط اور بے لگام افسر نے 50-1949ء میں قاضی عیسیٰ کی سربراہی میں نامزد شدہ مشاورتی کونسل کے کسی مشورے پر کبھی عمل نہیں کیا تھا۔اسی بنا پر قاضی عیسیٰ اپنی سیاسی بزدلی اور موقع پرستی کے باوجود وقتاً فوقتاً بیوروکریسی کی مطلق العنانیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے صوبہ کے لئے جمہوری اصلاحات کا مطالبہ کیا کرتا تھا۔لیکن اس کی یہ ''گستاخی'' صوبہ میں اس کی سیاسی موت کا باعث بنی۔جب 31 اگست کو ایجنٹ گورنر جنرل کی حسب منشا نئی مشاورتی کونسل کا اعلان ہوا تو اس کے دو ایک دن بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ قاضی عیسیٰ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں پاکستان کے ایک مندوب کی حیثیت سے نیو یارک جائے گا۔وزیر اعظم لیاقت علی خان کا یہ فیصلہ کھلم کھلا سیاسی رشوت کی حیثیت کا حامل تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ قاضی عیسیٰ اپنے احساس محرومیت کے تحت صوبائی خود مختاری اور جمہوری اصلاحات کے نعرے لگا کر ایجنٹ گورنر جنرل اور حکومت پاکستان کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہ کر سکے کیونکہ پنجابی راج کے خلاف بلوچستانی عوام کو کسی وقت بھی مشتعل کیا جا سکتا تھا۔

6 ستمبر کو قاضی عیسیٰ کی کوئٹہ سے روانگی کے دس بارہ دن بعد 18 ستمبر کو بلوچستان کی نئی مشاورتی کونسل کا چار روزہ اجلاس شروع ہوا۔ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین نے کونسل کے

پہلے اجلاس کی صدارت کی اور اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ''بلوچستان کونسل اس لئے قائم کی گئی ہے کہ یہاں کے عوام صوبہ کی انتظامیہ میں حصہ لیں۔ اس مقصد کے تحت کونسل کے ارکان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ انتظامیہ کی ترقیاتی سکیموں اور قانون سازی کے پالیسی معاملات کے بارے میں قراردادوں کی صورت میں مشورے دیں۔ انتظامیہ ان مشوروں کا اچھی طرح جائزہ لے گی اور وہ مالی امور کے بارے میں کونسل سے تجاویز طلب کرے گی۔'' میاں امین الدین نے افسوس کا اظہار کیا کہ ''سابقہ کونسل اس کی توقع پر پوری نہیں اتری تھی کیونکہ اس کے ارکان نے حسب ہدایت اپنے گردونواح کے معاشرتی اور معاشی اور زرعی مسائل کا جائزہ لے کر اپنے فرائض کامیابی سے ادا نہیں کئے تھے۔'' کونسل کا یہ چارروزہ اجلاس 23 ستمبر کو ختم ہوا جبکہ اس نے صوبہ کے 2 کروڑ 94 لاکھ روپے کے اس سالانہ بجٹ کی ''منظوری'' دے دی جس کی منظوری پہلے ہی حکومت پاکستان کی جانب سے دی جا چکی تھی۔ اس بجٹ میں صوبہ کی آمدنی کا تخمینہ 45 لاکھ روپے تھا۔ اخراجات کی پہلی مد میں 42 لاکھ 87 ہزار روپے کی رقم قبائلی علاقے کے لئے مخصوص کی گئی تھی لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اس رقم میں سے کتنی رقم قبائلی سرداروں کو بطور الاؤنس دی جائے گی۔ اخراجات کی دیگر مدات میں اخراجات کا تخمینہ حسب ذیل تھا۔

(1	آبپاشی و دیگر ترقیاتی منصوبے	46 لاکھ 6 ہزار روپے
(2	سرحدی ملیشیا	39 لاکھ 86 ہزار روپے
(3	جنرل ایڈمنسٹریشن اور ریونیو	25 لاکھ روپے
(4	تعلیم	14 لاکھ 45 ہزار روپے
(5	زراعت	12 لاکھ 22 ہزار روپے
(6	میڈیکل وصحت عامہ	8 لاکھ 59 ہزار روپے

مشاورتی کونسل نے اس سالانہ بجٹ پر چار دن تک غور وخوض کیا لیکن 23 ستمبر کو اس کی منظوری دیتے وقت اس میں کوئی خاص ردوبدل کرنے کا مشورہ نہ دیا۔ اس کا صرف ایک چھوٹا سا مشورہ یہ تھا کہ پولٹری فارمنگ کے لئے جو 28500 روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے اس میں 14 ہزار روپے کی تخفیف کر دی جائے کیونکہ اس شعبہ میں کسی توسیع وترقی کا امکان نہیں ہے۔ آبپاشی اور دیگر ترقیاتی منصوبوں کی مد میں 46 لاکھ روپے کی رقم کی تخصیص کا مقصد ایک نہر کی

کھدائی کر کے بہت سے بنجر علاقے کو زیر کاشت لانا تھا۔خیال یہ تھا کہ اس علاقے میں سے کچھ رقبہ نہ صرف ان پندرہ بیس ہزار پنجابی مہاجرین کو الاٹ کر دیا جائے گا جو اگست 1947ء کے بعد بلوچستان آ کر آباد ہو گئے تھے اور مشرقی پنجاب میں اپنی متروکہ اراضی کے عوض اس صوبہ میں اراضی مانگتے تھے بلکہ اس نئے نہری علاقے میں پنجاب کے بہت سے دوسرے آباد کاروں کو بھی خاصا رقبہ دیا جا سکے گا کیونکہ کہا جاتا تھا کہ بلوچستان کے بیشتر قبائلی اور خانہ بدوش عوام کو کسی ایک جگہ قیام کر کے کاشت کاری کا تجربہ نہیں ہے۔ چنانچہ بظاہر اسی خیال کے تحت 11 ر اکتوبر کو گورنر جنرل پاکستان کی جانب سے بلوچستان کے مستجار علاقوں کے بارے میں ایک حکم جاری کیا گیا جس میں قرار دیا گیا تھا کہ ان علاقوں میں جو قوانین، قواعد اور احکامات پہلے سے نافذ تھے وہ 14 ر اگست 1947ء کے بعد سے بدستور نافذ ہیں اور آئندہ بھی نافذ رہیں گے۔اسی دن حکومت پاکستان کے ایک غیر معمولی گزٹ میں ایک ریگولیشن کے نفاذ کا اعلان کیا گیا جس کے تحت بلوچستان کے ایجنٹ گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ متروکہ اراضی کے بارے میں مہاجرین کے دعاوی کی رجسٹریشن کے لئے سیٹلمنٹ اور اسٹنٹ سیٹلمنٹ افسر مقرر کر سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایجنٹ گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اس ریگولیشن کے زور پر بلوچستان میں پنجابی غلبہ کو مستحکم کر سکتا تھا حالانکہ اس غلبہ کے خلاف بلوچستانی عوام میں پہلے سے ہی غم وغصہ پایا جاتا تھا۔

ریفارمز انکوائری کمیٹی کا تقرر کر کے بلوچستان کی سیاسی اصلاحات کے معاملہ کو کھٹائی میں ڈال دیا گیا

پنجابی مہاجرین اور آباد کاروں کے حق میں اس قانونی کاروائی کے بعد 14 ر اکتوبر کو پاکستان دستور ساز اسمبلی نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تحریک پر ڈاکٹر محمود حسین کی سربراہی میں ایک پانچ رکنی ریفارمز انکوائری کمیٹی مقرر کی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ بلوچستان کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات کو پیش نظر رکھ کر یہ سفارش کرے کہ آئندہ اس صوبے کے لئے کس قسم کا آئینی وانتظامی ڈھانچہ ہونا چاہیے۔وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جانب سے یہ اقدام بلوچستان کے ان شہری عوام کی اشک شوئی کے لئے کیا گیا تھا جو قیام پاکستان کے بعد پہلے دن سے اپنے صوبہ کے لئے جمہوری اصلاحات کا مطالبہ کر رہے تھے۔وہ بار بار یاد دلاتے تھے کہ

1927ء کے بعد سے آل انڈیا مسلم لیگ مسلسل یہ مطالبہ کرتی رہی تھی کہ بلوچستان کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے مگر اب قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی حکومت اس مطالبہ کی تکمیل نہیں کرتی۔ اس پر کراچی کے ارباب اقتدار کا جواب یہ ہوتا تھا کہ جب تک پاکستان دستور ساز اسمبلی نیا آئین منظور نہیں کر لیتی اس وقت تک بلوچستان میں مکمل جمہوری اصلاحات نافذ نہیں کی جاسکتیں۔ گویا بلوچستان میں رادھا کے ناچنے کے لئے نومن تیل کی ضرورت تھی اور مطلوبہ نومن تیل کی بہم رسانی کے لئے کوئی میعاد مقرر نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم جب بلوچستانی عوام اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور ان کے احساس محرومی میں خطرناک حد تک اضافہ ہونے لگا تو جون 1949ء میں انہیں ایک نامزد مشاورتی کونسل پر ٹرخا دیا گیا اور یہ وعدہ کیا گیا کہ صوبہ میں مکمل جمہوری اصلاحات مرحلہ وار نافذ ہوں گی۔

دو تین ماہ کے بعد جب بلوچستانی عوام کو یہ احساس ہوا کہ انہیں اس نمائشی کونسل کے ذریعے بے وقوف بنایا گیا ہے تو اکتوبر 1949ء میں سرکاری طور پر یہ وعدہ کیا گیا کہ آئندہ کے لئے مشاورتی کونسل اور لوکل باڈیز کے لئے عام انتخابات کرائے جائیں گے اور اس سلسلے میں مناسب انتظامات کرنے کے لئے احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔ مگر اس سرکاری اعلان پر بھی عمل نہ ہوا بلکہ اس کے برعکس 31/اگست 1950ء کو دوسری مشاورتی کونسل میں ایسے دقیانوسی قبائلی سرداروں کا غلبہ قائم کر دیا گیا جو برطانوی سامراج کے رائج کردہ سرداری نظام اور جرگہ سسٹم کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے تھے اور اب اکتوبر 1950ء میں بلوچستان کے لئے ایک ریفارمز انکوائری کمیٹی کا ڈھونگ رچایا گیا۔ قبل ازیں جنوری 1950ء میں دستور ساز اسمبلی کی وساطت سے اسی قسم کی ایک ریاستی مذاکراتی کمیٹی بھی مقرر کی گئی تھی۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان کو بلوچستان اور پاکستان کی ریاستوں میں جمہوری اصلاحات کے نفاذ کے کام میں کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ اس قسم کے کام میں بہت احتیاط اور آہستگی کا قائل تھا۔ اسے پاکستان کے لئے آئین سازی میں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے بلوچستان کے سوا پاکستان کے سارے صوبوں میں عام انتخابات کرائے جائیں گے پھر مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوں گے اور یہ نئی اسمبلی آئین سازی کا کام مکمل کرے گی۔ 15/اکتوبر کو جب وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں اس ریفارمز کمیٹی کی تشکیل کے لئے

تحریک پیش کی تھی تو اس نے اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ ''بلوچستان کی انتظامیہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کی انتظامیہ سے مختلف ہے۔ کوئٹہ کے سوا کسی علاقے میں بھی کوئی بلدیاتی ادارہ نہیں ہے۔ صوبہ تین حصوں میں منقسم ہے اور ان تینوں حصوں میں الگ الگ قوانین رائج ہیں۔ یہاں کی آبادی بھی بہت تھوڑی ہے۔ اس لئے اس صوبہ میں آئینی اصلاحات کے نفاذ سے پہلے اس کے مخصوص سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات کا مفصل جائزہ لینا ضروری ہے۔''
میاں افتخار الدین نے لیاقت علی خان کے اس مؤقف کی پر زور مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں ایسی ہی جمہوری اصلاحات بلا تاخیر نافذ ہونی چاہئیں جیسی کہ ملک کے دوسرے صوبوں میں رائج ہیں۔ اس نے کہا کہ ''جمہوریت کے اصول جگہ بہ جگہ اور وقتاً فوقتاً تبدیل نہیں ہوتے۔'' تاہم افتخار الدین نے لیاقت علی خان کو اس کی وہ تقریر یاد نہ دلائی جو اس نے مارچ 1944ء میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں کی تھی اور جس میں اس نے بلوچستان میں استبدادی نظام حکومت کی مذمت کرتے ہوئے وہاں بلا تاخیر مکمل جمہوری اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ کیا تھا۔ افتخار الدین نے اپنی تقریر میں اس حقیقت کی یاددہانی نہ کرائی کہ حکومت ہندوستان کے سیکرٹری خارجہ سر اولف کیرو نے لیاقت علی خان کی اس تقریر کے جواب میں وہی دلائل دیئے تھے۔ جواب 14 اکتوبر 1950ء کو خود لیاقت علی خان نے پیش کئے تھے۔ گویا اس کے نزدیک بلوچستان میں جس جمہوری اصول کا اطلاق 1944ء میں ہونا چاہیے تھا وہ 1950ء میں ضروری نہیں رہا تھا۔ تاہم روزنامہ ''ڈان'' نے 20 اکتوبر کو اپنے اداریے میں بلوچستان کے لئے ریفارمز انکوائری کمیٹی کی تشکیل کا خیر مقدم کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''اس صوبہ میں آئینی ترقی کے اگلے مرحلے کا انحصار اس کمیٹی کی سفارشات پر ہوگا۔''

24 اکتوبر 1950ء کو اس ریفارمز انکوائری کمیٹی کے صدر ڈاکٹر محمود حسین کو وزیر مملکت بنا دیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ ڈاکٹر محمود حسین کے پاس ریاستوں اور سرحدی علاقوں کے امور کا قلمدان ہوگا۔ یکم نومبر کو اس ریفارمز کمیٹی کے ارکان کوئٹہ پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین سے ملاقات کی اور اس سے اگلے دن قبائلی سرداروں اور مسلم لیگی لیڈروں سے تبادلۂ خیال کیا۔ اسی دن کمیٹی کے صدر ڈاکٹر محمود حسین نے کوئٹہ کے گورنمنٹ کالج کے طلباء کے ایک اجتماع میں تقریر کی جس سے ظاہر ہوا کہ بلوچستان میں اصلاحات کے بارے میں

اس کا نظریہ بھی بیوروکریسی کے سامراجی نظریے سے مختلف نہیں تھا۔ اس کی تقریر یہ تھی کہ اگر بلوچستان پارلیمانی طرز حکومت چاہتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ یہاں آئینی ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیمی و معاشی ترقی بھی ہو۔ گویا وہ اس نظریے کا حامل نہیں تھا کہ صوبہ کی تعلیمی و معاشی ترقی محض بیوروکریسی پر انحصار کر کے نہیں ہو سکتی بلکہ اس مقصد کے لئے ہر سطح پر عنان اقتدار کا عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے۔ تاہم 3 ؍نومبر کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل کا مطالبہ یہ تھا کہ بلوچستان کو گورنری صوبہ بنایا جائے اور اسے مکمل صوبائی خودمختاری دی جائے۔ اسی دن جب ریفارمز کمیٹی کے ارکان چمن پہنچے تو وہاں بھی عوام الناس کا یہی مطالبہ تھا۔ لیکن 5 ؍نومبر کو ڈان کے نمائندہ کی کوئٹہ سے رپورٹ یہ تھی کہ ریفارمز انکوائری کمیٹی کے ارکان کے بلوچستان میں پہلے مطالعاتی دورے سے یہ احساس ہوا ہے کہ بلوچستانی عوام کی امنگوں کی تکمیل سے پہلے بہت سی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مشکلات پر عبور حاصل کرنا ہوگا۔

اگرچہ ڈان کی اس رپورٹ میں ان سیاسی، معاشی اور معاشرتی مشکلات کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی جو صوبہ میں سیاسی اصلاحات کے راستے میں حائل تھیں لیکن سارے سیاسی مبصرین کو معلوم تھا کہ ریفارمز کمیٹی کے روبرو سیاسی و معاشرتی مشکلات یہ تھیں کہ قبائلی سردار اپنے سرداری نظام، جرگہ سسٹم اور دیرینہ رسوم و روایات کو جوں کا توں برقرار رکھنے پر مصر تھے۔ چونکہ ان دنوں پاکستان اور افغانستان کے درمیان سخت کشیدگی پائی جاتی تھی، اس لئے وہ حکومت پاکستان کو بلیک میل کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر صوبہ میں جمہوری اصلاحات نافذ کر کے ان کے سیاسی اور معاشرتی اختیارات میں کمی کی گئی تو افغانستان کے نزدیک سرحدی علاقے میں امن و امان قائم نہیں رہ سکے گا۔ معاشی مشکل یہ تھی کہ نہ تو حکومت پاکستان نے اور نہ ہی کسی سرمایہ دار نے اس صوبہ میں صنعت کاری کا کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ زرعی ترقی منصوبہ بھی اس چھوٹے سے علاقے تک محدود تھا جہاں تک سندھ سے نہر کا پانی پہنچ سکتا تھا۔ زیادہ تر قبائلی عوام بھیڑ بکریاں پال کر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور ایجنٹ گورنر جنرل کی انتظامیہ کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس سٹریٹیجک علاقے میں قبائلی سرداروں کو سنڈیمن سکیم کے تحت الاؤنس اور دوسری مراعات دے کر امن و امان قائم رکھا جائے۔ غریب عوام الناس کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی ترقی کا کام انتظامیہ کے اس مقصد میں شامل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی سامراج کا تربیت یافتہ ایجنٹ گورنر جنرل

میاں امین الدین شہروں کے مسلم لیگی لیڈروں کے مقابلے میں قبائلی سرداروں کو ترجیح دیتا تھا اور قبائلی علاقوں کے غریب عوام سے رابطہ قائم کرنے کی بجائے صرف سرداروں سے تعلق برقرار رکھنے پر اکتفا کرتا تھا۔ ریفارمز کمیٹی کے کوئٹہ میں آنے سے تین چار دن پہلے 27 ر اکتوبر کو اس نے نواب محمد خان جوگیزئی کی دعوت پر لورالائی میں جلال زئی جرگہ کو خطاب کیا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کی حکومت جلال زئی قبیلہ کو فراخدلی سے تقاوی قرضے دے گی اور قبائلیوں کو حکومت کی جانب سے بندوقیں مہیا کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے تا کہ وہ سٹریٹیجک علاقے کا دفاع کر سکیں۔

ڈان میں متذکرہ رپورٹ 6 ر نومبر کو چھپی تھی اور اسی دن وزیراعظم لیاقت علی خان کی اس تقریر کی رپورٹ شائع ہوئی تھی جو اس نے 5 ر نومبر کو پشاور سے کوئٹہ پہنچ کر ایک جلسہ عام میں کی تھی۔ وزیراعظم نے اس تقریر میں بلوچستان کی اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''محض آئینی تبدیلیوں سے، خواہ کتنی ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں، عوام الناس کو اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک اسمبلیوں، سیاسی جماعتوں اور انتظامیہ میں عوام کے نمائندے دیانت داری اور مکمل احساس ذمہ داری کے ساتھ کام نہ کریں۔''[1] اس کی اس تقریر کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ بلوچستان میں اصلاح معاشرہ سے پہلے آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کے اس اصول کا اطلاق ملک کے دوسرے صوبوں پر نہیں ہوتا تھا۔ پنجاب میں اس نے ممتاز دولتانہ سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا جو جاگیردارانہ سازشی سیاست کا ماہر تصور کیا جاتا تھا اور جس کے مخالفین نے اسے ''ابلیس سیاست'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ سندھ میں اس نے ایوب کھوڑو سے مصالحت کر لی تھی حالانکہ اس پر رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیوں کے ساتھ الزامات عائد تھے۔ سرحد میں اس نے عبدالقیوم خان سے ملاپ کیا ہوا تھا جو اپنی ہوس اقتدار کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی بدعنوانی اور بددیانتی کو جائز سمجھتا تھا اور مشرقی بنگال میں وہ نورالامین کی پشت پناہی کر رہا تھا جس کی رسوائی و بدنامی اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ وہ کوئی ضمنی انتخاب کرانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ لیاقت علی خان ان سارے صوبوں میں اپنے سیاسی حلیفوں کی سنگین ترین بدعنوانیوں کو نظر انداز کرتا تھا اور خود مرکز میں جاگیردارانہ استبدادیت و آمریت کی راہ پر گامزن تھا لیکن بلوچستان کے عوام سے یہ کہتا تھا کہ محض آئینی اصلاحات سے ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب تک ان کے نمائندے دیانتدار اور ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

6/نومبر کولیاقت علی خان نے کراچی کے لئے روانگی سے پہلے ریفارمز کمیٹی کے ارکان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ روزنامہ ڈان نے اس کھانے کی جو خبر شائع کی اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس کمیٹی نے گزشتہ چھ سات دن میں صوبہ کا تقریباً 700 میل کا جو دورہ کیا ہے اس کے دوران اسے آئینی اصلاحات کے بارے میں متضاد نظریات ملے ہیں۔ مسلم لیگ اور قبائل فیڈریشن مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتی ہیں مگر قبائلی سردار اور شاہی جرگہ کے بعض ارکان جرگہ سسٹم کی تنسیخ کے خلاف ہیں۔ ان میں چند ایک نے تو یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر ان کی مرضی کے خلاف ان کے روایتی اداروں کو ختم کر دیا گیا تو اس کا نتیجہ کھلم کھلا تصادم کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔''[2]
ریفارمز کمیٹی کے ارکان 9/نومبر کو واپس کراچی پہنچے تو ڈاکٹر محمود حسین نے ڈان کی اس خبر کی تصدیق کی۔ اس نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ بلوچستان میں آئندہ کی انتظامیہ کی ہیئت کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کمیٹی اس سلسلے میں عنقریب ایک سوالنامہ جاری کرے گی۔ اخبار نویسوں نے اس کے اس انٹرویو کا مطلب یہ سمجھا کہ بلوچستان میں اصلاحات کا مسئلہ پھر سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہاں کی انتظامیہ غیر معین عرصے کے لئے جوں کی توں رہے گی۔ یہاں تک کہ مشاورتی کونسل کے لئے عام انتخابات کا وعدہ بھی پورا نہیں کیا جائے گا۔ دریں اثناء دستور ساز اسمبلی کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی بھی اپنی عارضی رپورٹ میں یہ سفارش کر چکی تھی کہ فی الحال بلوچستان کے لئے اس کے پرانے چیف کمشنر کے صوبہ کے درجہ کو برقرار رکھا جائے۔ تاہم تقریباً ایک ماہ بعد 4/دسمبر کو کمیٹی نے سوال نامہ جاری کیا اور بلوچستانی تنظیموں اور افراد کو ہدایت کی کہ وہ اپنے جوابات 7/فروری 1951ء تک کمیٹی کے دفتر میں پہنچا دیں۔

سیاسی اصلاحات کو ٹالنے کا بین الاقوامی پس منظر

دستور ساز اسمبلی کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور ریفارمز انکوائری کمیٹی کی جانب سے بلوچستان کے بارے میں اس کاغذی کارروائی کا بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ 21/نومبر کو ضلع کوئٹہ پشین کی چمن سب ڈویژن میں ٹوبہ کاکڑی کے نزدیک پشین سکاوٹس کی افغانستان کی باقاعدہ فوج کے ایک دستے کے ساتھ خونریز سرحدی جھڑپ ہوئی جس کے نتیجہ میں 10 افغان فوجی مارے گئے تھے اور آٹھ پکڑے گئے تھے۔ حکومت پاکستان نے اس واقعہ کے بعد حکومت

افغانستان سے شدید احتجاج کیا تھا اور اسے متنبہ کیا تھا کہ اگر افغانستان کی باقاعدہ فوج نے پاکستان کی حدود میں داخل ہو کر اپنی کاروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ پاکستان کی احتجاجی مراسلے میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ''جون 1950ء کے بعد چار ماہ کے دوران افغان لیویز پاکستان کی حدود میں چار بڑے حملے کر چکی ہے۔''
حکومت امریکہ نے بھی بلوچستان کی سرحد پر 21/نومبر کے اس واقعہ کا فوراً نوٹس لیا اور اس نے افغانستان اور پاکستان کے نام ایک مراسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ دونوں ممالک کو باہمی بات چیت کے ذریعے اپنے اختلافات رفع کرنے چاہئیں۔ کراچی میں یہ امریکی مراسلہ ابھی زیرغور ہی تھا کہ 2/دسمبر کو پاکستان میں امریکی سفیر ایورا وارن (Evera Warren) مرکزی محکمہ دفاع کے سیکرٹری لیفٹیننٹ کرنل اسکندر مرزا کے ہمراہ کوئٹہ پہنچا۔ وہاں سے وہ اسی دن زیارت گیا اور پھر اگلے دن واپس کراچی پہنچ گیا اور اسی دن بیروت سے یہ خبر آئی تھی کہ امریکی آئل کمپنی (آرامکو) نے 250 ملین ڈالر کے خرچ سے سعودی عرب کے تیل کو بحیرہ روم تک پہنچانے کے لئے لبنان کی بندرگاہ سدون (Sidon) تک جو پائپ لائن بچھائی ہے وہ اب کھول دی گئی ہے۔ 4/دسمبر کو برطانیہ کے لبرل اخبار مانچسٹر گارڈین نے اداریے میں انکشاف کیا کہ مشرق وسطیٰ میں ''نیٹو'' کی قسم کی فوجی تنظیم قائم کرنے کی تجویز زیرغور ہے۔ اگر امریکہ اس مجوزہ تنظیم میں شامل ہو گیا تو اس سے اس کو بہت تقویت ملے گی کیونکہ امریکہ کی ترکی، ایران اور سعودی عرب سے پہلے ہی گہری وابستگی ہے۔ اس تنظیم کے لئے پاکستان کی حمایت بھی گراں قدر ہوگی کیونکہ یہ ملک مسلم ممالک میں سب سے زیادہ طاقتور ہے۔''[3]

پھر 17/دسمبر کو کابل سے یہ خبر آئی تھی کہ سوویت یونین نے پاک۔ افغان تنازعہ میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ خبر میں کہا گیا تھا ''کچھ عرصہ سے سوویت ہفت روزہ نیو ٹائمز اور دوسرے روسی اخبارات نے پاکستان کی بمباری پر بھی افغانستان سے اظہار ہمدردی کیا ہے کہ ایران کی تودہ پارٹی بھی، جو اشتراکی نظریات کی حامل ہے، اس سلسلے میں سوویت اخبارات کی ہم نوا ہے۔ اس پارٹی کے اخبار ''پرخاش'' نے حال ہی میں ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی برطانوی سامراج کی شرارت کا نتیجہ ہے۔ چونکہ افغانستان نے سوویت یونین کے خلاف برطانیہ کا آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا ہے اس

لئے اس کی یہ پالیسی برطانوی سامراج کو پسند نہیں ہے۔ برطانیہ کی افغانستان اور سوویت یونین کے درمیان خیر سگالی پر خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح اس کی افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی دائمی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ پاکستان افغانستان کے ساتھ اپنے اختلافات میں شدت پیدا کر رہا ہے اور برطانیہ قدرتی طور پر ان اختلافات کے تصفیہ کے حق میں نہیں ہے۔"[4]

تودہ پارٹی کے اس اخبار نے یہ مضمون ایسے موقع پر لکھا تھا جب کہ ڈاکٹر مصدق کی زیر قیادت پورے ایران میں اینگلو۔ ایرانین آئل کمپنی کو قومیانے کے حق میں تحریک چل رہی تھی اور ہندوستان میں "پختونستان" کے حق میں زبردست پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ وسط دسمبر میں اس سلسلے میں دہلی میں ایک آل انڈیا پختون جرگہ بھی منعقد کیا گیا تھا۔

ریفارمز کمیٹی کے سوالنامے کی وصولی کے بعد بلوچستان مسلم لیگ نے 12 رجنوری کو اپنے صدر ملک شاہ جہاں کی سربراہی میں ایک 15 رکنی کمیٹی مقرر کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس پر غور کر کے صوبائی لیگ کونسل کے روبرو اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس سوالنامے کا تعلق صرف ایجنٹ گورنر جنرل کے زیر اہتمام علاقوں سے تھا کیونکہ ریفارمز کمیٹی بلوچستانی ریاستوں میں اصلاحات کے معاملے پر غور نہیں کر سکتی تھی۔ ریاستی علاقوں کے آئینی مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی زیر صدارت ایک الگ مذاکراتی کمیٹی مقرر تھی جو بلوچستانی والیانِ ریاست سے بات چیت کر رہی تھی جبکہ خان آف قلات اپنے اس مؤقف پر بالاصرار قائم تھا کہ اسے علاقے میں مکمل اختیارات حاصل ہیں[5] اور اس کا 18 رجنوری 1951ء کو منصوبہ یہ تھا کہ وہ حسب سابق اپنی دوایوانی مقننہ کی امداد سے اپنی ریاست کا نظم ونسق چلائے گا۔[6] حالانکہ وزیر اعظم لیاقت فروری 1950ء میں سبی دربار میں غیر مبہم اعلان کر چکا تھا کہ بلوچستان اور بلوچستانی ریاستوں کو انتظامی لحاظ سے اسی سطح پر لایا جائے گا جس سطح پر پاکستان کے دوسرے علاقے تھے۔

29 رجنوری کو بلوچستان مسلم لیگ کی مقرر کردہ سب کمیٹی نے کوئٹہ میں صوبائی لیگ کونسل کے روبرو اپنی رپورٹ پیش کی تو کونسل نے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی بحث وتمحیص کے بعد اس رپورٹ کی منظوری دے دی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ بلوچستان کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے مطابق صوبائی خودمختاری دی جائے۔ صوبہ میں قانون سازی کے لئے ایک

ایوانی اسمبلی کی بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر انتخاب کے ذریعے تشکیل کی جائے۔اس اسمبلی میں اقلیتوں کی نمائندگی کے اصول کا مسئلہ بالکل اسی طرح نمٹایا جائے جس طرح کہ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں نمٹایا گیا ہے۔البتہ نمائندگی کے سوال پر مہاجر اور غیر مہاجر میں کوئی امتیاز نہ کیا جائے کیونکہ ہر فرد جو بلوچستان میں آباد ہو چکا ہے وہ بلوچستانی ہے۔گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے نامزدگی کی بنیاد پر جو مشاورتی کونسل کا تجربہ کیا گیا ہے وہ کامیاب نہیں ہے کیونکہ اس کونسل کو مطلوبہ اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ جہاں تک جرگہ سسٹم کے خاتمہ کا تعلق ہے اس کا فیصلہ صوبائی خودمختاری کے حصول کے بعد منتخب ہونے والی اسمبلی کرے گی۔ رپورٹ میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ جب بلوچستان کو صوبائی خودمختاری ملے گی تو یہاں قومی تعمیر کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔معدنی وسائل کو ترقی دی جائے گی۔پھلوں کی کاشت،اونی کپڑے اور دوسری اشیائے صرف کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔اگر آبپاشی کی سہولتوں میں توسیع کی گئی تو لوگ خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے ایک ہی جگہ مستقل طور پر رہائش اختیار کر کے بذریعہ کاشت کاری اپنی روزی کمائیں گے۔صوبہ کے 60 فیصد عوام کاشت کار ہیں اور 87 فیصد زمین محض آبپاشی کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے بنجر پڑی ہوئی ہے۔''[7]

پاکستان ٹائمز نے اپنے 31رجنوری کے اداریے میں بلوچستان مسلم لیگ کی ان سفارشات کی پرزور تائید کی اور مطالبہ کیا کہ ''مشاورتی کونسل کو فی الفور توڑ دیا جائے تاکہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ بلوچستانی عوام کا صوبائی انتظامیہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اداریے میں اس مخلصانہ امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ اب مرکزی حکومت بلوچستان کے عوام کو سیاسی حقوق دینے میں تاخیر نہیں کرے گی اور بلوچستان کو آئینی لحاظ سے دوسرے پاکستانی صوبوں کی سطح پر لانے کے لئے بلا تاخیر دستور ساز اسمبلی کی منظوری حاصل کرے گی۔لیکن جس دن پاکستان ٹائمز میں یہ اداریہ شائع ہوا اسی دن اس اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ ''بلوچستان ریفارمز کمیٹی کا اجلاس فروری میں منعقد نہیں ہوگا بلکہ یہ اجلاس اپریل تک ملتوی کر دیا گیا ہے کیونکہ کمیٹی کے ایک پٹھان رکن ملک خدا بخش کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اور اس خبر سے پاکستان ٹائمز اور دوسرے جمہوریت پسند حلقوں کی یہ امید خاک میں مل گئی کہ ریفارمز کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر مارچ میں مرکزی اسمبلی کوئی نہ کوئی قانون سازی کرے گی اور اس طرح بلوچستانی عوام کو مستقبل قریب میں کچھ نہ کچھ

حقوق مل جائیں گے اور پھر جب 2 رفروری کو ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین نے سبی شاہی جرگہ کو خطاب کیا تو یہ امید بالکل ہی ختم ہوگئی۔ امین الدین نے اپنے خطبہ صدارت میں بلوچستان کی انتظامیہ میں اصلاحات کا کوئی ذکر نہ کیا۔ البتہ اس نے شاہی جرگہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ بلوچستانی عورتوں کو اسلامی احکامات کے مطابق مساوی حقوق دینے کے لئے مناسب معاشرتی اصلاحات کرے۔ اس کی اس تقریر سے صاف ظاہر تھا کہ پاکستان کی بیوروکریسی بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کے حق میں نہیں تھی اور وہ سرداری نظام اور جرگہ سسٹم کو برقرار رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی کیونکہ اس طرح نہ صرف وہ صوبہ میں اپنے اقتدار کو قائم رکھ سکتی تھی بلکہ وہ اس سٹریٹیجک علاقے میں اینگلو۔ امریکی بلاک کے فوجی منصوبوں کی تکمیل بھی کر سکتی تھی۔

7 رفروری کے لندن ٹائمز کی خبر یہ تھی کہ امریکہ اور برطانیہ نے تیل سے مالا مال مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لئے طویل المیعاد سٹریٹجی کے بارے میں وسیع پیمانے پر مذاکرات شروع کر دیئے ہیں۔ برطانیہ نہ صرف اس علاقے میں موجودہ دفاعی انتظامات کو مستحکم کرنے کا خواہاں ہے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اگر اسے نہر سویز کے علاقے سے نکلنا پڑے تو اسے یہاں نئے فوجی اڈے دستیاب ہوں۔[8] اور 14 رفروری کو لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلی گراف میں ایک 77 سالہ سیاسی امور کے ماہر سر لیونل ہورتھ (Lionel Howarth) نے ایک مضمون میں برطانیہ کو متنبہ کیا کہ ''خلیج فارس کے غیر محفوظ علاقے کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اور اس کے دفاع کے لئے ''ہمارے لئے پاکستان ضروری ہے'' اور اس باہمی ضرورت کی وجہ سے فوجی اڈے اقوام متحدہ کو بھی عارضی طور پر دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر کراچی کے نزدیک اڈے اور سپلائی ڈپو ہوں گے اور کوئٹہ میں دوسرے ڈپو، اڈے اور ہسپتال ہوں تو امریکہ، برطانیہ اور دوسری اقوام یہاں سے عراق اور ایران میں اسی طرح اپنی افواج اور رسد بھیج سکیں گے جیسے کہ ہم پہلے بھیجا کرتے تھے۔''[9]

صوبائی مسلم لیگ کی جانب سے جمہوری اصلاحات کے لئے پُرزور مطالبات

بیوروکریسی کی مخالفت کے باوجود بلوچستان مسلم لیگ اور دوسرے سیاسی حلقوں کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ ہوتا رہا تھا کہ صوبہ میں بلا تاخیر جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔ صوبائی لیگ کی مجلس عاملہ کی طرف سے 12 رفروری کو قرارداد منظور کی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ

چونکہ بلوچستان ریفارمز انکوائری کمیٹی پہلے ہی صوبہ کا دورہ کر چکی ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ صوبہ کے سارے حلقے صوبائی خودمختاری کے سوال پر متحد و متفق ہیں، اس لئے اس مطالبہ کی تکمیل میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ مجلس عاملہ نے ایک اور قرارداد میں کوئٹہ میں فی الفور ایک ریڈیو سٹیشن لگانے پر زور دیا کیونکہ اس طرح نہ صرف افغانستان کی جانب سے پاکستان دشمن پروپیگنڈے کا توڑ ہو سکے گا بلکہ صوبائی عوام کو حکومت کی ترقیاتی سکیموں سے بھی آگاہ کیا جا سکے گا۔ تیسری قرارداد میں حکومت پاکستان کی طرف سے رفیوجی فنانس کارپوریشن کے قیام کا خیر مقدم کیا گیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس کارپوریشن میں ضلع کوئٹہ پشین کے 50 ہزار مہاجرین کو نمائندگی دی جائے اور چوتھی قرارداد میں ریاست قلات کے وزیراعظم محمد ظریف خان کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا کیونکہ مجلس عاملہ کی رائے میں ''اس شخص کا رویہ آمرانہ اور غیر جمہوری تھا اور یہ ریاستی عوام کو پاکستان سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

13 رفروری کو بلوچستان کی مشاورتی کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں بھی صوبائی انتظامیہ میں اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا اور کونسل نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا کہ آئندہ کوئٹہ میونسپلٹی کے عام انتخابات بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر ہونے چاہئیں اور کسی شخص کے انتخابات میں حصہ لینے کے حق پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے اور میونسپلٹی کا چیئرمین اس ادارے کے منتخب ارکان میں سے منتخب ہونا چاہیے۔ کونسل کے اس اجلاس میں سرکاری طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ ''بلوچستان سے کل تقریباً 31 ہزار غیر مسلم ترک وطن کر کے ہندوستان گئے تھے اور ان کی جگہ تقریباً 26 ہزار مسلم مہاجرین کو آباد کیا گیا ہے اور ان 26 ہزار مسلم مہاجرین میں سے تقریباً 10 ہزار مہاجرین ایسے ہیں جو ابتداً بلوچستان کے باشندے تھے لیکن قیام پاکستان سے قبل بھارت میں رہائش پزیر ہو گئے تھے۔'' مشاورتی کونسل نے اپنے اس دو روزہ اجلاس میں ایک ایسی قرارداد بھی منظور کی جس سے ثبوت ملتا تھا کہ صوبہ بلوچستان تعلیمی لحاظ سے فروری 1950ء میں بھی وہیں کھڑا تھا جہاں کہ وہ اگست 1947ء میں تھا۔ قرارداد یہ تھی کہ کوئٹہ کے واحد ڈگری کالج میں سائنس اور زراعت کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صوبہ کے دوسرے علاقوں میں مزید سکول کھولے جائیں۔ اس قرارداد سے یہ افسوس ناک حقیقت بالکل واضح تھی کہ قیام پاکستان کے تین ساڑھے تین سال بعد بھی بلوچستان کی دس بارہ لاکھ کی آبادی کے لئے صرف ایک ہی ڈگری کالج تھا اور اس

میں بھی سائنس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بظاہر وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت کو سٹریٹیجک صوبہ بلوچستان کے عوام الناس کی تعلیمی ترقی میں عملی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی در آں حالیکہ برطانوی سامراج خلیج فارس کے علاقے کے دفاع کے لئے بلوچستان میں فوجی اڈے، سپلائز ڈپوز اور فوجی ہسپتال قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

اس صورت حال کے پیش نظر 18 رفروری کو بلوچستان مشاورتی کونسل کے ایک نوجوان رکن یحییٰ بختیار نے بلوچستان کی اصلاح وترقی کے بارے میں حکومت پاکستان کی غفلت پر احتجاج کیا۔ اس نے روزنامہ ڈان میں ایڈیٹر کے نام ایک خط کے ذریعے ریفارمز کمیٹی پر زور دیا کہ ''وہ اپنی رپورٹ جلدی سے تیار کر کے اسے اپنے وعدے کے مطابق پاکستان پارلیمنٹ کے آئندہ بجٹ سیشن میں پیش کرے۔ اگر اصلاحات کے نفاذ میں غیر ضروری دیر کی گئی تو صوبے کے عوام کو بہت مایوسی ہوگی۔'' لیکن ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کو اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اسی دن یعنی 18 رفروری کو استامحمد میں ایک پریس کانفرنس کو بتایا کہ ''ریفارمز کمیٹی اپریل کے پہلے ہفتے میں دوبارہ بلوچستان کا دورہ کرے گی۔ پھر وہ اپنی رپورٹ مرتب کر کے اسے دستور ساز اسمبلی میں پیش کرے گی۔'' گویا مرکزی اسمبلی کے مارچ 1951 کے بجٹ سیشن کے دوران بلوچستان میں اصلاحات کے بارے میں قانون سازی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

قاضی عیسیٰ ان دنوں اقوام متحدہ سے واپس آ چکا تھا اور چونکہ اس کی واپسی پر اسے فوراً ہی کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا گیا تھا اس لئے اس نے پہلے تو چند ہفتے تک بلوچستان کے لئے صوبائی خودمختاری کے دیرینہ مطالبہ کی حوصلہ افزائی کی لیکن جب کراچی میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی تو وہ 30 رمارچ کو بلوچستان مسلم لیگ کے اجلاس میں پھر صوبہ لیگ کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس موقع پر کونسل نے جو قراردادیں منظور کیں ان میں پہلی قرارداد یہ تھی کہ ''مرکزی حکومت میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے۔'' اگرچہ لیگ کونسل کی یہ قرارداد صوبائی نقطہ نگاہ سے بالکل صحیح اور جائز تھی تاہم اس کی حیثیت ایک ایسی عرضی کی تھی جس میں دست بستہ التجا کی گئی تھی کہ قاضی عیسیٰ کو مرکزی حکومت میں شامل کیا جائے۔ جس دن صوبائی لیگ کونسل نے کوئٹہ میں یہ قرارداد منظور کی تھی اس دن قاضی عیسیٰ کراچی میں ہی تھا۔ چنانچہ اس نے اس سے اگلے دن کراچی میں ہی ایک بیان میں صوبائی لیگ کونسل کا شکریہ ادا کیا جس نے اسے صدر منتخب کر کے ایک مرتبہ اور اس کی قیادت پر

مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ بیان میں مزید کہا گیا تھا ''اگر چہ بلوچستان مسلم لیگ تحریک پاکستان میں کسی سے پیچھے نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود صوبائی اصلاحات کی جدوجہد میں بلوچستانی عوام کی امنگیں ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہیں۔ بلوچستانی عوام کا استحقاق بہت زیادہ تھا لیکن انہیں بہت ہی تھوڑا حصہ ملا ہے اور میرے لئے یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے۔ میں امید کرتا ہوں بلکہ دعا کرتا ہوں کہ بلوچستان میں غیر جمہوری، غیر ہمدردانہ اور افسرانہ انتظامیہ کا جلدی خاتمہ ہو جائے گا اور عوام کے صبر وتحمل کی مزید آزمائش نہیں ہوگی۔''

اس بیان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 8 / اپریل کو بلوچستان مسلم لیگ کے نائب صدر میر قادر بخش نے صوبائی لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس میں اس مضمون کی قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا کہ ''مشاورتی کونسل کے مسلم لیگی ارکان کو اس ادارہ سے الگ ہو جانا چاہیے کیونکہ اس کی تشکیل صوبائی مسلم لیگ کے مشورے کے بغیر ہوئی تھی۔ اب تک چند مسلم لیگی ارکان اس کونسل کی کارروائی میں احتجاجاً حصہ لیتے رہے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیں کیونکہ اگر ہم اس میں حصہ لیتے رہے تو صوبہ میں مسلم لیگ کے وقار کو سخت نقصان پہنچے گا۔'' پھر دو دن بعد 10 / اپریل کو بلوچستان مسلم لیگ کے نائب صدر شاہ جہاں نے کوئٹہ میں ایک بیان کے ذریعے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ ''مرکزی حکومت میں بلوچستان کو نمائندگی دی جائے۔''

حکومت پاکستان نے قاضی عیسیٰ کی متذکرہ عرضی کو بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ البتہ 13 / اپریل کو یہ خبر چھپوا دی کہ بلوچستان ریفارمز انکوائری کمیٹی، جسے سابقہ پروگرام کے مطابق 15 / اپریل کو بلوچستان جانا تھا، اب 29 / اپریل کو کوئٹہ پہنچے گی اور 20 دن تک وہاں قیام کر کے اپنی رپورٹ کو آخری شکل دے گی اور پھر 18 / اپریل کو یہ خبر دی گئی کہ ریفارمز کمیٹی 29 / اپریل کی بجائے 9 / مئی کو کوئٹہ جائے گی جہاں وہ ہفتہ عشرہ قیام کر کے اپنے سوالنامے کے جوابات پر غور کرے گی۔ اسی دن ریاستی و سرحدی امور کی وزارت کی جانب سے ایک پریس نوٹ بھی جاری ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ حال ہی میں ریاست قلات میں آئینی اصلاحات کے بارے میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں وہ سرکاری ذرائع سے حاصل نہیں کی گئی تھیں اس لئے وہ سراسر قیاس آرائی پر مبنی تھیں۔

اس پریس نوٹ کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ 18 / فروری 1951ء کو جب

وزیراعظم لیاقت علی خان کے پرائیوٹ سیکرٹری آغا عبدالحمید کو خان محمد ظریف خان کی جگہ ریاست قلات کا وزیراعظم مقرر کیا گیا تھا تو بعض سیاسی حلقوں میں یہ خوش فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ لیاقت علی خان نے فروری 1950ء میں سبی دربار کو خطاب کرتے ہوئے بلوچستان اور بلوچستانی ریاستوں کو انتظامی لحاظ سے پاکستان کے دوسرے علاقوں کی سطح پر لانے کا جو وعدہ کیا تھا اب اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ یہ خوش فہمی سراسر بے بنیاد تھی۔ آغا عبدالحمید ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کی طرح انڈین سول سروس کا سینئر پنجابی افسر تھا اور اس نے محض افسرانہ طریقے سے ہی حکومت کرنے کی تربیت پائی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ریاست میں جمہوری اصلاحات کے لئے کوئی کام کرے گا۔ یہ افسر پنجاب کے سامراج نواز یونینسٹ جاگیرداروں کا پروردہ اور منظور نظر تھا اس لئے یہ قلاتی عوام الناس کے استبدادی استحصال میں خان معظم کی امداد کرنے کے لئے نہایت موزوں تھا۔ لیکن جب قلات میں اس کے تقرر کے تقریباً پانچ ہفتے بعد 8/اپریل کو ایسوسی ایٹڈ پریس نے قلات کی حکومت اور دربار کے قریبی ذرائع کے حوالے سے یہ خبر دی کہ ''ریاست میں آئینی اصلاحات نافذ کی جارہی ہیں جن کے تحت دو ایوانی مشاورتی مقننہ ہوگی۔ حکومت پاکستان کے مقرر کردہ وزیراعظم کے تحت چھ وزراء ہوں گے۔ خان قلات کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی ہوگی۔'' تو وزارت ریاستی امور کو اس کی تردید کرنا پڑی۔ خان قلات اپنے 2/اکتوبر 1950ء کے بیان کے مطابق اپنی ریاست میں مختار کل ہونے کا دعویدار تھا۔ اس لئے وہ محض آئینی سربراہ کی حیثیت کیسے قبول کرسکتا تھا۔

پریس نوٹ میں ریاستی امور کے وزیر مملکت ڈاکٹر محمود حسین کی مرکزی اسمبلی کے مارچ سیشن میں کی گئی ایک تقریر کا حوالہ دے کر ریاستوں کے بارے میں حکومت پاکستان کی پالیسی کی اس طرح وضاحت کی گئی تھی کہ اگرچہ حکومت ریاستوں کو کوئی ہدایات نہیں دیتی تاہم وہ مشوروں اور خیرسگالی کے ذریعے ان کی داخلی پالیسیوں کو متاثر کرکے ان میں بہتر حکومت کے قیام کی کوشش کرتی ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین نے مزید کہا کہ جہاں تک بلوچستانی ریاستوں کا تعلق ہے وہاں سب سے بڑا مسئلہ معاشی ترقی کا ہے۔ ان میں اراضی کے وسیع رقبہ جات اور وسائل ہیں جن کو زیر استعمال لانے کی ضرورت ہے۔'' گویا وہاں ایسوسی ایٹڈ پریس کی 8/اپریل کی خبر کے مطابق آئینی اصلاحات کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ڈاکٹر محمود حسین نے اپنی اس تقریر میں ایجنٹ

گورنر جنرل کے زیر انتظام بلوچستانی علاقے میں سیاسی اصلاحات کے مسئلہ کا بھی ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ ''آج کل دستور ساز اسمبلی کی ایک کمیٹی مرکز کے زیر انتظام بلوچستانی علاقوں میں بہتر انتظامیہ اور بہتر حکومت کی ایک سکیم وضع کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس کمیٹی کا ریکارڈ اسمبلی میں پیش کیا جائے گا تو اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ بلوچستان میں جو تجربات کئے جائیں گے ان کا بلوچستانی ریاستوں پر بھی اثر ہوگا۔''[10]

لیاقت حکومت کا بلوچستان کے بارے میں لیگ کے بائیس سالہ پرانے مؤقف سے انحراف اور قاضی عیسیٰ کا شدید ردعمل

چونکہ متذکرہ پریس نوٹ سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ اب وزیر اعظم لیاقت علی خان بلوچستان اور بلوچستانی ریاستوں میں اصلاحات کے بارے میں اپنے 10 رفروری 1950ء کے اعلان کو پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا اس لئے بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ نے اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ اس نے 20 راپریل کو اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ بلوچستان ریفارمز انکوائری کمیٹی صوبائی خودمختاری کے عوامی مطالبہ کے پیش نظر قائم کی گئی تھی مگر اب یہ محض لیپا پوتی کر کے وہاں کی انتظامیہ میں بہتری پیدا کرنے کی سکیمیں سوچ رہی ہے حالانکہ انتظامیہ میں بہتری کے لئے پہلے سیاسی اصلاحات کی ضرورت ہے نہ کہ سیاسی اصلاحات سے پہلے انتظامیہ میں بہتری کی۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان کی پاک سرزمین کو پسماندہ اور ترقی یافتہ علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ بلوچستانی عوام پاکستان کے دوسرے علاقوں کے بھائیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں سیاسی مواقع حاصل نہیں ہیں۔ اگر ہمیں بلوچستان کے عوام کی بھلائی کے کام کے لئے سیاسی ہتھیار مہیا کئے جائیں تو ہم انشااللہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔''[11] قاضی عیسیٰ پورے ملک میں اپنی سیاسی بزدلی، موقع پرستی اور رجعت پسندی کی وجہ سے بدنام تھا لیکن اس کا یہ بیان جرأت مندانہ اور ترقی پسندانہ تھا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت واقعی بلوچستانی عوام سے دھوکا کر رہی تھی اور وہ مختلف حیلوں بہانوں سے بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کے مسئلہ کو محض اس وجہ

سے ٹال رہی تھی کہ وہ برطانوی سامراج کے نقش قدم پر چل کر اس سٹریٹیجک علاقے میں دقیانوسی قبائلی سرداروں اور والیان ریاست کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

قاضی عیسیٰ بلوچستان کے بارے میں حکومت پاکستان کی اس غیر معمولی پالیسی کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے 25/اپریل 1951ء کو اپنے اس بیان کی مزید وضاحت کے لئے ایک طویل مضمون چھپوایا۔ اس دردمندانہ مضمون میں لکھا تھا کہ "آزادی سے قبل ہمارے برطانوی حکمرانوں نے یہ اعلان کرنے میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی کہ چونکہ ہم پسماندہ ہیں اس لئے ہم ازخود اپنے معالات نبٹانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ہندو بھی مسلم اکثریتی علاقوں کو پسماندہ قرار دے کر انہیں سیاسی اصلاحات کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور وہ اسی بنا پر سرحد کی خودمختاری اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے مطالبہ کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ لیکن سرحد اور سندھ میں بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ انگریزوں اور ہندوؤں کا یہ مؤقف کس قدر غلط تھا...... یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ وہی بلوچستان ہے جس کے بارے میں 1929ء میں ہمارے محبوب قائداعظم کا خیال تھا کہ اسے صوبائی خودمختاری ملنی چاہیے اور اسی لئے انہوں نے مسلم لیگ کے اس مطالبہ کو اپنے مشہور ومعروف چودہ نکات میں شامل کیا تھا اور پھر بعد میں وہ پورے برصغیر میں مسلم لیگ کے ہر پلیٹ فارم سے یہ مطالبہ کرتے رہے تھے اور پھر انہوں نے انڈین اسمبلی میں بھی اس مطالبہ کا اعادہ کیا تھا۔ لیکن اس پس منظر کے باوجود ہم ابھی تک اپنی قومی حکومت سے مساوی مواقع کی التجا کر رہے ہیں۔ ہمارے کانوں میں لیاقت علی خان کے وہ الفاظ ابھی تک گونج رہے ہیں جو اس نے 1940ء میں کوئٹہ میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہے تھے۔ اس نے بلوچستان مسلم لیگ کے پہلے سالانہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس صوبہ میں "سخت قوانین پر سخت افسروں کے ذریعے عملدرآمد ہوتا ہے"۔ اس کی اس تقریر کے بعد برصغیر اور ساری دنیا میں بے شمار تبدیلیاں آ چکی ہیں لیکن بے چارہ بلوچستان اب بھی وہیں کھڑا ہے جہاں 1940ء میں تھا۔ اب بھی یہاں وہی سخت قوانین نافذ ہیں جن پر پہلے سے زیادہ سخت گیر اور پہلے سے کم روشن خیال بیوروکریسی عمل درآمد کروا رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہم نے بہت التجائیں کیں کہ ہمیں بھی وطن عزیز کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے۔ ہماری التجاؤں کا اثر گزشتہ موسم سرما میں یہ ہوا کہ ایک ریفارمز کمیٹی مقرر کی گئی جس نے بلوچستان کے حقائق معلوم کرنے کے لئے ایک

سوالنامہ تیار کیا۔اس قسم کی ایک کمیٹی 1942ء میں انڈین اسمبلی نے بھی مقرر کی تھی مگر مسلم لیگ پارٹی کی کوشش کے باوجود اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔اب قوم اپنی پارلیمنٹ سے وہی پرانے پرفریب اعلانات کی بجائے جرأت مندانہ فیصلوں کی توقع کرتی ہے۔ جو لوگ پارلیمانی طریق کار سے واقف ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کسی مسئلہ کو بالائے طاق رکھنا ہوتا ہے تو اسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔اس کمیٹی نے جو سوالنامہ جاری کر رکھا ہے اس میں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کے خیال میں مکمل اصلاحات سے بلوچستان کے عوام کو فائدہ پہنچے گا یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ 1919ء کی دوعملی بہتر رہے گی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں تجاویز میں کوئی تجویز بھی موزوں نہیں تو پھر کیا آپ کوئی اور تجویز پیش کر سکتے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس سوال کا کیا جواب دوں؟ میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ویسے ہی حقوق دیئے جائیں جیسے کہ ملک کے دوسرے علاقوں کے پاکستانیوں کو حاصل ہیں۔کیا کمیٹی کے اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت پاکستان صرف چار صوبوں کی ہی عیاشی برداشت کر سکتی ہے اور پانچویں صوبہ بلوچستان کو مجبوراً نیم صوبائی سطح پر ہی یادداشتہ کے طور پر ہی رکھنا پڑے گا۔ اس ریفارمز کمیٹی میں بلوچستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچستان کٹہرے میں کھڑا ہے اور پاکستان کے دوسرے علاقے اس کے مستقبل کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ یہ بات پاکستان کے نادار شہریوں کے لئے انتہائی ذلت آمیز ہے جو اتفاق سے بلوچستان میں پیدا ہوئے ہیں...... پاکستان کے بڑے صوبوں کو تو بہر قیمت خوش کیا جاتا ہے۔انہیں مرکزی حکومت میں نشستیں دی جاتی ہیں،اعلیٰ ملازمتوں میں حصہ دیا جاتا ہے اور صنعتی، معاشی، معاشرتی اور طبی سکیموں کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے لیکن بلوچستان کے چھوٹے صوبے کے لئے کچھ بھی نہیں ......میں ارباب اقتدار سے نہایت سنجیدگی سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بلا تاخیر خواب غفلت سے بیدار ہو کر حقائق کا سامنا کریں۔ میں یہ بات اس علم کی بنا پر کہتا ہوں کہ بلوچستان کے عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے جلدی کوئی کارروائی کیجئے اور بلوچستانی عوام کو ان لوگوں کی گود میں نہ پھینکئے جو ہمارے خیر خواہ نہیں ہیں۔اس صوبے کو گورنری صوبہ بنانے کا فوراً اعلان کیجئے۔ کسی شخص کو عوامی گورنر مقرر کر کے وہاں موجودہ نظام حکومت کو ختم کیجئے جس کے تحت سارے اختیارات صرف ایک افسر کی ذات میں مرتکز ہیں۔صوبے کے مسائل کا مطالعہ کرنے کے لئے ریفارمز کمیٹی

کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی بجائے عوامی گورنر کو سارے مقامی مفادات کی امداد، راہنمائی اور تعاون سے صوبائی خودمختاری کی تکمیل کرنی چاہیے۔''[12]

قاضی عیسیٰ نے یہ دردمندانہ مضمون غالباً 21/اپریل کی اس خبر کو پیش نظر رکھ کر لکھا تھا کہ بلوچستان ریفارمز کمیٹی 9/مئی کو دوبارہ بلوچستان جائے گی۔ وہ وہاں چند ہفتے قیام کر کے پہلے مختلف سیاسی عناصر کی مزید شہادتیں قلمبند کرے گی اور پھر زیارت میں بیٹھ کر اپنی رپورٹ مکمل کرے گی۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ کے سال رواں کے اواخر میں ہونے والے سیشن میں پیش کی جائے گی اور باخبر سیاسی حلقوں کی پیش گوئی یہ ہے کہ اس میں یہ سفارش ہوگی کہ بلوچستان کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے مطابق صوبائی درجہ دیا جائے۔ اس خبر پر 25/اپریل کو پاکستان ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''حکومت پاکستان کو ریفارمز کمیٹی کی متوقع سفارشات کی پارلیمنٹ کی منظوری سے پہلے ہی ٹیکنیکل نوعیت کی ابتدائی تیاریاں مکمل کر لینی چاہئیں تا کہ اس صوبہ میں جمہوری اصلاحات کے نفاذ میں مزید تاخیر نہ ہونے پائے۔'' اخبار نے امید ظاہر کی کہ ''ریفارمز کمیٹی بلوچستان کے لئے مکمل صوبائی درجہ کی سفارش کرے گی کیونکہ اگر صوبائی خودمختاری کو محدود کرنے کی کوئی کوشش کی گئی تو وہاں کے عوام اسے پسند نہیں کریں گے اور زود یا بدیر اس حد بندی کو ترک کرنا ہی پڑے گا۔''

3/مئی کو وزیر خزانہ غلام محمد نے ایک بیان میں ملک کی معاشرتی و معاشی ترقی کے لئے عورتوں کو مساوی حقوق دینے کی ضرورت پر زور دیا تو قاضی عیسیٰ نے اس کے اس بیان کا حوالہ دے کر یہ استفسار کیا کہ آیا بلوچستان کا درجہ عورتوں سے کم ہے۔ اگر ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے عورتوں کو مساوی حقوق دینے ضروری ہیں تو بلوچستان کو مساوی مواقع سے محروم کیوں رکھا جا رہا ہے۔ جب سے پاکستان بنا ہے بلوچستانی عوام کو مساوی مواقع نہیں دیئے گئے۔ ہم کب تک مرکز کی فی سبیل اللہ امداد پر انحصار کرتے رہیں گے۔ پاکستان کے دوسرے صوبے معاشرتی ترقی کی راہ پر رواں دواں ہیں لیکن بلوچستان کو ابھی تک محض وعدۂ حور پر ہی ٹرخایا جا رہا ہے۔'' قاضی عیسیٰ کے اس بیان کے تین چار دن بعد ریفارمز کمیٹی کوئٹہ پہنچی۔ اسی دن پاکستان کا کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان بھی اس جگہ کا معائنہ کرنے کے لئے بلوچستان پہنچ گیا جہاں چند دن قبل پاکستانی فوج کے ایک دستے اور افغان لشکر کے درمیان سرحدی تصادم ہوا تھا۔ اس سے تقریباً ایک ہفتہ قبل

2رمئی کو ایران میں ڈاکٹر محمد مصدق کی قوم پرست حکومت بن گئی تھی اور اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے کر اس علاقے میں برطانوی سامراج کے مفادات پر ایک کاری ضرب لگائی تھی۔ اسی دن ہندوستان کا سابق کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آ کن لیک، جو اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد لائیڈز بنک میں ملازم ہو گیا تھا، پاکستان آیا تھا اور پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے اس کی میز بانی کی تھی اور پھر 8رمئی کو پاکستان کے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خان کا لندن میں بیان یہ تھا کہ ''اگر فریقین نے ایران کے تیل کا تنازعہ پر امن طریقے سے حل نہ کیا تو اس کے بہت برے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''

ریفارمز کمیٹی کی کارگزاری لیاقت، اے۔ جی۔ جی امین اور قبائلی جرگہ کے سربراہ نواب جوگیزئی کا غیر جمہوری رویہ اور قاضی عیسیٰ ودیگر مسلم لیگی ارکان کی بغاوت

ریفارمز کمیٹی نے 10رمئی کی شام کو کوئٹہ میں اپنا پہلا اجلاس منعقد کیا اور 11رمئی سے اس نے مقامی اہل الرائے لوگوں کی شہادتیں قلمبند کرنا شروع کیں۔ سب سے پہلے بلوچستان مشاورتی کونسل کا صدر سیٹھ فدا علی پیش ہوا۔ اس نے رائے ظاہر کی کہ بلوچستان کو یک ایوانی مقننہ کی صورت میں صوبائی خودمختاری ملنی چاہیے۔ مقننہ کا انتخاب شہری علاقوں میں بالغ رائے دہندگی کے اصول پر ہونا چاہیے اور دیہاتی علاقوں میں رائے دہندگی کے لئے تعلیم یا جائیداد کی ملکیت کی کوئی نہ کوئی شرط عائد نہ کرنی چاہیے۔ شہری علاقوں میں بلدیاتی ادارے قائم ہونے چاہئیں لیکن دیہاتی علاقوں میں رسوماتی قانون کو فی الحال نافذ رکھنا چاہیے۔ اس کی مزید رائے یہ تھی کہ مشاورتی کونسل کا تجربہ کامیاب نہیں ہوا اس لئے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ لیکن جب اسی دن قبائل فیڈرشن کا صدر نواب محمد خان جوگیزئی ریفارمز کمیٹی کے روبرو پیش ہوا تو اس کی رائے سیٹھ فدا علی کی رائے سے مختلف تھی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ ''صوبہ میں دو ایوانی مقننہ کی صورت میں آئینی اصلاحات نافذ ہونی چاہئیں۔ شاہی جرگہ اور سرداری نظام کو برقرار رکھا جائے اور رواجی قوانین کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔'' مشاورتی کونسل کے رکن یحییٰ بختیار کا کہنا یہ تھا کہ بلوچستان کو پاکستان کے دوسرے صوبوں

کی مساوی سطح پر لانے کے لئے اصلاحات نافذ کی جائیں ۔اس مقصد کے لئے دوتین سال کی عبوری مدت کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں بعض ترامیم کی جاسکتی ہیں۔

12 رمئی کو قاضی عیسیٰ اور صوبائی مسلم لیگ کے بعض دوسرے سرکردہ لیڈر کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے اور انہوں نے اپنے اس دیرینہ مطالبہ کو دہرایا کہ ''بلوچستان کو ایک با اختیار یک ایوانی مقننہ اور نمائندہ وزارت کی صورت میں مکمل خودمختاری دی جائے ۔شاہی جرگہ اور سرداری نظام کے مستقبل کا فیصلہ منتخب اسمبلی کو کرنا چاہیے اور اگر مری اور بگٹی علاقوں کو قبائلی علاقے قرار دے دیا جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر ریفارمز کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ یہاں دوایوانی مقننہ کی ضرورت ہے تو ہم اس پر معترض نہیں ہوں گے۔ جہاں تک بلوچستان کی مالی دشواریوں کا تعلق ہے ان پر معدنی اور دوسرے ذرائع کو ترقی دینے سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ مرکزی حکومت اس صوبہ کو جو سالانہ گرانٹ دیتی ہے۔اس کا بیشتر حصہ سرحدوں کی حفاظت پر خرچ ہوتا ہے۔ یہ خرچ آئندہ بھی مرکزی حکومت کو ہی برداشت کرنا چاہیے کیونکہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر ہی عائد ہوتی ہے۔''مسلم لیگی لیڈروں کے اس مطالبے کی تائید اسی دن مقامی تاجروں ،صنعت کاروں ،اقلیتوں اور وکلاء کے نمائندوں نے بھی کی ۔کوئٹہ کے ایک ممتاز پنجابی صنعت کار اور کوئلہ کی کان کے مالک کی کمیٹی کے روبرو رائے یہ تھی کہ ''بلوچستان کے خانہ بدوش لوگوں کے حقوق کا تحفظ مجوزہ اسمبلی میں ان کے نمائندوں کی نامزدگی سے ہوسکتا ہے لیکن اس اسمبلی کے انتخاب میں مہاجرین اور مقامی لوگوں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھنا چاہیے۔صوبہ کی معاشی ترقی کے لئے ایک فنانس کارپوریشن کی تشکیل ہونی چاہیے جس میں حکومت کے 51 فیصد حصص ہونے چاہئیں اور پرائیویٹ حصص کا تناسب 49 فیصد رکھا جائے ۔اگر مرکزی حکومت اس کارپوریشن میں صرف ایک کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کرے تو یہ ادارہ صوبہ کو جلد معاشی ترقی کی راہ پر ڈال سکتا ہے۔''

13 رمئی کو بلوچستان مسلم لیگ کونسل نے اپنے لیڈروں کے متذکرہ مطالبہ کو مزید زوردار بنانے کے لئے ایک قرارداد میں مشاورتی کونسل کے مسلم لیگی ارکان کو ہدایت کی کہ وہ اس بے سود اور بے مصرف ادارے سے فی الفور مستعفی ہوجائیں ۔اس قرارداد میں مزید کہا گیا تھا کہ بلوچستان کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت صوبائی خودمختاری ملنی چاہیے اور ایسی

اصلاحات کے نفاذ میں مزید ذرا سی بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔16 رمئی کو مشاورتی کونسل کے ایک سرکردہ رکن سردار نور محمد گولا نے بھی مکمل اصلاحات کا مطالبہ کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ شاہی جرگہ کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس نے صوبہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور عورتوں کو صوبائی اسمبلی اور لوکل باڈیز کے انتخابات میں ووٹ دینے کا حق ملنا چاہیے۔جمیعت العلمائے اسلام کے صدر مولانا رحمت اللہ نے مکمل صوبائی خودمختاری،شاہی جرگہ اور رواجی قوانین کے خاتمہ اور شریعت کے نفاذ کی سفارش کی لیکن جماعت اسلامی کا امیر مولانا عبدالعزیز اسمبلی اور لوکل باڈیز کے بلاواسطہ انتخاب کے خلاف تھا۔اس کی رائے یہ تھی کہ پنچائتوں کو صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لئے اپنے امیدوار نامزد کرنے چاہئیں اور صوبہ میں شرعی قوانین نافذ کر کے ان پر قاضیوں کے ذریعے عمل درآمد کرانا چاہیے۔17 رمئی کو ریفارمز کمیٹی نے طلبا، مزدوروں اور صحافیوں کے نمائندوں سے ملاقاتیں کیں تو ان سب نے مکمل صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کی تائید کی اور سفارش کی کہ شاہی جرگہ اور سرداری نظام کو ختم کیا جائے۔لیبر فیڈریشن کا صدر بلوچستان کو فوراً گورنری صوبہ بنانے کے حق میں تھا اور چاہتا تھا کہ یہاں نمائندہ حکومت کی تشکیل میں مزید کوئی دیر نہیں ہونی چاہیے۔

20 رمئی کو سرحد کے باز محمد خان جوگیزئی،سیٹھ فدا علی اور یحییٰ بختیار نے مسلم لیگ کونسل کی 13 رمئی کی قرارداد کی تعمیل کی اور انہوں نے مشاورتی کونسل سے اپنے استعفے صوبہ لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ کے حوالے کر دیئے۔قبائل فیڈریشن کے صدر نواب محمد خان جوگیزئی کو ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا کیونکہ کونسل پر اس کی فیڈریشن کا غلبہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ شاہی جرگہ کی طرح یہ نامزد ادارہ بھی قبائلی سرداروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے قائم رہے۔چنانچہ اس نے 22 رمئی کو ایک بیان میں وزیراعظم لیاقت علی خان سے اپیل کی کہ وہ بلوچستان مسلم لیگ کے معاملات کی طرف توجہ کرے کیونکہ صوبہ میں اس جماعت کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔اس نے کہا کہ ''اگر موجودہ مسلم لیگ کو توڑ کر اس کی نئی رکن سازی کے بعد اس کے نئے انتخابات کرائے جائیں تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت اس جماعت میں شامل ہو جائے گا۔'' گویا وہ وزیراعظم لیاقت علی کی اعانت سے شاہی جرگہ اور مشاورتی کونسل کے علاوہ صوبائی مسلم لیگ پر بھی قبضہ کرنے کا متمنی تھا۔بظاہر اس کی تمنا کی بنیاد اس کے اس تاثر پر تھی کہ ''اب چونکہ وزیراعظم لیاقت علی خان پاکستان مسلم لیگ کا صدر ہے اس لئے جب کبھی ریفارمز کمیٹی کی سفارشات کے

مطابق بلوچستان میں کوئی اصلاحات نافذ ہوں گی تو وہ یہاں بھی پنجاب کی طرح بندوبست کرے گا کہ اس کی جماعت بہرصورت برسراقتدار آجائے۔''

25رمئی کو ریفارمز کمیٹی کے ارکان زیارت چلے گئے۔ وہاں انہوں نے چار پانچ دن تک آرام کیا اور پھر وہ 30رمئی کو واپس کراچی چلے گئے اور اس سے اگلے دن ''ڈان'' میں باخبر ذرائع کے حوالے سے یہ خبر چھپی کہ ''ریفارمز کمیٹی بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے کے حق میں ہے اور اس کی رائے ہے کہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب بالغ رائے دہندگی کے اصول کے تحت ہونا چاہیے اور اس منتخب اسمبلی کو یہ اختیار دینا چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق نئے انتظامی ڈھانچے کی تشکیل کرے۔'' اسی دن جناح عوامی مسلم لیگ کے کنوینر حسین شہید سہروردی کا بھی ایک بیان شائع ہوا جس میں بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے کے مطالبہ کی حمایت کی گئی تھی اور یاددہانی کرائی گئی تھی کہ خود قائداعظم نے بلوچستان میں نمائندہ حکومت کے قیام کا وعدہ کیا تھا۔ قاضی عیسیٰ کی، ڈان کی اس خبر سے اور سہروردی کے اس بیان سے خاصی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ اس نے 4رجون کو مطالبہ کیا کہ جب تک نئی اصلاحات کے تحت انتخابات نہیں ہوتے اس وقت تک عبوری اقدام کے طور پر بلوچستان میں ایک گورنر مقرر کیا جائے۔ اس گورنر کے مشیروں کا بھی تقرر ہونا چاہیے تا کہ صوبہ کے انتظامی ڈھانچے میں کچھ تبدیلی آئے۔ موجودہ انتظامیہ کے تحت کوئی سیاسی جماعت کام نہیں کر سکتی اور اس بنا پر انتخابات سے پہلے بلوچستانی عوام میں ''سیاسی شعور پیدا نہیں ہوسکتا جو متوقع اصلاحات کے نفاذ کے لئے ضروری ہے۔'' قاضی کے اس مطالبہ کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کی موجودگی میں صوبائی مسلم لیگ کی سیاسی بالادستی قائم ہونے کا امکان نہیں۔ یہ افسر قبائلی سرداروں کے حق میں ہے اور وہ صوبہ کے ہر شعبہ زندگی میں ان سرداروں کا غلبہ قائم رکھے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ بلوچستان میں متوقع انتخابات سے پہلے ہی دوسرے صوبوں کی طرح نئے صوبائی گورنر کے بااختیار مسلم لیگی مشیر مقرر ہوں تا کہ اس کی سربراہی میں مسلم لیگ کے برسراقتدار آنے کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ لیکن قبائلی سرداروں کے لئے قاضی عیسیٰ کا یہ مطالبہ کسی صورت بھی قابل قبول نہیں تھا۔ چنانچہ 6رجون کو سردار محمد اکبر خان بگٹی نے ایک بیان میں دعویٰ کیا کہ ''موجودہ مشاورتی کونسل کو عوام کی مکمل حمایت حاصل ہے اور یہ کونسل تسلی بخش طریقے سے کام کر رہی ہے۔ اور پھر 16رجون کو قبائل فیڈریشن

کے صدر نواب محمد خان جوگیزئی نے مشاورتی کونسل سے مسلم لیگی ارکان کے استعفوں کی مذمت کی اور کہا کہ ''انہوں نے یہ اقدام محض حکومت کو پریشان کرنے کے لئے کیا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر لیاقت علی خان کو اس وجہ کا پتہ چلانا چاہیے کہ ان مسلم لیگیوں نے کیوں استعفے دیئے ہیں جبکہ کونسل کی میعاد میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے ہیں۔'' نواب جوگیزئی نے اس بیان سے دراصل ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین کے خیالات کی ترجمانی کی تھی۔ اس بیان میں یہ مطالبہ مضمر تھا کہ ''چونکہ قاضی عیسیٰ مقامی انتظامیہ کے لئے ایک سیاسی کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسے یہاں سے نکال کر باہر پھینک دینا چاہیے۔''

لیکن وزیراعظم لیاقت علی خان بیوروکریسی کے اس مطالبہ پر فوری طور پر عمل نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جولائی کے اوائل میں جب حکومت پاکستان نے اپنی فوج کا ایک بریگیڈ آزاد کشمیر میں بھیجا تھا تو اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ حکومت ہندوستان نے مغربی پنجاب کی سرحد پر اپنی فوجیں مجتمع کر دی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد دواڑھائی ہفتے تک بلوچستان اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے چھوٹے بڑے لیڈروں کی جانب سے ہندوستان کے جارحانہ عزائم کے خلاف اور لیاقت علی کی حکومت کی حمایت میں بیانات شائع ہوئے اور اس اثناء میں بلوچستان میں صوبائی خودمختاری کے حق میں کوئی آواز اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قاضی عیسیٰ، سردار اکبر بگٹی، میر قادر بخش اور دوسرے بلوچستانی لیڈروں کے اعلانات یہ تھے کہ اگر ہندوستان نے پاکستان کے کسی علاقے پر حملہ کیا تو بلوچستان کے عوام حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔

قاضی عیسیٰ نے برازیل میں سفیر کا عہدہ قبول کر کے صوبائی حقوق کی تحریک کا سودا کر لیا

جولائی 1951ء کے اواخر میں دونوں ملکوں کے درمیان بیانات و اعلانات کی یہ جنگ قدرے سرد پڑی تو قاضی عیسیٰ نے پھر بلوچستان کے مسئلہ کی طرف توجہ کی۔ اس نے 29 رجولائی کو ایک اخباری انٹرویو میں یہ مطالبہ کیا کہ ''جب 31 راگست 1951ء کو موجودہ مشاورتی کونسل کی میعاد ختم ہو تو صوبہ میں دفعہ 92 الف کے تحت گورنری راج قائم کر دیا جائے۔ گورنر کوئی عوامی

نمائندہ ہونا چاہیے اور اسے اپنے مشیر مقرر کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔بلوچستان مسلم لیگ ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل نہیں چاہتی خواہ اس کے سارے کے سارے ارکان مسلم لیگی ہی کیوں نہ ہوں۔اس نے مزید کہا کہ اگر 31/اگست کے بعد موجودہ مشاورتی کونسل کی میعاد میں اضافہ کیا گیا تو یہ اقدام مسلم لیگ ہائی کمان کے فیصلے کے منافی ہوگا۔ایسی صورت میں ممکن ہے کہ میں یہ مسئلہ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پیش کروں۔جب اس سے پوچھا گیا کہ قبائلی علاقوں میں انتخابات کیسے ہوں گے؟ تو قاضی عیسیٰ نے کہا کہ بلوچستان میں کوئی قبائلی علاقے نہیں ہیں کیونکہ یہ علاقے بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کر چکے ہیں۔''جب قاضی عیسیٰ کا یہ بیان 30/جولائی کے اخبارات میں شائع ہوا تو سیاسی مبصرین کا خیال تھا کہ بلوچستان میں خودمختاری کے حق میں پھر واویلا شروع ہو جائے گا۔مگر ایسا نہ ہوا۔دو تین ہفتے تک بالکل خاموشی رہی اور پھر یکایک 26/اگست کو کراچی میں ایک سرکاری اعلان جاری ہوا کہ''قاضی محمد عیسیٰ کو برازیل میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا ہے۔''اس اعلان کا مطلب صاف ظاہر تھا یعنی یہ کہ بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کے''عظیم علمبردار''قاضی عیسیٰ کی سیاست کا سودا مکمل ہو گیا ہے اور اس نے اپنے صوبہ کے عوام کے سیاسی حقوق کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر دیا ہے۔ماضی میں بھی ستمبر 1950ء میں جب بلوچستان کا ایجنٹ گورنر جنرل امین الدین قاضی عیسیٰ کے سیاسی شور وغوغا سے خفا ہوا تھا تو اسے اقوام متحدہ کے سالانہ اجلاس میں پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے نیویارک بھیج دیا گیا تھا اور اب اگست 1951ء میں امین الدین کی ناراضگی نے اسے برازیل پہنچا دیا۔قاضی عیسیٰ 1938ء سے آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ تھا اور اس نے 1940ء کے بعد تحریک پاکستان میں واقعی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔لہٰذا اسے بجا طور پر امید تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اسے کوئی اعلیٰ منصب ملے گا۔مگر اس کا بزدلانہ،خوشامدانہ اور موقعہ پرستانہ سیاسی رویہ اس کی اس امید کی تکمیل کے راستے میں حائل رہا۔مزید براں ایجنٹ گورنر جنرل اور قبائلی سرداروں کی مسلسل مخالفت نے بھی اسے صوبائی یا مرکزی سطح پر اقتدار کی منزل تک نہ پہنچنے دیا۔وہ چار سال تک صوبائی اصلاحات کا پرچم اٹھا کر پورے زور سے واویلا کرتا رہا مگر کراچی کے ایوان اقتدار سے اسے ہاں ہوں اور ٹال مٹول کے سوا کچھ نہ ملا کیونکہ اس کے حمایتی درمیانہ طبقہ کی کوئی قوت نہیں

تھی۔ جب اگست 1951ء میں قاضی عیسیٰ کی برازیل میں بطور سفیر تقرری ہوئی تو بلوچستان میں بدستور ایجنٹ گورنر جنرل کی مطلق العنانیت کا دور دورہ تھا اور وہاں کے عوام الناس سیاسی، انتظامی، معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی لحاظ سے تقریباً وہیں کھڑے تھے جہاں کہ وہ اگست 1947ء میں تھے۔

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

لیاقت علی کا گولی لگنے تک بلوچستان کو صوبائی حقوق دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا

31 راگست 1951ء کی دوسری مشاورتی کونسل کی میعاد ختم ہوئی تو کراچی میں یہ سرکاری اعلان کیا گیا کہ ''بلوچستان میں دوسری مشاورتی کونسل ختم کر دی گئی ہے اور آئندہ اس قسم کی کوئی کونسل قائم نہیں ہوگی کیونکہ صوبہ میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے ایک ریفارمز کمیٹی کا تقرر ہو چکا ہے۔ جب اس کمیٹی کی تجویز کردہ اصلاحات نافذ ہوں گی تو ایجنٹ گورنر جنرل کو انتظامی اور قانونی مسائل کے بارے میں مشورہ دینے کے لئے کسی مشاورتی کونسل کی ضرورت نہیں ہوگی۔'' لیکن اس اعلان میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ ریفارمز کمیٹی کب تک اپنی سفارشات پیش کرے گی، دستور ساز اسمبلی میں مطلوبہ قانون کی منظوری کب ہوگی اور پھر کب تک بلوچستان میں اصلاحات نافذ ہوں گی۔ البتہ غیر سرکاری خبروں میں قیاس آرائی کی گئی تھی کہ ''ریفارمز کمیٹی کا آخری اجلاس اکتوبر کے اوائل میں ہوگا اس میں کمیٹی کی سفارشات کو آخری شکل دی جائے گی اور پھر 21 راکتوبر کو یہ خبر چھپی کہ ریفارمز کمیٹی نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی ہے جو دسمبر کے اواخر میں دستور ساز اسمبلی کے سیشن میں پیش کی جائے گی۔ جب اسمبلی اس رپورٹ کی منظوری دے دے گی تو پھر کمیٹی کی سفارشات کے مطابق ایک مسودۂ قانون تیار کیا جائے گا جس کے تحت بلوچستان کو بعض معمولی تحفظات کے تحت صوبائی درجہ دے دیا جائے گا...... امید ہے کہ نئے صوبہ کی پہلی اسمبلی کے انتخابات بالغ رائے دہندگی کے اصول کے تحت کسی وقت آئندہ سال (1952ء) ہوں گے۔'' اگرچہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان نے یہ خبر بااختیار ذرائع کے حوالے سے دی تھی تاہم سیاسی مبصرین کو یقین نہیں تھا کہ بلوچستان میں واقعی 1952ء میں ایک بااختیار اور منتخب اسمبلی وجود میں آ جائے گی اور بلوچستانی عوام کو فی الحقیقت ان کے وہ بنیادی جمہوری حقوق مل جائیں گے جن کا

مطالبہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے 1929ء سے کیا جا رہا تھا۔اس شک وشبہ کی وجہ وزیراعظم لیاقت علی خان کا وہ منصوبہ تھا جو اس نے ملک میں عام انتخابات کے لئے بنایا ہوا تھا۔

چوہدری محمد علی ان دنوں لیاقت علی خان کا نہایت معتمد نائب تھا اور اس بنا پر اس سے وزیراعظم کا کوئی راز پوشیدہ نہیں تھا۔وہ لکھتا ہے کہ "لیاقت علی خان کا منصوبہ یہ تھا کہ" آئینی مسائل کو طے کرنے سے پہلے باری باری ہر صوبے میں اور اس کے بعد مرکزی اسمبلی کے انتخابات کرائے جائیں۔انہوں نے اپنے اس منصوبے سے مجھے اور بعض دوسرے اصحاب کو آگاہ کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر مبنی عبوری آئین تسلی بخش طور پر کام کر رہا ہے۔بالغ رائے دہی کی اساس پر عام انتخابات سے جمہوری اداروں کے قیام کی یقینی ضمانت مل جائے گی لیکن صوبائی اور مرکزی قانون ساز اداروں کے انتخابات بیک وقت کرانے سے انتظامیہ اور مسلم لیگ پارٹی کے وسائل پر بے حد بار پڑے گا۔اس لئے یہ انتخابات مرحلہ بہ مرحلہ ہونے چاہئیں۔ان کا آغاز پنجاب سے کیا جائے اور علی الترتیب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، مشرقی بنگال اور سب سے آخر میں مرکز کے لئے جب عوام سے تازہ سند اختیار لئے نو منتخب حکومتیں باگ ڈور سنبھالیں گی تو پھر آئین سازی کا کام ہاتھ میں لے کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا۔لیکن ایک قاتل کی گولی نے 16/اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کی زندگی کے ساتھ ان کے منصوبے کا بھی خاتمہ کر دیا۔"[13] چوہدری محمد علی کے بیان کردہ اس انتخابی منصوبے میں بلوچستان کا کوئی ذکر نہیں ہے جس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بلوچستان ریفارمز کمیٹی کا ڈھونگ محض تاخیری حربے کے طور پر رچایا گیا تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان اس بدنصیب صوبہ کو 1952ء میں جمہوری اصلاحات کا تحفہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔وہ اکتوبر 1951 میں بھی 48-1947ء کے اس فیصلہ پر قائم تھا کہ جب پاکستان دستور ساز اسمبلی آئین مرتب کرلے گی تو پھر نئے آئین کے تحت بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔گویا 1951ء میں بھی بلوچستانی عوام سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ پہلے صوبائی اور مرکزی انتخابات کے مکمل ہونے کا انتظار کریں، پھر نو منتخب دستور ساز اسمبلی میں آئین سازی کے کام کی تکمیل کا انتظار کریں اور اگر وہ انتظار کا بوجھ غیر معین عرصے تک صبر وتحمل سے برداشت کرتے رہے تو انہیں کبھی نہ کبھی جمہوری حقوق مل ہی جائیں گے۔

اختتامیہ......بلوچستان کو اس کی غیر معمولی جنگی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے سامراج اور بعدازاں اس کی گماشتہ پاکستانی حکومتوں نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی سے محروم رکھا۔

بلوچستان کے اس تقریباً ایک سو سالہ واقعاتی پس منظر میں تاریخ کے ہر غیر جانبدار طالب علم کے لئے یہ حقیقت بڑی ہی افسوس ناک تھی کہ پاکستان کے مسلم لیگی ارباب اقتدار نے 14 راگست 1947ء کے بعد اس بدنصیب صوبہ کے انتہائی پسماندہ اور مفلوک الحال عوام کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ترقی کے لئے کوئی مؤثر کاروائی نہیں کی تھی اور جب 16 راکتوبر 1951ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان راولپنڈی میں پنجابی شاونزم کی گولیوں کا شکار ہوا تھا تو اس صوبہ کے دس گیارہ لاکھ عوام ہر شعبہ زندگی میں تقریباً وہیں کھڑے تھے جہاں کہ وہ 1839ء میں انگریزوں کا عمل دخل شروع ہونے کے موقع پر تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان نے اس پالیسی سے سراسر انحراف نہیں کیا تھا جو برطانوی سامراج نے جنگی اہمیت کے اس سرحدی علاقے کے لئے 1876ء میں نافذ کی تھی۔ اس پالیسی کی نوعیت یہ تھی کہ روسی سامراج کی حقیقی یا موہوم توسیع پسندی کے خلاف ایران اور افغانستان کے علاوہ بلوچستان کو بھی ایک بفر علاقے کی حیثیت میں رکھا جائے۔ برطانوی سامراج کو اس علاقے کے معاشی استحصال میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کیونکہ اولاً پانی کی کمیابی کے باعث یہاں زرعی ترقی کی گنجائش بہت کم تھی اور ثانیاً معدنی ذرائع کی ترقی کے لئے بہت سرمایہ کاری کی ضرورت تھی اور افغان جنگوں، بلقان کی جنگوں، پہلی جنگ عظیم، عالمی معاشی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے باعث مطلوبہ سرمایہ کبھی بھی مہیا نہیں ہوا تھا، چنانچہ اس سارے عرصے میں سنڈیمن سکیم کے تحت بلوچستان میں برطانیہ کی نیم فوجی انتظامیہ کا واحد مقصد یہ تھا کہ جنگی مصلحت کے تحت اس سرحدی علاقے میں والیان ریاست اور قبائلی سرداروں کی وساطت سے امن وامان قائم رکھا جائے۔ ایجنٹ گورنر جنرل اور اس کے ماتحت پولیٹیکل ایجنٹ اپنا یہ مقصد پورا کرنے کے لئے نہ صرف والیان ریاست اور قبائلی سرداروں کو وظائف دیتے تھے بلکہ وہ مختلف نسلی، لسانی اور ثقافتی گروہوں کے باہمی

تضادات کوخونی ہوا دے کر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم رکھتے تھے۔ مزید براں انہوں نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت جرگہ سسٹم نافذ کر کے قبائلی سرداروں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ اپنے غریب عوام پر جس قدر چاہیں جبر واستبداد روا رکھیں اور اسی لئے 1909ء اور 1919ء کی اصلاحات بلوچستان میں نافذ نہیں کی گئی تھیں۔ ہندوستان کے مسلم عمائدین نے 1927ء میں پہلی مرتبہ بلوچستانی عوام کی اس لرزہ خیز مظلومیت کا نوٹس لیا جبکہ دہلی میں محمد علی جناح کی طلب کردہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی پانچ نکاتی تجاویز میں یہ تجویز بھی شامل کی کہ بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں اور اسے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے۔ اس کے بعد 1929ء میں یہ مطالبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیاسی پروگرام کا ایک لازمی حصہ بن گیا لیکن انڈین نیشنل کانگرس کے سیاسی پروگرام میں یہ مطالبہ کبھی بھی شامل نہ ہوا۔ 32-1931ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران بھی یہ مطالبہ کیا گیا مگر حکومت برطانیہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اس وقت عالمی معاشی بحران شروع ہو چکا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے مہیب سائے چار دانگ عالم میں منڈلانے لگے تھے۔

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت شمال مغربی صوبہ سرحد سمیت سارے برطانوی ہند میں سیاسی اصلاحات نافذ ہوئیں مگر بلوچستانی عوام اس بنیادی حق سے بدستور محروم رہے۔ مارچ 1941ء میں جبکہ دوسری جنگ عظیم کو شروع ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے سالانہ بجٹ میں ایک تحریک تخفیف پیش کر کے بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کا پھر مطالبہ کیا۔ مگر سرکاری ارکان اور کانگرس ونیشنلسٹ پارٹی کے ہندو ارکان کی مخالفت کی وجہ سے یہ تحریک منظور نہ ہو سکی۔ 1943ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے تقریباً ایک ماہ تک بلوچستان کا دورہ کیا اور جگہ بہ جگہ اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ بلوچستان میں مکمل جمہوری اصلاحات نافذ کر کے اسے برطانوی ہند کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے مگر برطانیہ کے ایوان اقتدار میں کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ پھر مارچ 1944ء میں مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نوابزادہ لیاقت علی خان نے بلوچستان کے لئے ایک ریفارمز کمیٹی کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔ یہ قرارداد منظور تو ہو گئی مگر مجوزہ کمیٹی نہ قائم ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ 1945ء میں قائداعظم نے پھر بلوچستان کا دورہ کر

کے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا کہ اس بدنصیب صوبہ کے مظلوم عوام کی بھی سیاسی، معاشرتی، معاشی، اور تعلیمی ترقی کا بندوبست کیا جائے۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود برطانوی سامراج کے ایوان اقتدار میں اس مطالبے کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے دوران سرخ فوج کے ہاتھوں نازی جرمنی کی فقید المثال شکست کے باعث ساری دنیا میں بالعموم اور ایشیائی ممالک میں بالخصوص سوویت یونین کے سیاسی وقار میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ سوویت یونین کی فوجیں 1941ء کے معاہدہ کے تحت ایران کے شمالی صوبہ آذربائیجان میں موجود تھیں اور ماسکو کے ارباب اقتدار ایک سوویت۔ ایرانین آئل کمپنی قائم کر کے اس صوبہ میں تیل کی تلاش کرنے کے خواہاں تھے۔ برطانیہ کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں پورے عالم عرب میں سامراج کے خلاف زبردست عوامی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ برطانیہ کو خطرہ تھا کہ اگر سوویت یونین کا اثر ورسوخ ایران اور عراق میں پھیل گیا تو نہ صرف ایران، عراق اور سعودی عرب میں تیل کے ذخائر اینگلو۔ امریکی بلاک کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، بلکہ پورا ایشیا اشتراکیت کے زیر اثر چلا جائے گا۔ لہٰذا اس کا منصوبہ یہ تھا کہ (1) سوویت یونین کو مجبور کیا جائے کہ وہ آذربائیجان سے اپنی فوجیں بلا تاخیر نکالے اور پھر ایران میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ سوویت یونین کو اس ملک میں تیل تلاش کرنے کی کوئی سہولت نہ مل سکے۔ (2) عراق میں اپنا فوجی اڈہ قائم کیا جائے۔ نوری السعید پاشا کی سامراج نواز حکومت کو مضبوط کیا جائے اور پھر قوم پرست تحریک کو بے رحمی سے کچل سے دیا جائے۔ (3) اسلامی اتحاد کے نام پر سوویت یونین کے خلاف ترکی، مصر، اردن، عراق، لبنان، ایران، سعودی عرب اور افغانستان پر مشتمل ایک متحدہ محاذ بنایا جائے اور اس سارے علاقے میں کسی حریت پسند تحریک کو جنم لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس منصوبہ کے پیش نظر بلوچستان میں جمہوری اصلاحات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ چونکہ خان قلات کو 1945ء میں ہی برطانیہ کے اس منصوبے کا علم ہو گیا تھا اس لئے اس نے اسی وقت سے پورے بلوچستان میں اپنی آزاد وخود مختار سلطنت کے قیام کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ اپنا یہ خواب پورا کرنے کے لئے بلوچستان میں برطانیہ کو ہر قسم کی مراعات دینے پر آمادہ تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ چونکہ اس نے ساری عمر سوویت یونین کے خلاف برطانیہ کی ہر قسم کی خدمات سرانجام دی ہیں اس لئے اب برطانیہ اس کا یہ خواب پورا کرنے

میں مدد ومعاون ہوگا اور وہ جواباً برطانیہ کو اپنی سلطنت میں فوجی اڈے قائم کرنے اور معدنی ذرائع کا استحصال کرنے کی کھلی چھٹی دے دے گا۔

لیکن جب اگست 1947ء میں برطانیہ برصغیر سے دستبردار ہوا تو خان قلات کا یہ شہنشاہی خواب پریشان ہو گیا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اگر برطانیہ خان قلات کے زیر اقتدار بلوچستان کی آزاد وخودمختار مملکت کی تجویز کو منظور کرتا تو پھر اسے حیدر آباد (دکن)، میسور، بھوپال، جموں وکشمیر، بیکانیر اور دوسری بہت سی ریاستوں کی آزادی وخودمختاری کو تسلیم کرنا پڑتا۔ اس طرح برصغیر لاتعداد آزاد ریاستوں میں منقسم ہو جاتا اور یہ بات برطانوی سامراج کے عالمی مفاد کے منافی تھی۔ اس کی ابتدائی خواہش یہ تھی کہ برصغیر کا سیاسی، معاشی اور فوجی اتحاد قائم رہے تاکہ جب کبھی اسے ضرورت محسوس ہو تو وہ مقامی اعتدال پسند لیڈروں کے تعاون سے یہاں کے وسائل سے حسب سابق فائدہ اٹھا سکے۔ برطانیہ کے حکمران طبقے کا ایک طاقتور گروہ (جن میں سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے عناصر شامل تھے) کو یقین تھا کہ پاکستان زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ دوسری وجہ تھی کہ برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون اور وزیر امور دولت مشترکہ نوئیل بیکر (Noel Baker) جیسے عناصر کو پاکستان کے مسلم لیگی ارباب اقتدار کی اعتدال پسندی اور فرمانبرداری پر اعتماد تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ جب کبھی ضرورت ہوئی برطانیہ نہ صرف پاکستان کی سرزمین اور اس کے وسائل کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کر سکے گا بلکہ پاکستان کے ارباب اقتدار مشرق وسطیٰ میں اسلام کے نام پر ایک سوویت دشمن فوجی گٹھ جوڑ قائم کرنے میں مؤثر طریقے سے امداد کریں گے۔ لہٰذا بلوچستان میں خان قلات کی آزاد وخودمختار بادشاہت کے قیام کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بابائے پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے 25رجون 1947ء اور 11راگست 1947ء کے بیانات سے صاف پتہ چل گیا تھا کہ حکومت پاکستان بلوچستان کے نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی اور وہ اس سرحدی علاقے میں اس فارورڈ پالیسی پر عمل کرتی رہے گی جو برطانیہ نے 1876ء میں وضع کی تھی۔ 46-1945ء میں ایران اور عراق کے واقعات نے اس پالیسی کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہوا تھا۔ قائداعظم کے ان بیانات کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں 1947ء میں یہ احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے 1929ء کے بعد سے بلوچستان کے بارے میں جو مؤقف اختیار کئے رکھا تھا وہ مقامی حقائق سے بہت دور تھا۔

بلوچستان سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی لحاظ سے برصغیر کا پسماندہ ترین علاقہ تھا اور یہاں کے مختلف نسلی، لسانی اور ثقافتی گروہوں کے باہمی تضادات بہت شدید تھے۔ ان ساری مشکلات پر قابو پا کر یہاں مکمل جمہوری اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک ایسی زبردست انقلابی پالیسی کی ضرورت تھی جس کی قائداعظم جیسی آئین پسند شخصیت سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

مزید براں جب 14 راگست 1947ء کو ضعیف العمر قائداعظم نے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کی عنان اقتدار سنبھالی تھی تو انہیں فوراً ہی مشرقی پنجاب سے لاکھوں مہاجرین کے سیلاب، ریاست جموں وکشمیر کے تنازعہ اور مرکزی حکومت کے انتظامی ڈھانچے کی تشکیل کے نہایت مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا جبکہ خان قلات اپنی آزاد بلوچ بادشاہت کے قیام کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ ایسے حالات کے تحت بلوچستان میں مکمل جمہوری اصلاحات کے فوری نفاذ کی توقع عبث تھی تاہم جمہوریت پسند حلقوں کو امید تھی کہ چند ماہ کے بعد جب ان قومی مشکلات کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا تو بلوچستان کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لئے مؤثر کاروائی کی جائے گی۔ مگر جب فروری 1948ء میں قائداعظم نے سبی دربار میں اس صوبہ کے لئے محض ایک مشاورتی کونسل کی تشکیل کے فیصلے کا اعلان کیا تو ان حلقوں کو خاصی مایوسی ہوئی اور پھر جب اس فیصلے پر عمل درآمد میں بھی تاخیر ہوتی چلی گئی تو یہ احساس بڑھتا چلا گیا کہ بلوچستانی عوام کے لئے ترقی کی راہیں آسانی سے نہیں کھلیں گی۔ جب ستمبر 1948ء میں قائداعظم کا انتقال ہوا تو اس وقت تک قلات کا ''خان اعظم'' بہ امر مجبوری پاکستان کے ساتھ الحاق نامے پر دستخط کر چکا تھا لیکن مرکزی حکومت کے زیر اہتمام بلوچستان میں مجوزہ مشاورتی کونسل کی کوئی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔

اکتوبر 1948ء میں قاضی عیسیٰ نویں مرتبہ بلوچستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہوا۔ اس کے بعد بلوچستان میں اصلاحات کی تحریک نے پھر زور پکڑ لیا اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ صوبہ میں سرداری نظام اور جرگہ سسٹم منسوخ کر کے وہاں کے عوام کو جدید تہذیب وتمدن سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ دسمبر میں بلوچستان مسلم لیگ کے ایک وفد نے اس سلسلے میں وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے صوبہ کے انگریز ایجنٹ گورنر جنرل کی مطلق العنانیت کے خلاف احتجاج کیا اور اس دیرینہ مطالبے کا اعادہ کیا کہ بلوچستانی عوام کو اپنے علاقے کی انتظامیہ کے کام میں شریک کیا جائے۔ لیکن اس وفد کو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ بلوچستان میں مکمل جمہوری اصلاحات

پاکستان کے نئے آئین کی ترتیب کے بعد ہی نافذ ہوسکیں گی ۔ یہ انکار اس بین الاقوامی حقیقت کے باوجود کیا گیا تھا کہ اس وقت تک ایران اور عراق میں اینگلو ۔ امریکی بلاک کی بالادستی پوری طرح قائم ہوچکی تھی اور حکومت پاکستان اس سامراجی بلاک کی زیر سرپرستی مشرق وسطیٰ میں فوجی گٹھ جوڑ کے قیام کی کوششوں میں شریک ہوچکی تھی ۔ سر ظفر اللہ خان اور چودھری خلیق الزماں اس مقصد کے لئے خاص طور پر بہت سرگرم عمل تھے ۔ تاہم صوبائی اصلاحات کے لئے قاضی عیسیٰ وغیرہ کی تگ ودو کا اتنا نتیجہ تو نکلا کہ فروری 1949ء میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے سبی دربار میں یہ وعدہ کیا کہ بلوچستان میں 15 رکنی مشاورتی کونسل کی جلد تشکیل ہوگی اور صوبہ کے شہروں میں بلدیاتی انتخابات کرائے جائیں گے ۔ مگر اس اعلان سے شہروں کے مسلم لیگی عناصر اور قبائلی سرداروں کے درمیان اختلافات میں شدت پیدا ہوگئی اور نتیجتاً قبائل فیڈریشن کے نام سے ایک نئی صوبائی جماعت وجود میں آگئی ۔ تاہم جب اپریل میں صوبہ کی پہلی مشاورتی کونسل کے ناموں کا اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کونسل میں صوبائی لیگ کی بالادستی ہوگی ۔ جون میں اس کونسل کی تشکیل ہوگئی ۔ حالانکہ نواب محمد خان جوگیزئی کی قبائل فیڈریشن نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا ۔ لیکن جولائی میں ایک پنجابی فرعون کا بطور ایجنٹ گورنر جنرل تقرر ہوا تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد قاضی عیسیٰ اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو پتہ چل گیا کہ اس مشاورتی کونسل کی حیثیت محض ایک ڈھونگ کی سی ہے اور صوبہ میں سامراج نواز بیوروکریسی کی مطلق العنانیت کے خاتمہ کا کوئی امکان نہیں ۔

پھر تقریباً ایک سال تک مشاورتی کونسل کے ارکان اور پنجابی ایجنٹ گورنر جنرل کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی جاری رہی جبکہ بلدیاتی انتخابات کا وعدہ طاق نسیاں میں پڑا رہا اور خان قلات حکومت پاکستان کے خرچ پر امریکہ ، یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیر کرتا رہا ۔ حسب روایت قبائلی سردار اس رسہ کشی میں بیوروکریسی کے ساتھ تھے ۔ چنانچہ قدرتی طور پر قاضی عیسیٰ وغیرہ کو ہزیمت اٹھانا پڑی ۔ جولائی 1950ء میں وزیر اعظم لیاقت علی امریکہ اور کینیڈا کے دورے سے واپس آیا تو اس کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد جو دوسری مشاورتی کونسل نامزد ہوئی ، اس میں قبائلی سرداروں کی بالادستی قائم کی گئی اور قاضی عیسیٰ کو بطور سیاسی رشوت پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بھیج دیا گیا ۔ مگر یہ تجربہ بھی کامیاب نہ رہا ۔ بلکہ اس سے پاکستان کی سیاسی یکجہتی کو نقصان پہنچا کیونکہ صوبہ کے شہروں کے مقامی لوگوں کے

اس احساس میں شدت پیدا ہوگئی کہ بلوچستان کو تلیئر۔ پنجابی سامراجیوں کی ایک نوآبادی بنایا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر بلوچستان کے لئے ریفارمز انکوائری کمیٹی کا ڈھونگ رچایا گیا۔ یہ ڈھونگ ابھی جاری ہی تھا کہ 31 راگست 1951ء کو یہ اعلان کیا گیا کہ دوسری مشاورتی کونسل کی میعاد ختم ہوگئی ہے اوراب اس کی جگہ تیسری کونسل کی نامزدگی ہوگی۔ 1952ء کے اوائل میں ریفارمز کمیٹی اپنی سفارشات پیش کرے گی اور ان سفارشات کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی قانون سازی کرے گی تو اس کے بعد صوبہ میں مناسب اصلاحات کا نفاذ ہوگا۔ لیکن یہ جھوٹا پالیسی وعدہ بھی 16 راکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں لیاقت علی خان کے خون میں غرق ہوگیا۔

بلوچستانی عوام کی اس بدنصیبی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا سرحدی صوبہ سامراجی نقطہ نگاہ سے بڑی جنگی اہمیت کا حامل تھا اور سامراجی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں کے عوام سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہونے پائیں۔ 1866ء کے بعد ایران، افغانستان اور ہندوستان کے بادشاہوں کی زیر سرپرستی بروہی قبیلہ کے احمد زئی خاندان کے حکمرانوں کی استبدادیت اور طوائف الملوکی اس راہ میں حائل رہی۔ 1939ء کے بعد روس کے خلاف برطانوی سامراج کی فارورڈ پالیسی نے یہ راہ کھلنے نہ دی اور پھر 1947ء کے بعد برطانوی ارباب اقتدار کے پاکستانی جانشینوں نے اس راہ میں حائل شدہ رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کوئی مؤثر کاروائی نہ کی کیونکہ انہیں سوویت یونین کا خطرہ برطانوی سامراجیوں سے ورثہ میں ملا ہوا تھا۔ ان پاکستانی ارباب اقتدار کو یہ احساس وشعور نہیں تھا کہ ان کی کوتاہ اندیشانہ پالیسی آگے چل کر پاکستان کے لئے کس قدر نقصان دہ ثابت ہوگی۔

حوالہ جات

باب:1 بلوچستان کا تاریخی پس منظر......بیسویں صدی کے اوائل تک

1- Baluch, Mir Ahmed Yar Khan, Inside Baluchistan, Royal Book Company, Karachi, 1975, pp 219-21.

2۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ ایوان قلات۔ کوئٹہ 1972، ص56

3- Mir Ahmed Yar Khan, Inside Baluchistan op. cit.pp 221-23

4- Ibid., PP. 224-26

5- Ibid., PP. 230-34

6- Edward Wakefield, Sir, Past Imperative: My Life in India 1927-1947, London, 1966, pp.109-10.

7۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ ص ص63 تا64

8۔ ایضاً۔ ص61

9۔ ایضاً۔ ض75-77

10۔ نوائے وقت۔ 12 راکتوبر 1947ء

باب:2 بلوچستان کی سیاسی صورت حال اور برصغیر کی سیاست

1۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ ص67

2- Edward Wakefield.op.cit., pp.110-11

3۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ ص ص72 تا73

4۔ ایضاً۔ ص74

5۔ ایضاً۔ ص71

6۔ ایضاً۔ ص87

7۔ ایضاً۔ ص89

8- The Civil and Military Gazette, March 1, 1941

9- Ibid., March 4, 1941

10- Ibid., March 7,8, 1941

11- Ibid., April 26, 1941

12- Ibid., May 9, 1941

13- Ibid., May13, 1941

14- Ibid., June18, 1941

15- Ibid., June 4, 1941

16- Ibid., October 2, 1942

17- The Eastern Times, July 6, 1943

18- Ibid., July 7, 1943

19- Ibid., July 21, 1943

20- Ibid., November 9, 1944

باب3: دوسری عالمی جنگ کے بعد بلوچستان کی نمائندگی اور سیاسی مستقبل کا سوال

1۔ میر عبدالخالق بلوچ کا مضمون شائع کردہ روزنامہ نوائے وقت۔ 23/اکتوبر 1978ء

2- The Eastern Times, March 2, 1945

3- Ibid., May 17,1945

4- Ibid., May 31,1945

5۔ احمد یار بلوچ۔مختصر تاریخ۔ص86

6۔ ایضاً۔ص159

7- The Eastern Times September 26, 1945

8- Ibid., October 18,1945

9- Ibid., November 13, 1945

10- Ibid., November 25, 1945

11- Ibid., December 2, 1945

12- Ibid., January 8, 1946

13- Ibid., January 11, 1946

14۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ ص90

15- The Eastern Times, March 2, 1946

16- Ibid, March 22, 1946

17- Ibid, March 29, 1946

18- Ibid, April 25, 1946

19۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ ص ص90 تا 91

20- The Eastern Times, June 27, 1946

21۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر۔ ص91

22۔ سید محمد فاروق احمد (مرتب) تحریک پاکستان اور بلوچستان۔ ناشر مہران پبلی کیشنز کراچی۔ 1977ء ص19

23- The Eastern Times, December 15, 1946

24- Ibid, November 10, 1946

25۔ روز نامہ منشور دہلی۔ 28/جنوری 1947ء (میر عبدالباقی بلوچ نے 29/نومبر 1948ء کے نوائے وقت میں اپنے ایک مضمون میں نقل کیا)

26- The Civil and Military Gazette, January 22, 1947

باب 4: پاکستان میں برطانوی بلوچستان کی شمولیت اور قلات کی علیحدگی

1- The EasternTimes, April 4, 1947

2- Ibid., May 4,1947

3۔ سید محمد فاروق احمد۔ محولہ بالا ص 12

4۔ ایضاً۔ ص 48

5۔ ایضاً۔ ص 50

6- The Eastern Times, July 10, 1947

7- Ibid., July 6, 1947

8- Baluch, Mir Ahmed Yar Khan, op.cit

9- The Eastern Times, July 25, 1947

10- Ibid., July 24, 1947

11- Ibid., July 27, 1947

12- Mir Ahmad Yar Khan, op.cit pp 148-149

13- The Eastern Times, August 14, 1947

باب 5: نو آزاد پاکستان کے لئے بلوچستان کے مسائل اور خلیجی علاقے میں بڑی طاقتوں کی رسہ کشی

1- Baluch, Mir Ahmad Yar Khan, op cit., pp. 142-143

2- Ali, Chaudhri Muhammad, The Emergence of Pakistan, Originally published by Columbia University Press, New York and London, 1967. Reprinted by the Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Lahore, 1973, p.228

3- Ibid., p.230

4- Baluch Mir Ahmed Yar Khan op.cit., pp 148-149

5- Wilcox, Wayne Ayeres Pakistan, The Consolidation of a Nation, Columbia University Press, New York and London 1963, p.76

6۔ احمد یار بلوچ۔مختصر تاریخ۔ص10

7۔ ایضاً۔ص93

8۔ نوائے وقت۔23/اگست 1947ء

9- The Pakistan Times, September 2, 1947

10- Dawn, September 11, 1947

11۔ نوائے وقت۔19/ستمبر 1947ء

12- Dawn, September 19, 1947

13- The Pakistan Times, August 13, 1947

14- Baluch, Mir Ahmad Yar Khan, op.cit,. p.153

15- Ibid.

16- Dawn, July 18, 1946

باب6: قبائلی سرداران، خان قلات اور حکومت پاکستان......تینوں کے الگ راستے

1- The Pakistan Times, November 27, 1947

2- Dawn, November 27, 1947

3- Ibid., December 5, 1947

4- Ibid., December 9, 1947

5- Ibid., December 10, 1947

6- Ibid., December 12, 1947

7- The Civil and Military Gazette, December 13, 1947

8- Dawn, December 13, 1947

9- The Pakistan Times, December 16, 1947

10- Dawn, December 21, 1947

11- The Pakistan Times, December 30, 1947

12- The Civil and Military Gazette, December 20, 1947

13۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ ص ص112 تا114

14۔ ایضاً۔ ص ص114 تا118

15۔ ایضاً۔ ص ص119 تا125

16۔ ایضاً۔ ص96

17۔ ایضاً۔ ص159

18- Baluch Mir Ahmed Yar Khan, op.cit., p.323

19- Dawn, January 10, 1948

20- Ibid., January 19, 1948

21- Ibid., January 22, 1948

22- Ibid., January 21, 1948

23- Ibid., January 28, 1948

24- Ibid., January 30, 1948

25- Ibid., February 10, 1948

26- Ibid., February 14, 1948

27- The Pakistan Times, February 14, 1948

28۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ ص ص96 تا97

29- The Civil and Military Gazette, February 15, 1948

30- The Pakistan Times, February 15, 1948

31- Ibid., February 17, 1948

32- Baluch, Mir Ahmed Yar Khan, op,cit., p.157

باب7: ریاست قلات کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا ڈرامہ

1- Dawn, February 28, 1948

2- The Civil And Military Gazette, December 13, 1947

3- Economist, London, February 21, 1948

4- Dawn, February 24, 1948

5- Ibid., February 27, 1948

6۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ ص ص67 تا68

7- The Pakistan Times, March 4, 1948

8- Dawn, March 7, 1948

9- The Pakistan Times, March 9, 1948

10۔ نوائے وقت۔12 رمارچ1948ء

11- The Pakistan Times, March 13, 1948

12- Bluch, Mir Ahmed Yar Khan, op.cit p.158

13- The Pakistan Times, March 14, 1948

14- Ali, Chaudhri Mohammad op.cit., p.236

15۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ص101

16- Dawn, March 21, 1948

17- The Pakistan Times, March 26, 1948

18- Dawn, March 27, 1948

19- The Pakistan Times, March 28, 1948

20۔ انقلاب۔یکم اپریل1948ء

21۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ۔ص ص103 تا104

22- Edward Wakefield, Sir, op.cit., o.110

23- Ibid., pp 135-136

24- The Pakistan Times, April 1948

25- Dawn, April 8, 1948

26- Ibid., April 13, 1948

27- The Pakistan Times, April 14, 1948

28۔احمد یار بلوچ۔مختصر تاریخ۔ص86

29- Dawn, April 19, 1948

30۔ احمد یار بلوچ۔مختصر تاریخ۔ص ص104 تا105

31- Economist, London, April 17, 1948

32- The Pakistan Times, April 24, 1948

33- Ibid., April 29, 1948

باب8: بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت، سیاسی اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ بن گئی

1- Dawn, May 24, 1948

2- Ibid., June 9, 1948

3- Ibid., June 15, 1948

4- Ibid., June 19, 1948

5- Ibid., June 15, 1948

6- Ibid., August 14, 1948

7- Ibid., August 11, 1948

8- Ibid., August 21, 1948

9- Ibid., October 5, 1948

10- Ibid., October 19, 1948

11- Ibib., January 11, 1949

12- Ibid., January 27, 1949

13- Ibid., February 3, 1949

14 Ibid., February 7, 1949

15- Ibid., February 27, 1949

16- The Pakistan Times, December 7, 1948

17- Dawn, March 6, 1949

18۔ نوائے وقت۔23/مارچ1949ء

19- Dawn, March 25, 1949

باب9: بلوچستان میں لیاقت علی خان کی غیر جمہوری پالیسی......1

1۔ نوائے وقت۔6/مئی1949ء

2- The Pakistan Times July 14, 1949

3- Wilcox, Wayne Ayeres op cit., P.106

4۔ احمد یار بلوچ۔مختصر تاریخ۔ص ص105 تا107

5- Dawn, April 4, 1949

6۔ نوائے وقت۔7/اگست1949ء

7- Dawn, May 28, 1950

8- Ibid., January 10, 1950

9- Ibid., June 9, 1950

10- Ibid., July 12, 1950

11- The Pakistan Times August 2, 1950

12- Ibid., August 9, 1950

13- Dawn, September 5, 1950

14- Ibid., September 10, 1950

15۔ نوائے وقت۔7/ستمبر1950ء

16۔ ایضاً۔16/جون1950ء

باب10: بلوچستان میں لیاقت علی خان کی غیر جمہوری پالیسی......2

1- Dawn, November 6, 1950

2- Ibid., November 8, 1950

3- Ibid., December 8, 1950

4- Ibid., December 21, 1950

5- Ibid., October 2, 1950

6- Ibid., January 19, 1951

7- Ibid., January 30, 1951

8- Ibid., February 9, 1951

9- Ibid., February 16, 1951

10- Ibid., April 19, 1951

11- Ibid., April 20, 1951

12- Ibid., April 25, 1951

13- Ali, Chaudhri Mohammad Op.cit., p.387

کتابیات

کتب (انگریزی)

Ali, Chaudhri Mohammad, The Emergence of Pakistan,
Originally published by Columbia University Press New York and London, 1967. Reprinted by The Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Lahore, 1973

Baluch, Mir Ahmed Yar Khan, Inside Baluchistan, Royal Book Company, Karachi 1975

Wakefield Edward, Sir, Past Imperative: My life in India 1927-1947 Chatoo & Widus, London,1966

Wilcox, Wayne Ayeres, Pakistan, The Consolidation of a Nation, Columbia University Press, New York and London,1963

کتب (اردو)

احمد،سید محمد فاروق)مرتب) تحریک پاکستان اور بلوچستان۔مہران پبلی کیشنز۔کراچی۔1977ء

بلوچ،احمد یار۔مختصر تاریخ قومِ بلوچ و خوانینِ بلوچ۔ایوان قلات،کوئٹہ۔1972ء

اخبارات و جرائد

Dawn, Karachi files of 1946, 1947, 1948, 1949, 1950 and 1951.

Economist, Weekly, London file of 1948.

The Civil and Military Gazette, Lahore, files of 1941, 1942, 1943, 1944, 1947 and 1948.

The Eastern Times, Lahore, files of 1945, 1946 and 1947.

The Pakistan Times, Lahore, files of 1947, 1948, 1949, 1950 and 1951.

انقلاب،لاہور۔فائل 1948ء

نوائے وقت،لاہور، فائلیں 1947ء،1948ء، 1949ء، 1950ء اور اکتوبر 1958ء


اشاریہ

آ

ا

ب

ت

چ

د

ڈ

ر

ش

ص

ف

ق

ک

ے